D 1/11/2025 2:58 PM PAGE 1 (1,1)

میرا جی

غلیظ پیکر، لطیف روح

محمد اکرم سعید

D 1/11/2025 2:58 PM PAGE 2 (1,1)

جملہ حقوق محفوظ ہیں

Book Name: Meera Ji - Ghaleez Paikar , Latief Rooh
Compiled by: Muhammad Akram Saeed
Phone # 0335-4921473
Co-ordination : Rifat Saeed, Sadia Zafar
Arranged by: Waleed Ahmad. Waqar Ahasan, Abdullah
Composed by: Ashraf Naqvi, Phone # 0345-6352439
Publishing year: 2025
Price: Rs. 2000/-

نام کتاب: میراجی ۔۔۔۔۔ غلیظ پیکر،لطیف روح
مرتّب: محمد اکرم سعید
فون نمبر: 0335-4921473
معاونت: رفعت سعید،سعدیہ ظفر
اہتمام: ولید احمد،وقار احسن،عبداللہ
اشاعتِ اوّل: 2025ء
کمپوزنگ وسرورق:اشرف نقوی، فون نمبر: 0345-6352439
تعداد: 500
قیمت: -/2000روپے

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 3 (1,1)

پروفیسر ڈاکٹر خرم عباس وِرک

کی محبتوں کے نام

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 4 (1,1)

نگری نگری پھرا مسافر ، گھر کا رستہ بھول گیا
کیا ہے تیرا کیا ہے میرا ، اپنا پرایا بھول گیا
کیا بھولا ، کیسے بھولا ، کیا پوچھتے ہو بس یوں سمجھو
کارن دوش نہیں ہے کوئی ، بھولا بھالا بھول گیا

میراجی

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 5 (1,1)

میراجی

(خاکہ نگاروں کی نظر میں)

تحقیق، تجزیہ، متن

محمد اکرم سعید

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 6 (1,1)

فہرست

نمبر شمار	مصنف	عنوان	صفحہ نمبر
1	محمد اکرم سعید	پیش لفظ	8
2	محمد اکرم سعید	''میراجی'' غلیظ پیکر، لطیف روح	9
		خاکے، متن	
3	میراجی	کچھ اپنے بارے میں (خودنوشت	43
4	کامی	میرا بھائی	50
5	احمد بشیر	اکیلا	58
6	اخلاق احمد دہلوی	میراجی کا اخلاق	82
7	اخلاق احمد دہلوی	میراجی کی ایک اور تصویر	98
8	اخلاق احمد دہلوی	ردّی کے بھاؤ	102
9	انتظار حسین	شخص اور شاعر	109
10	تابش دہلوی	میراجی میرا دوست	119
11	سحاب قزلباش	میراجی (جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے	124
12	سعادت حسن منٹو	تین گولے	135
13	شاد امرتسری	میراجی	149
14	شاہد احمد دہلوی	میراجی	156
15	شاہد احمد دہلوی	میراجی	169

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 7 (1,1)

16	شوکت تھانوی	مَیں میراجی کو نہیں جانتا	181
17	عبادت بریلوی	مِیراجی	186
18	عصمت چغتائی	سوکھے پتے	206
19	محمد حسن عسکری	میراجی	216
20	محمود نظامی	میراجی	225
21	مختار صدیقی	اکیلا	238
22	مظہر ممتاز	یہ میراجی ہیں	246
23	ممتاز مفتی	میراجی	266

ضمیمہ جات

نمبر شمار	مصنف	عنوان	صفحہ نمبر
1	صلاح الدین احمد	اداریہ ادبی دُنیا (بزمِ ادب)	272
2	قدرت اللہ شہاب	صدارتی خطبہ (میراجی	274
3	اختر الایمان	میراجی کے آخری لمحے (ایک خط)	279

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 8 (1,1)

پیشِ لفظ

میراجی ایک پُراسرار شخصیت تھے۔ اِس پُراسرار شخصیت کو اس کے خاکہ نگاروں نے اپنے اپنے انداز سے دیکھا اور اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے بیان کیا ہے۔ اِن خاکوں میں میراجی کی شخصیت اور کردار و عمل کے کیا خدوخال بنتے ہیں، زیرِ نظر کتاب میں یہی بیان اور نمایاں کیا گیا ہے۔

یہ کتاب تین حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصّے میں راقم نے ان خاکوں کی مدد سے میرا جی کو سمجھنے، سمجھانے اور اُن کی شخصیت کو ہر پہلو سے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ مضمون میں خاکوں سے اِقتباس زیادہ دیے گئے ہی مگر کہیں کہیں کچھ اور کتابوں اور مضامین سے بھی مدد لی گئی ہے۔ مقصد یہ تھا کہ میراجی کی شخصیت کا ہر پہلو مکمل طور پر سامنے آسکے۔ دوسرے حصّے میں میراجی پر لکھے گئے تمام دستیاب خاکوں کا مکمل متن دیا گیا ہے تاکہ قارئین خود میراجی کو جان سکیں اور اپنی رائے قائم کرسکیں۔

تیسرے حصّے میں کچھ ایسی تحریریں اور مضامین دیے گئے ہیں جو خاکوں کی ذیل میں تو نہیں آتے مگر ان میں میراجی کی شخصیت بارے کچھ بنیادی معلومات ضرور ملتی ہیں۔

اِس کتاب میں صرف میراجی کی شخصیت ہی کو فوکس کیا گیا ہے، اُن کے فن کے بارے مضامین شامل نہیں کیے گئے۔ راقم کا خیال ہے کہ اُن کی شخصیت کو سمجھنے سے اُن کی شاعری کے علامتی نظام کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اِس کتاب کی تیاری میں راقم اپنے تمام احباب اور کرم فرماؤں کا شکرگزار ہے جنھوں نے تعاون کیا اور رہنمائی فرمائی۔

دُعاگو

محمد اکرم سعید
چک نمبر 173، رسول پور جٹاں، ضلع شیخوپورہ
0335-4921473

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 9 (1,1)

محمد اکرم سعید

''میراجی'' غلیظ پیکر، لطیف روح

(1912ء ۔ 1949ء)

پیدائش: لاہور (25 مئی، 1912 وفات: بمبئی، 3 نومبر 1949ء)

میراجی کی شخصیت کے کئی رنگ اور رُوپ ہیں اور جس دانش ور نے بھی اُس کی شخصیت پر قلم اُٹھایا ہے، اُس نے اُس عکس کو بیان کیا ہے جو اُس کے مشاہدے میں آیا ہے۔ الطاف گوہر اُسے ایک ''درویش'' قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں: وہ

> ''کوئی درویش تھا جو بال بڑھائے، ہاتھوں میں گولے اور گلے میں مالا سجائے، سچ کی تلاش میں اس نگری میں آنکلا اور جب اُس نے دیکھا کہ یہاں تو جھوٹ ہر لمحہ جوان رہتا ہے تو وہ جہاں سے آیا تھا، وہیں پلٹ گیا لیکن اِس مختصر سے عرصے میں اُس کی ذات ہر ملنے والے کی زندگی پر اپنا عکس چھوڑ گئی۔''(1)

الطاف گوہر کو میراجی جھوٹ نگری میں سچ کے متلاشی نظر آتے ہیں تو قدرت اللہ شہاب اُن کے فلسفۂ حیات کو ایک ''اُلجھن'' قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''میراجی کا نام لیتے ہی بے اختیار جی چاہتا ہے کہ ان پُر اسرار گوں کا ذکر کیا جائے جو وہ اپنے ہاتھوں میں رکھنے کا عادی تھا، یا اُس کے لباس، اُس کے بالوں، اُس کی آنکھوں، اُس کے معاشقوں اور اُس کی دیگر اضطراری حرکات کا ذکر کیا جائے جن کی وجہ سے وہ زندگی کے ساتھ ایک ترچھے زاویے پر وابستہ تھا۔''(2)

اُن گولوں، لباس، اضطراری حرکات، معاشقے اور زندگی کے ساتھ ترچھے رویّے کا ذکر تقریباً ہر خاکہ نگار نے کیا ہے مگر ہر ایک کی سوچ اور اُس کے اِظہار کا انداز اور زاویہ اپنا ہے۔ سب

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 10 (1,1)

سے پہلے تو میرا جی کا بعنوان ''کچھ اپنے بارے میں'' خود نوشت خاکہ ہے۔ اِس خود نوشت خاکے (تحریر) میں میرا جی نے نہ صرف اپنے بچپن کی یادوں کو تازہ کیا ہے بلکہ بچپن کے حالات نے اُن کی زندگی پر جو اثرات مرتب کیے اُن کا ذکر بھی کیا ہے اور شاعری پر مرتب ہونے والے اثرات کو بھی بیان کیا ہے۔ اُنھوں نے شروع ہی میں وضاحت کر دی ہے کہ میری نظموں کا نمایاں پہلو ''جنسی حیثیت'' ہے۔ اُن کی شاعری میں جنسی پہلو دبی ہوئی خواہشات کا اظہار ہے۔ اسی نُقطۂ نظر سے اُنھوں نے گزرے ہوئے واقعات کو دیکھا ہے۔ زمانۂ طفلی میں اُنھیں والد کی ملازمت کے سلسلے میں گجرات کاٹھیا واڑ، بلوچستان، سندھ میں سکھر، جیکب آباد اور ڈابھے جی میں رہنے کا اتفاق ہوا اور آخر میں لاہور۔ ان علاقوں کے ماحول نے اُن کی شخصیت کی تعمیر اور تخریب میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

پربت کے دھندلکے، بہتے ہوئے دھارے اور رینگتے ہوئے سانپ بچپن ہی سے میرا جی کے ذہن میں نقش ہیں۔ دُور پربت سے لٹکا ہوا کُہر ا، اُنھیں نسائی پیکر سے لپٹا ہوا دامن دکھائی دیتا ہے۔ بچپن ہی سے میرا جی کو عورت تو عورت، عورت کے لباس سے بھی دلچسپی رہی ہے۔ گجرات کاٹھیا واڑ کے لہنگے، اُس کی سیدھی ساخت، کمر سے ٹخنوں تک ایک جھول سا، میرا جی کو ہلکی ہلکی لہروں کا ایک نازک جھرمٹ محسوس ہوتا ہے اور اُن کی نگاہوں میں پہننے والی ایک لچکتی ہوئی ٹہنی بن جاتی ہے۔ لہنگوں کے بعد اُن کا دوسرا پسندیدہ لباس ساڑھی ہے لیکن اس میں اُنھیں حرکت نظر نہیں آتی، بلکہ ایک ٹھہراؤ ہی ٹھہراؤ ہے۔ ایک ایسا ٹھہراؤ جو کسی بگولے کی ہیئت میں محسوس ہو سکتا ہے اور:

> ''ساڑھی پہنے ہوئے کوئی نسائی پیکر میرے ذہن میں لٹکے ہوئے پردے یا چھائے ہوئے دھندلکے کا تصوّر لاتا ہے۔۔۔۔ نسائی لباس کا یہ بیان زندگی کے ایک اور پہلو پر بھی روشنی ڈالتا ہے یعنی عورت سے دُوری کا۔''(3)

اور یہ دُوری ہی اُن کی زندگی کا سب سے بڑا روگ اور المیہ بن جاتی ہے۔

میرا جی نے اپنے اِس خود نوشت خاکے میں، قبل از وقت اپنے جنسی احساس کی بیداری کا بھی ذکر کیا ہے۔ ایک تو اپنے ساتھ کھیلنے والی بچی ''جمنا'' کے رفع حاجت کا واقعہ ہے، اِس

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 11 (1,1)

بارے میراجی کی سوچ یہ ہے:

''اِس واقعے کی جنسی نوعیت کا ایک نقش زمانۂ طفلی ہی میں ذہن پر قائم ہوگیا۔''(4)

دوسرا واقعہ ذرا زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں:

''ساتھ کے مکان سے اسٹیشن ماسٹر کی بیٹی کوئی سوغات کی چیز ہمارے ہاں لائی۔۔۔۔اُس نے دہلیز سے داخل ہو کر دیکھا۔ کمرے میں کوئی نہیں، صرف میں ہوں۔ مجھ سے پوچھا، میں نے اندر کی طرف اشارہ کیا کہ گھر کے لوگ اُدھر ہیں۔ وہ چلی گئی لیکن ایک لمحہ ٹھٹھک کر کھڑے رہنے کے دوران میری نظر نیم جنسی احساسات کے ساتھ اُس پر جمی رہی۔ اُس نے ایک سفید دھوتی پہن رکھی تھی اور دس گیارہ کی عمر۔ شاید گھر کی بات ہونے کے خیال سے کوئی زیر جامہ نہ تھا۔ چنانچہ سورج کی کرنیں لباس کے پردے میں چھنتے ہوئے زیریں جسم کے خطوط کا اظہار کر رہی تھیں۔''(5)

سکول کا زمانہ ہے۔ ابھی جوانی نہیں آئی، مگر ان کا جنسی احساس جاگ گیا ہے اور دھوتی کے ہوتے ہوئے نظریں کم سن بچی کے زیریں جسم کے خطوط پر جمی ہیں۔ میراجی تمام عمر اِسی قسم کے جنسی احساس کا شکار اور اسیر رہے۔ میراجی اور عورت کے درمیان یہ ساڑھی اور دھوتی کا پردہ عمر بھر لٹکتا رہا اور وہ اس پردے کی اوٹ ہی سے عورت کے جسم کو دیکھتے اور ترستے رہے۔ یہ جنسی اور ذہنی بھوک عمر بھر نہ مٹ سکی۔

سحاب قزلباش نے لکھا ہے:

''تم زندگی بھر عورت کے قرب کے لیے ترستے رہے۔۔۔۔اوٹ پٹانگ نظمیں کہہ ڈالیں اُس کے جسم پر''ذہنی بھوکے!''(6)

اور یہ بھوک میراجی کے چہرے کو اپنی گندگی میں لتھیڑتی رہی۔ سندھ کے میدانوں سے میراجی کے ذہن پر اُداسی، بے زاری اور ویرانی کے نقش ثبت ہوئے تو لاہور میں قیام کے دوران، مطالعہ اور مشاہدہ کے ساتھ جنس مخالف سے تعلق کے تجربے سے بھی گزرے اور اِس نتیجے پر پہنچے:

''عورت تیرا نام صدمہ ہے۔''(7)

اور یہ صدمہ عمر بھر اُن کے ساتھ رہا۔

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 12 (1,1)

محمد اکرام اللہ کامی نے ''میرا بھائی'' کے عنوان سے میراجی کا خاکہ لکھا ہے۔ اِس خاکے میں زیادہ تر بچپن ہی کی باتوں کو دُہرایا ہے مگر اُن کی زندگی کے سب سے بڑے ''حادثے'' کا بھی بطورِ خاص ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ جب ابھی ثناء اللہ صاحب دسویں جماعت میں لاہور میں پڑھتے تھے تو اُن کی زندگی میں انقلابِ عظیم پیدا ہوا اور وہ ثناء اللہ سے میراجی ہو گئے۔ بقول کامی صاحب:

> ''یہ واقعہ یونیورسٹی گراؤنڈ کا ہے، یہاں پر ہر سال بنگالیوں کی سالانہ کھیلیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک سال اِسی موقع پر ثناء بھائی اور سلیم سوز گراؤنڈ میں بیٹھے تھے۔ ثناء اُن دِنوں دسویں میں ہوا کرتے تھے اور سلیم گورنمنٹ کالج میں۔ کھیلوں کے دن بھی یہ وہیں تھے کہ اچانک دو بنگالی لڑکیاں اُن کے قریب سے گزریں۔ دونوں نے اُنھیں دیکھا اور پھر ہونی ہوئی اور ثناء بھائی میراجی بن گئے اور سلیم، سوز۔ اُن بنگالی لڑکیوں کے نام میرا سین اور پروتما گپتا تھے۔ میرا سین ایف سی کالج میں پڑھتی تھی جو وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کے قریب ہوا کرتا تھا۔ میراجی گھر سے کالج اور کالج سے گھر، ان گنت بار میرا سے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر اُس کا پیچھا کیا کرتے اور یہ فاصلہ اُن کی زندگی میں صرف دو بار ٹوٹا۔ ایک اُس وقت جب کہ وہ راستے میں جا رہی تھی، میراجی جلدی سے بڑھے اور کہا ''مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے''۔ اُس نے دیکھا اور پھر تیزی سے چلی گئی۔ اور دوسری دفعہ اُس وقت جب اُنھوں نے اُسے ایک خط دیا۔ صاف کاغذ پر صرف میرا لکھا تھا۔ اُس نے لے کر پڑھا اور چل دی۔ اُنھی دِنوں میراجی نے دسویں کا امتحان دیا اور ہر پرچے پر صرف اپنا رول نمبر لکھ کر چلے آتے رہے۔۔۔۔۔ اس کے بعد سنبھالے نہ سنبھل سکے۔ اُن کی ہر بات بدل گئی۔ گویا اُنھوں نے نیا جنم لیا ہے۔''(8)

کامی صاحب کے بقول، میراجی کی زندگی کے اِس انقلابِ عظیم کی شروعات یونیورسٹی گراؤنڈ سے ہوئی، جب اچانک ایک دن میرا سین اپنی سہیلی کے ساتھ وہاں سے گزری۔ ثناء اللہ نے اُسے دیکھا اور ہونی ہو کر رہی اور ثناء اللہ، میراجی بن گئے۔ زندگی میں صرف دو دفعہ اُس سے نہ ہونے کے برابر بات ہوئی مگر زندگی اُس کے عشق میں گزار دی۔ یہ حادثہ اُس وقت ہوا جب میرا جی ابھی دسویں جماعت میں تھے۔

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 13 (1,1)

ڈاکٹر رشید امجد کے مطابق:

''میرا سین سے میراجی کی پہلی ملاقات 20 مارچ 1932ء کو ہوئی۔''(9)

میرا سین سے پہلی ملاقات کے وقت ثناء اللہ (میراجی) کی عمر تقریباً بیس برس ہے، مگر ابھی وہ دسویں جماعت ہی کے طالب علم ہیں۔ یہ بات کچھ کھٹکتی تو ہے مگر کامی صاحب نے جو جگہ اور جس طرح ملاقات ہوئی اور پھر گھر سے کالج اور کالج سے گھر تک میرا سین کے پیچھے چلنے اور دو ادھوری ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے، یہ روایت صحیح معلوم ہوتی ہے اور کئی خاکہ نگاروں نے ان واقعات کی تصدیق کی ہے۔ تقریباً تمام خاکہ نگاروں نے میراجی کے میرا سین سے عشق کی رُوداد بیان کی ہے مگر ہر ایک کا مشاہدہ اور کہانی مختلف ہے۔

محمد حسن عسکری صاحب نے ''میراجی'' کے عنوان سے اُن کا خاکہ لکھا ہے۔ عسکری صاحب کی میراجی سے پہلی ملاقات مئی 1942ء میں دہلی میں ترقی پسند ادیبوں کی ایک کانفرنس میں ہوئی۔ مگر اُنھوں نے میراجی کے میرا سین سے عشق کی رُوداد بھی بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''جب وہ آٹھویں یا نویں جماعت میں پڑھتے تھے تو اُن کے ہر دوست کی ایک نہ ایک محبوبہ تھی۔ کوئی فارغ البال تھا تو بس میراجی ۔۔۔۔۔ ایک دن کوئی بنگالی لڑکی ''میرا'' سامنے سے گزر رہی تھی۔ دوستوں نے یوں ہی مذاق میں کہہ دیا ''یہ ہے ان کی محبوبہ۔'' دو چار لڑکوں نے ''میرا'' کا نام لے کر اُنھیں چھیڑا اور وہ ایسے بنتے رہے جیسے واقعی چڑ رہے ہوں۔ پھر جب اُنھوں نے دیکھا کہ دوست اُنھیں ایک ''افسانہ'' بنا دینا چاہتے ہیں تو وہ بے تامل افسانہ ہی بن گئے۔ اُس کے بعد اُن کی ساری عمر اس ''افسانے'' کو نبھانے میں گزری۔''(10)

اِس اِقتباس سے تو یہ خبر ہوتی ہے کہ صرف دوستوں کے چڑانے، چھیڑنے اور اُنھیں ایک افسانہ بنا دینے کے سبب وہ بے تامل افسانہ بن گئے۔ یعنی میرا کو دیکھ کر اُن کے دل کی دھڑکنیں زیر زبر نہیں ہوئی تھیں بلکہ دوستوں کے تفنن طبع کی خاطر وہ افسانہ بنے اور ساری عمر اِس افسانے کو نبھانے میں گزار دی۔ محمد حسن عسکری صاحب نے چونکہ یہ باتیں کہیں سے سُن سُنا کر لکھی

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 14 (1,1)

ہیں، اِس لیے یہ کہانی درست نہیں۔

اخلاق احمد دہلوی صاحب نے لاہور میں میرا جی کے ہم جماعت اور دوست ڈاکٹر اے۔ڈی فرزدق صاحب کے حوالے سے، اُن کے میرا سین سے عشق کی کہانی لکھی ہے۔ اخلاق احمد دہلوی صاحب لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر اے ڈی فرزوق کے مطابق: ''ہم (ڈاکٹر موصوف اور میرا جی) مزنگ کے ایک سکول میں آٹھویں سے دسویں جماعت تک ساتھ پڑھتے تھے۔ ثناء (میرا جی) صاحب میٹرک میں فیل ہو گئے اور میں پاس ہو کر ایف سی کالج میں داخل ہو گیا۔ ثناء صاحب مجھ سے ملنے کالج آتے تھے۔۔۔۔۔ کالج میں میری ایک ہم جماعت تھی میرا سین۔ اتفاق سے میری اور میرا سین کی سیٹ برابر تھی۔۔۔۔۔ اُنھیں میری ہم نشین میرا سین سے کچھ موانست ہو گئی۔۔۔۔۔ دیکھتے دیکھتے ثناء صاحب نے میرا سین کا اِتنا اثر قبول کیا کہ خود اپنا نام اُس کے نام پر میرا جی رکھ لیا۔ ثناء صاحب روزانہ کوئی بیس پچیس قدم کے فاصلے سے میرا سین کے پیچھے پیچھے چلتے اور گھر سے کالج اور کالج سے گھر تک اُسے پہنچا کر دم لیتے جس کی خود میرا سین کو آخیر دم تک خبر نہ ہو سکی۔''(11)

ڈاکٹر اے۔ڈی فرزوق صاحب کو بھی غلط فہمی ہوئی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میرا جی اُن سے ملنے ایف سی کالج آتے تھے اور یہیں اُنھیں میرا سین سے کچھ موانست ہو گئی۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے ملنے کے بہانے، میرا سین ہی کے لیے کالج جاتے تھے۔ میرا سین سے موانست کالج میں نہیں ہوئی بلکہ یہ ہونی بہت پہلے یونیورسٹی گراؤنڈ میں ہو چکی تھی۔ جیسا کہ میرا جی خود بیان کرتے ہیں:

> ''وہ (میرا سین) ایف سی کالج میں پڑھتی تھی۔ ایک روز یونیورسٹی گراؤنڈ میں نظر آئی اور ایک پاکیزہ جذبہ اچانک میرے دل میں اُبھر آیا۔''(12)

> ''میرا سین سے میرا جی کی پہلی ملاقات 20 مارچ 1932ء کو ہوئی اور پھر جب وہ کالج جاتی تو اُس کے پیچھے پیچھے ذرا فاصلے پر اُس کے ساتھ چلتے اور کالج سے واپسی پر بھی یہی عمل ہوتا۔'' اور یہ واقعات 38-1937ء کے ہیں۔(13)

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 15 (1,1)

کیا میرا سین چھ برس اس کالج میں پڑھتی رہی اور میراجی کے بھی یہ معمولات چھ برس مسلسل جاری رہے؟ اور ان چھ برسوں میں صرف دو دفعہ بات کرنے کا یک طرفہ موقعہ اور دوسری جانب سے بے رُخی کا مظاہرہ۔ اِن دو واقعات کے باوجود کیا یہ بات بھی درست ہے کہ میرا سین کو آخیر وقت تک خبر نہ ہو سکی کہ کوئی مسلسل اُس کا پیچھا کر رہا ہے؟ کسی بھی خاکہ نگار نے اِس حوالے سے کچھ بھی نہیں لکھا البتہ اِس خاموش عشق، اندر کے الاؤ اور طبیعت کی بے چینی بارے میراجی نے خود مظہر ممتاز کو یہ بتایا تھا کہ:

> ''کچھ دن بعد مجھ پر جنون طاری ہو گیا، سوائے میرا سین کے خیال اور تصوّر کے میں کسی اور بات میں دل چسپی نہ کرنے لگا۔ میں نے اپنا نام ثناء اللہ ڈار کی بجائے میرا سین کے نام پر میراجی رکھ لیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ذہنی سکول ملا۔ اِس سکون کے لیے میں نے کتابیں پڑھنا شروع کر دیں۔''(14)

اِس حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے اور تجزیہ بڑا دل چسپ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''عام روایت یہ ہے کہ جوانی کے آغاز میں میراجی نے ایک بنگالی لڑکی میرا سین کو دیکھا اور اُس کے عشق میں اِس درجہ اسیر ہوا کہ اُس نے نہ صرف اپنی ہیئت تبدیل کر لی، نہ صرف ثناء اللہ سے میراجی بن گیا بلکہ محبوب کی ہر شے حتیٰ کہ اُس کی زبان، مذہب اور مذہبی روایات بھی اُسے عزیز ہو گئیں۔''(15)

یہ سوال اہم بھی ہے اور قابل غور بھی کہ میراجی نے عشق میں مبتلا ہو کر ایسے عجیب و غریب ردِّ عمل کا اظہار کیوں کیا کہ محبوبہ سے کہیں زیادہ اُس کے مذہبی اعتقادات، رسوم اور فضا کو اپنی ذات سے ہم آہنگ کر لیا؟

ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے میں:

> ''میرا سین زیادہ سے زیادہ ایک تحریک تھی جس نے میراجی کے ہاں اُس چنگاری کو ہوا دی تھی جو ایک مُدّت سے اُس کے دل، روح بلکہ خون میں سلگ رہی تھی۔۔۔۔ پرانے ہندوستان کی طرف میراجی کا رُجحان ایک بنیادی رُجحان تھا حتیٰ کہ میرا سین سے محبت بھی دراصل اُس رُجحان ہی کا ثمر تھی۔''(16)

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 16 (1,1)

اِس حوالے سے میراجی کا اپنا کہنا ہے کہ:

''ایک ہی بار مشرقی ہندوستان کی ایک عشرت انگیز عورت (یعنی میرا سین) کی طرف نظر کی اور ہزیمت کا مُنہ دیکھا۔۔۔۔۔اور ذہنی تلخی کو کم کرنے کے لیے اپنی شکست کے احساس سے رہائی حاصل کرنے کے لیے میرا ذہن ادبی تخلیقات میں مجھے بار بار پرانے ہندوستان کی طرف لے جاتا ہے۔''(17)

ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کی اِس وضاحت سے میراجی کے عشق، شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کے لیے مدد لی جاسکتی ہے۔ڈاکٹر رشید امجد صاحب نے میراجی کی اِس ہزیمت کو یوں سُلجھایا ہے کہ میراجی خود بیان کرتے ہیں:

''میرا میرے لیے ایک سمبل تھی۔ مجھے اُس کی محبت، اُس کی وفا کی ضرورت نہیں تھی۔''(18)

یہ وضاحتیں اور تاویلیں اپنی جگہ، مگر حقیقت یہ ہے کہ میراجی نے میرا سین سے عشق کیا اور خوب کیا۔ یہ الگ بات کہ اُن کے عشق کا انداز اپنا تھا۔اُن کی طبیعت میں ہر کام کرنے کا اپنا ڈھنگ اور طریقہ تھا۔اُن کا اپنا اصول تھا کہ ''میرا ذہن جو سوچتا ہے، میرا دل جو کہتا ہے، وہی کرتا ہوں۔''عشق میں بھی اُنھوں نے الگ راستہ تلاش کیا اور اظہار کا بھی الگ طریقہ اختیار کیا۔ممتاز مفتی، میراجی سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میراجی نے کہا: ''ہمیں میرا سے محبت ہے۔اب ہم میرا ہیں۔''

ممتاز مفتی کہتے ہیں: ''اُس کی بات سُن کر میں سکتے میں رہ گیا۔۔۔۔۔ عجیب آدمی ہے، میں نے سوچا، جو اپنی محبت کے راز کو یوں بیان کر رہا ہے جسے وہ ''دو دُونی چار اے'' کی طرح سنا رہا ہے۔اپنی محبت کو ''میراجی'' کے نام سے نشر کرنا، اپنے اصلی نام کو بھولنے کی شدید کوشش کرنا اور یوں جٹا دھاری بن کر التزاماً عاشق کا رُوپ دھارنا، کتنا نمائشی انداز ہے؟''

مگر پھر ڈی۔ایچ لارنس کا خیال آتے ہی ممتاز مفتی نے محسوس کیا جیسے ''میرے روبرو بیٹھا ہوا وہ شخص (میراجی) بذاتِ خود ''معصوم دوشیزگی کا مجسمہ ہو'' اور ممتاز مفتی نے سوچا

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 17 (1,1)

''کتنا بڑا ہے یہ شخص؟'' اور ممتاز مفتی کے کانوں میں میراجی کا قہقہہ گونجنے لگا ''ہمیں میرا سے محبت ہے، اِس لیے ہم میراجی ہیں۔''(19)

ممتاز مفتی صاحب نے تو اُسے ایک عجیب آدمی قرار دیا ہے جو اپنی محبت کو میراجی کے نام سے نشر کرتا اور اپنے اصلی نام کو بھولنے کی شدید کوشش کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کا ایک بہت سوچا سمجھا فیصلہ تھا اور ڈاکٹر رشید امجد کے بقول:

''یہ محض ڈرامہ نہیں تھا م کیونکہ ساری زندگی دُکھوں کی نگری میں مارا مارا پھرنے والا مسافر اِتنا طویل ڈرامہ نہیں کرسکتا۔ یہ تو ایک شخصیت کی متھ (Myth) کی تعمیر تھی جس کے لیے اُنھوں نے ثناء اللہ ڈار ہی کی قربانی نہیں دی بلکہ تمام ظاہری آرام و آسائش اور معمولات سے بھی کنارہ کشی کی۔''(20)

اور عصمت چغتائی بھی میراجی کو ایک معصوم انسان قرار دیتے ہوئے کہتی ہیں:

''یہ شخص بازی گر نہیں ہوسکتا، یہ ڈھونگ نہیں۔''(21)

واقعی یہ نہ کوئی ڈھونگ ہے نہ بازی گری، بلکہ ثناء اللہ ڈار کی محبت کا ایک انداز ہے جسے اُنھوں نے تمام عمر نبھایا۔

سحاب قزلباش کو میرا کی بے وفائی کی شکایت ہے مگر وہ اسے خوش قسمت بھی سمجھتی ہے۔ سحاب قزلباش لکھتی ہے:

''کیا مرد بھی اتنا چاہتا ہے کسی کو؟

''میرا! تم کتنی خوش قسمت ہو۔ تمھیں معلوم ہو جائے تو اِس دھرتی پر پاؤں نہ رکھ سکو۔''(22)

میرا تو مرد کی اِس چاہت کو جان ہی نہ سکی اور اُس کے پاؤں اِس دھرتی کو ماپتے رہے، البتہ میراجی کے پاؤں ایسے لڑکھڑائے کہ زندگی بھر سنبھل نہ سکے۔ عصمت چغتائی نے عورت کی ایک اور نظر سے میراجی کے عشق کو دیکھا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''میراجی کو میرا سین ملی جو اُن کا ملغوبہ بنا کر چلتی بنی۔ کہتے ہیں اُنھوں نے اُس کے نام پر ہی اپنا تخلص ''میراجی'' رکھ ڈالا۔ انتہا ہے لیچڑ پن کی، کوئی بھی سمجھ دار لڑکی کسی اِتنے پھس پھسے مرد سے وابستہ ہونا پسند نہ کرے گی جو اُس کی بیگم کا مقام پا کر فخر کرتا

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 18 (1,1)

ہو۔"(23)

خدا جانے سحاب قزلباش کی بات درست ہے یا عصمت چغتائی کی۔ یہ چاہت کی انتہا ہے یا لیچڑ پن۔ یہ عورتوں کی سوچ اور اُن کے دل کے معاملات ہیں، وہی بہتر جان سکتی ہیں، مگر ایک بات ضرور ہے کہ زندگی بھر کوئی بھی عورت میراجی سے وابستہ نہ ہو سکی۔

میرا سین کے علاوہ میراجی کے عشق کے اور قصّے بھی لوگوں نے بیان کیے ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد نے سید انصار ناصری کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"دہلی میں میراجی کو دو لڑکیوں میں خصوصی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی ایک کو وہ پیار سے بلّی خانم اور دوسری کو بدلی یا بادلی بیگم کہا کرتے تھے۔ بلّی خانم کا اصلی نام سحاب قزلباش تھا۔ وہ دہلی کے نامور شاعر آغا شاعر قزلباش کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ ریڈیو میں اُس کی بنیادی نوکری تو اناؤنسر کی تھی لیکن وہ ڈراموں میں بھی کام کرتی تھی اور اِس حوالہ سے میراجی سے اُس کا ایک "دفتری تعلق" بھی تھا۔۔۔۔۔۔ اُس کے گرد چاہنے والوں کا ایک ہجوم تھا۔ میراجی بھی اُن میں شامل تھے۔"(24)

سحاب قزلباش نے بھی اِس ذہنی اور جنسی بھوکے شخص بارے لکھتے ہوئے یہ اعتراف کیا ہے:

"میراجی، چپکے چپکے، جب بھی اُنھیں وقت ملتا مجھے گھورتے رہتے اور زندگی بھر ترستے رہے کہ میں اُن سے ڈھنگ سے بات کر لیتی۔"(25)

سحاب قزلباش نے میراجی کی زندگی میں اُن کے لیے ایک لائن تک نہیں لکھی اور نہ اُن سے ڈھنگ سے بات کی کہ کہیں، بقول سحاب قزلباش اُن کی اُلٹ کھوپڑی کچھ اور ہی نہ سمجھ بیٹھے۔

سحاب قزلباش کے علاوہ میراجی اُس زمانے میں جس دوسری خاتون میں دل چسپی لیتے تھے وہ بدلی یا بادلی بیگم تھیں جن کا اصل نام صفیہ معینی تھا۔ اخلاق احمد دہلوی کے بقول:

"یہ بڑی شوخ و شنگ خاتون تھیں، ڈرامہ آرٹسٹ تھیں۔ میراجی کے ڈراموں اور فیچروں میں اکثر کاسٹ ہوتی تھیں۔ اُنھیں دہلی کی BRIGHT VOICE سمجھا

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 19 (1,1)

جاتا تھا۔ان دونوں لڑکیوں میں میراجی کو اپنی مستقل محبوبہ میرا سین کے کچھ نقوش ملتے تھے۔میراجی کی صحت پر ان لڑکیوں کے عشق کا کافی بُرا اثر پڑا۔"(26)

سحاب قزلباش اور صفیہ معینی کے علاوہ میراجی کے عشق اور دل چسپی کی کہانی بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر رشید امجد صاحب نے سیّد انصار ناصری کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"اُن دونوں (سحاب قزلباش اور صفیہ معینی) کے علاوہ بھی کچھ خواتین تھیں جن میں میراجی دل چسپی لیتے تھے۔ایک خاتون امیتہ رائے تھیں۔بنگالی تھیں۔میراجی نے اُن پر ایک مزاحیہ نظم بھی لکھی تھی،جس کا ایک مصرع تھا: ؎

امیتا رائے پپیتا کھائے

اس خاتون کے بنگالی حُسن نے ریڈیو کے اکثر لوگوں کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔چولی پہنتی، پیٹ ننگا، ساتھ ساڑھی، جب کمرے سے نکلتی، اُس کے چلنے کی آواز آتی تو میراجی جلدی سے کاریڈار کے آخری سرے پر پہنچ جاتے۔میں میراجی سے پوچھتا، کیا کر رہے ہو؟ کہتے، دیکھو بلا آرہی ہے۔"

امیتا رائے کے علاوہ بھی کچھ اور بنگالی خواتین بھی تھیں، اپرن رائے، ریتا گنگولی، مس گھوش، جس میں میراجی دل چسپی لیتے تھے۔"(27)

میراجی کے عشق کی یہ داستان بڑی طویل ہے۔تابش دہلوی لکھتے ہیں:

"میراجی نسوانی حسن سے بہت متأثر ہوتے اور یہ تاثر بعض وقت یہاں تک اُن پر جادو کرتا کہ وہ دیواروں سے اپنا سر پھوڑتے اور لہولُہان ہو جاتے۔ایک صاحبہ جن کے نام کا ایک جزو اختر تھا، اُن کو بہت دردناک عذاب میں مبتلا رکھتیں۔یہ صاحبہ مجھ (تابش) سے زیادہ مانوس تھیں اِس لیے میراجی مجھے تابش اختر کہتے۔"(28)

گو تابش دہلوی صاحب نے اِس واقعہ کی کوئی تفصیل نہیں لکھی کہ میراجی سے اُن کا تعلق کس نوعیت کا تھا اور وہ عذاب میں کس طرح مبتلا رکھتی تھیں؟ بہرحال مذکورہ خاتون میں میراجی کی دل چسپی کا قصّہ ضرور بیان کیا ہے۔مختار صدیقی صاحب نے اُن کے تین عشق بیان کیے ہیں۔ ایک تو وہی لاہور میں بنگالی ہندو لڑکی "میرا"، دوسری دِلی ریڈیو اسٹیشن کی چمپئی رنگ کی ایک تیز

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 20 (1,1)

طرار بنگالن مسلمان لڑکی اور تیسری کوشش ایک پارسی نژاد لڑکی تھی، اور بقول مختار صدیقی:

''پہلی اور دوسری کوششوں کی طرح یہ کوشش بھی نامرادی کے اندھیروں میں گُم ہوگئی۔''(29)

اختر الایمان کے بقول اُس پارسی نژاد لڑکی کا نام مُنی رباڈی تھا۔(ڈاکٹر رشید امجد، ص 70)

اپنے اس عشق کی رُوداد مظہر ممتاز کو میراجی نے اِس طرح بتائی ہے:

''میں پیپلز تھیٹرز کے اداکاروں کو مکالمے ادا کرنے کا طریقہ بتایا کرتا تھا۔ وہاں ایک پارسی لڑکی بھی آتی تھی۔ بڑی خوب صورت، گول مول اور پیاری لڑکی تھی۔ مجھے یونہی پسند آ گئی۔ میں نے سوچا اسی کے ساتھ زندگی کے آخری دن گزار دیں گے لیکن اُس کشمیری لونڈے وشوامتر عادل نے سارا معاملہ چوپٹ کر دیا۔ وہ خود اُس سے عشق کرنے لگا اور وہ ظالم بھی اتنی ہی بے وفا نکلی کہ اُس کے خوب صورت جسم پر ریجھ گئی۔''(30)

اب پتہ نہیں اِسے عشق کہا جائے گا یا ایک عورت کے حصول کی کوشش، ہر صورت میں میراجی کے مقدر میں نامرادی کے اندھیرے ہی لکھے نظر آتے ہیں۔

احمد بشیر صاحب نے بھی میراجی کے عشق کی داستان بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میراجی نے میرا سین سے بھرپور عشق کیا مگر اس کا عشق ناقابل فہم تھا۔ اُس نے عمر بھر میرا سین سے بات بھی نہ کی، اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا بھی نہیں اور ساری زندگی اُس کے نام پر تج دی۔ میراجی نے میرا سے کوئی مقصد وابستہ نہیں کیا۔ اُس کے حصول کی کوشش نہیں کی۔ فقط کچھ وقت چوروں کی طرح دیکھتا رہا اور پھر اُس کا نام اختیار کر کے، اُس سے اور دُنیا کی تمام عورتوں سے آزاد ہوگیا۔''(31)

احمد بشیر صاحب کا خیال ہے کہ میرا سین کا حصول میراجی کا مقصد ہی نہیں تھا۔ اُنھوں نے کبھی دل سے چاہا ہی نہ تھا کہ میرا سے عشق کا اظہار کریں۔ اُس کا مقصد تو:

''چھپ چھپ کر لذت لینا تھا، میرا تو محض ایک بہانہ تھی۔''(32)

احمد بشیر صاحب کے مطابق اِس قسم کے بہانے زندگی میں اُس نے اور بھی بنائے، جس میں ایک بہانہ ایک ادیب خاتون سے عشق تھا۔ احمد بشیر صاحب نے اُس ادیب خاتون کا نام

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 21 (1,1)

ظاہر نہیں کیا، مگر ''جو ملے تھے راستے میں'' کے مرتّب یونس جاوید صاحب نے فُٹ نوٹ میں لکھا ہے کہ:

''بہت کریدنے کے بعد احمد بشیر صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ عورت عصمت چغتائی تھی۔''(33)

یہ بالکل ایک نیا انکشاف ہے۔ میراجی کے کسی دوسرے خاکہ نگار نے اس عشق کا ذکر نہیں کیا اور احمد بشیر صاحب نے نام تو ظاہر نہیں کیا (وہ کام یونس جاوید صاحب نے کر دیا ہے) مگر عشق کی تفصیل ضرور لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میراجی نے اُس خاتون ادیب (بقول یونس جاوید عصمت چغتائی) سے عشق کیا اور اپنے قول کے مطابق وہ اُن سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اُن سے میراجی کی ملاقات غالباً بمبئی جانے سے پہلے ہو چکی تھی لیکن بمبئی جانے کے بعد یہ عشق نما بہانہ بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ یہ کہانی بھی میرا کی کہانی سے ملتی جُلتی ہے مگر یہ خاتون میراجی سے بڑی شفقت سے پیش آتی تھی۔ میراجی کو یک دم خیال آیا کہ اُن سے شادی کرنی چاہیے۔ چند مہینے وہ اِس فکر میں غلطاں رہا کہ شادی کرنا بھی چاہیے کہ نہیں۔ اس فکر کے دوران اُس نے اُس خاتون سے ملنا چھوڑ دیا۔ آخر کار وہ اِس فیصلہ پر پہنچا کہ شادی کی بات ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ چنانچہ وہ اُن کے گھر پہنچا۔ خاتون حسبِ سابق نہایت اخلاق سے پیش آئی اور اُس سے نہ آنے کا شکوہ کیا۔ میراجی ابھی بات کرنے کے لیے گلا صاف کر رہا تھا کہ ایک صاحب اندر داخل ہوئے اور خاتون نے کہا: میرے شوہر۔۔۔۔ اِن سے ملیے۔'' میراجی بات کیے بغیر اُٹھ کر چلا آیا۔''(34)

اِس اِقتباس سے تو پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ خاتون سے میراجی کی ملاقاتیں بمبئی آنے سے پہلے ہو چکی تھیں۔ اس کا رویّہ بھی بڑا شفقت آمیز تھا اور میراجی نے بھی اُن سے ''قول قرار'' کر رکھے تھے جس کی بنا پر اُنھیں شادی کا بھی خیال آیا مگر چند ماہ غور و فکر میں گزر گئے اور اِس دوران پانی سر سے گزر گیا۔ احمد بشیر صاحب نے اس عشق کے انجام پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''میراجی کو تو اِس بات کا رنج بھی نہ ہوا ہو گا کیونکہ دراصل اُس کو اس خاتون سے عشق نہ

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 22 (1,1)

تھا۔ اُسے شادی کی ضرورت اور آرزو ہی نہ تھی۔ چنانچہ وہ اپنے اِس جذبے کا ذکر کسی تاثر کے اظہار کے بغیر کیا کرتا تھا۔"(35)

چند سطر پہلے احمد بشیر صاحب اِس "عشق" کا ذکر فرما رہے ہیں اور شادی بارے میرا جی کے قول کا ذکر بھی کر رہے ہیں اور تبصرے میں کہا جا رہا ہے کہ اُنھیں نہ عشق اور نہ شادی کی ضرورت اور نہ آرزو۔ حالانکہ وہ چند ماہ اِس فکر میں غلطاں بھی رہے اور بڑی سوچ بچار کے بعد شادی کی بات کرنے کا فیصلہ بھی کیا۔ اور خاتوں سے اتنا تعلق ہونے کے باوجود بے خبری اِتنی کہ اُس کی شادی کی خبر تک بھی نہ ہوئی۔ اور آخر میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ یہ باتیں میرا جی خود بغیر کسی جذبے کے کیا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس فرضی عشق کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔ عصمت چغتائی نے میرا جی کا جو خاکہ لکھا ہے اُس میں اُنھوں نے بڑی وضاحت سے میرا جی سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے اور یہ ملاقاتیں بھی اُس وقت ہوئیں جب عصمت چغتائی کی شاہد لطیف سے شادی ہو چکی تھی۔ پہلی ملاقات اُس وقت ہوئی جب میرا جی اُن کے گھر کے دروازے تک آئے۔ وہ شاہد لطیف سے ملنے آئے تھے۔ شاہد لطیف گھر پر نہیں تھے اور دروازہ عصمت چغتائی نے کھولا۔ پھر کیا ہوا، وہ لکھتی ہیں:

> "گھنٹی بجی، میں نے دروازہ کھولا۔ ایک میلا کچیلا بدبو دار انسان، دو سیڑھیاں چڑھ کر ٹھٹھک گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ بُری طرح خوف زدہ ہو گیا۔ اُس کی پتلی پتلی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ منہ کھلا مگر آواز نہ نکلی۔ جیسے اُس نے ایک دم کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ آیئے، اُوپر آجائیے۔ میں نے کہا۔ اُس کی پیشانی پر پسینہ پھوٹ نکلا۔ بغل میں دبی ہوئی فائل لرزتے ہاتھوں سے چھوٹ پڑی، مُنہ سانس لینے کے لیے کھولا، لب پھڑ پھڑائے۔ فائل اُٹھانے کو جھکا تو ہاتھ سے دولوہے کے گولے چھوٹ کر سیڑھیوں سے لڑھک گئے۔ اُس نے پھر زخمی کبوتر کی طرح مجھے سہم کر دیکھا، جلدی سے فائل سمیٹی۔ کاغذ اُلٹے سیدھے ٹھونسے اور گولے سمیٹنے لگا۔ ایک سسکی سی اُس کے منہ سے نکلی اور وہ جلدی جلدی سیڑھیاں پھلانگ کر سرپٹ بھاگا۔
> نہ جانے کون مسخرا ہے؟ میں بالکنی سے اُسے پھاٹک کی طرف لپکتا دیکھتی رہی۔" (36)

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 23 (1,1)

یہ پہلی ملاقات ہے اور اُس وقت تک وہ میراجی کو جانتی تک نہیں تھی۔ شاہد لطیف، منٹو کے ہمراہ گھر آئے تو اجنبی کا حُلیہ بیان کرنے پر اُنھوں نے کہا ''ارے میراجی ہوگا۔'' اور عصمت چغتائی اُسے ایک مسخرا اور چمرخ چوہا کہہ رہی ہے۔ میراجی سے عصمت چغتائی کی دوسری اور آخری ملاقات ایک فلمی دعوت میں ہوئی۔ وہ بھیڑ میں بھی کچھ اکیلے سے تھے اور ایک صوفے کے کونے پر تنہا بیٹھے تھے۔ عصمت چغتائی ایک دم سے جا کر اُن کے قریب بیٹھ گئی۔ وہ ایسے اُچھلے جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ ممکن تھا کہ وہ بھاگ جاتے مگر عصمت چغتائی نے دھمکی کے انداز میں کہا:

> ''بھاگنے کی کوشش مت کیجیے گا۔ ورنہ ہاتھ پکڑ لوں گی اور آپ چھڑا نہیں پائیں گے۔۔۔۔ اور سب کہیں گے کہ بدنام زمانہ ادیبہ نے بھری سبھا میں میراجی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بڑا مذاق اُڑے گا۔ میرا کچھ نہیں بگڑے گا، مگر آپ بدنام ہو جائیں گے۔'' وہ کچھ نہ بولے۔'' (37)

اِس ملاقات میں اِدھر اُدھر کی کچھ باتیں ہوئی ہیں اور زیادہ تر عصمت چغتائی نے ہی کی ہیں۔ اور پھر جیسے ہی عصمت کی تھوڑی سی توجہ ہٹی تو میراجی ''پُھر''۔ دُور دُور نام و نشان نہ تھا۔ عصمت چغتائی کو وہ بڑے معصوم، دُکھی اور غم کے مارے انسان معلوم ہوئے، جس پر اُنھیں رہ رہ کر ترس آتا ہے۔ اس کے بعد میراجی سے پھر کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔

گو بحث ذرا تھوڑی سی طویل ہو گئی ہے مگر دکھانا یہ مقصود تھا کہ ان دو کے سوا، عصمت اور میراجی کی کبھی کوئی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ تو پھر کہاں کا عشق، کہاں کے قول و قرار، کہاں شفقت آمیز ملاقاتوں کا سلسلہ اور کہاں عصمت کے گھر شادی کا پیغام لے کر جانے کا قصّہ؟ اگر احمد بشیر صاحب کو یہ باتیں میراجی نے خود بتائی ہیں تو تب بھی غلط اور اگر احمد بشیر صاحب نے کہیں اور سے سُن کر لکھی ہیں تو تب بھی درست نہیں۔ ویسے بھی عصمت چغتائی کو تو میرا سین سے میراجی کے عشق اور اُس کے نام پر اپنا تخلّص رکھنے پر اعتراض ہے اور اسے لیچڑ پن سمجھتی ہیں۔ اور اُن کی واضح اور دوٹوک رائے ہے کہ:

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 24 (1,1)

''کوئی بھی سمجھ دار لڑکی کسی اتنے پھُس پُھسے مرد سے وابستہ ہونا پسند کرے گی جو اپنی بیگم کا مقام پا کر فخر کرتا ہو؟'' (38)

تو عصمت چغتائی بذاتِ خود اس پھُس پُھسے مرد سے وابستہ ہونے کا کیسے سوچ سکتی ہے؟ وہ میراجی سے ہمدردی کو کر سکتی ہے، اُس کا غم تو کھا سکتی ہے مگر اُس سے نکاح نہیں کر سکتی۔ اور میراجی نے بھی عصمت چغتائی کو کبھی کوئی پیغام نہیں بھیجا، البتہ خط ضرور لکھا ہے جس میں بڑی لجاجت سے لکھا تھا:

''خدا کا واسطہ میری شادی کروا دیجیے، بھنگن ہو، چماری ہو، بس عورت ہو۔''(39)

اِس سلسلے میں عصمت چغتائی تو کوئی مدد نہیں کر سکی مگر میراجی نے خود ایک بار کوشش ضرور کی ہے، کیونکہ دُلہن پانے اور دیکھنے کی اُنھیں شدید تمنا تھی اور اپنی بیٹی دیکھنے کی بڑی خواہش تھی۔

عصمت چغتائی تو نہیں البتہ صفیہ معینی (بادلی بیگم) کو میراجی نے شادی کی پیش کش کی تھی اور کسی قسم کا تکلف برتنے کی بجائے سیدھے سادے انداز میں رابطہ کیا۔ میراجی کو خوش فہمی تھی کہ اُسے ہم سے گونہ رغبت ہے اِس لیے تکلف کی ضرورت ہی نہیں۔ مگر بقول سحاب قزلباش:

''جب اُس نے یہ مژدہ سنا تو ایک انگلی اپنے ہونٹ پر رکھی جو خاصی دیر کانپتی رہی۔ کچھ دیر تو آنکھیں پھاڑے اِس دُنیا میں نہ رہی، جب واپس آئی تو معلوم ہوا کہ ڈرامہ میں لڑائی کے پارٹ کی ریہرسل کر رہی ہے۔ اُس کے الفاظ کانوں میں اب تک گونج رہے ہیں۔ مُوا شاعر بنا پھرتا ہے۔ تبھی ریہرسل میں مجھے پان دیتا اور جب دیکھو گھورتا رہتا ہے۔ کہاں گیا وہ ''میرا'' کا عشق تبھی اُس نے مُنہ نہ لگایا۔ شکل تو دیکھو، داڑھی بڑھائے موا جوگی۔ لو اور سُنو بہن میری قسمت میں یہی لکھا ہے کیا؟ سب نے سُنا۔ کچھ ہنس دیے، کچھ اُداس، کچھ حیران۔ مجھے تو جیسے معلوم تھا کہ ایسا سوچنا بے کار ہے۔''(40)

یہ الفاظ میراجی نے بھی سُنے اور کئی روز جے جے ونتی کا ریکارڈ سُنے بغیر روتے رہے۔ اور بقول سحاب قزلباش:

''تم ہار کر اِتنا تھک گئے تھے کہ کسی نے کہا آٹھ روز تک تم نے کچھ بھی نہ کھایا، شراب

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 25 (1,1)

پیتے رہتے رات بھر۔"(41)

مگر ایک صحت مند اثر یہ ہوا کہ اُنھوں نے اپنا حُلیہ بہت حد تک درست کر لیا۔ داڑھی مُنڈ وادی، بال کٹوا لیے اور عام لوگوں جیسا لباس پہننے لگے۔ سحاب قزلباش اِس تبدیلی بارے لکھتی ہیں:

"پندرہ بیس دن کی چُھٹی کے بعد واپس آئے تو لوگ میراجی کو نہ پہچان سکے۔ اُنھیں احساس ہو گیا تھا سب ظاہر داری کو پسند کرتے ہیں۔ وہ دن گئے جب راکھ میں جُٹی زلفیں، گلے میں پڑی مالاؤں میں سُندریاں لپٹ جاتی تھیں ۔۔۔۔۔۔ لمبے لمبے بال، داڑھی سب غائب، کینچلی تو اُنھوں نے لاکھ بدل ڈالی مگر یہ رُوپ بھی بے کار ثابت ہوا۔"(42)

یعنی میراجی کی اِس تبدیلی کا بادلی بیگم پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ میراجی کے لکھے ہوئے ڈراموں میں اُسی طرح پارٹ ادا کرتی رہی، مگر اُس نے اِس موضوع کے متعلق یہ کہہ کر آگے بڑھنے سے انکار کر دیا کہ:

"اِس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ میں میراجی کو اپنا بزرگ سمجھتی ہوں۔"(43)

بادلی بیگم کے اِس رویّے کے بعد میراجی شادی کے اِس معاملے سے خاموشی سے الگ ہو گئے۔ اُن کے دل کو ٹھیس تو پہنچی مگر بادلی بیگم کے لیے کسی طرح کی نفرت پیدا نہ ہوئی۔ میرا جی ڈرامے لکھتے رہے۔ وہ بدستور اُن کے ڈراموں میں کام کرتی رہی اور مسکرا مسکرا کر اُن سے لے کر پان کھاتی رہی۔ ایک عرصے کے بعد ایک سنگین واقعہ ہوا۔ بقول ڈاکٹر رشید امجد:

"ایک عرصے کے بعد بادلی بیگم حاملہ ہو گئی۔ متعلقہ شخص نے شادی سے انکار کر دیا۔ میراجی کو معلوم ہوا تو محض اِس خیال سے کہ بیگم کی عزت پر حرف آئے گا اور پیدا ہونے والا بچہ حرامی کہلائے گا، شادی پر تیار ہو گئے۔ لیکن قیوم نظر نے یہ شادی نہ ہونے دی۔ قیوم نظر نے بڑی مشکلوں سے میراجی کو اِس اِرادے سے باز رکھا۔"(44)

عورت کے قرب کے لیے تر ساہٹ اپنی جگہ، مگر میراجی کی یہ مثبت سوچ اور رویّہ اُن کی عظمت کی دلیل ہے۔

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 26 (1,1)

اکرام اللہ کامی، میراجی کے بھائی نے لکھا ہے کہ ''میرا سین کے عشق کے بعد میراجی سنبھالے نہ سنبھل سکے۔ اُن کی ہر بات بدل گئی، گویا اُنھوں نے ایک نیا جنم لیا۔ اس نئے جنم میں اُنھیں اپنے سر پیر کا ہوش نہ رہا۔ اِس عشق میں پہلا کام تو یہ کیا کہ اُس کے نام پر اپنا نام رکھ لیا اور پھر اُس کی تقلید میں بال بڑھا لیے اور بقول محمود نظامی:

''میرا کے گیان دھیان نے اُنھیں ایسا بے سُدھ کیا کہ اُنھیں نہانے دھونے اور لباس کا بھی ہوش نہ رہا۔ زندگی کے تمام مشاغل ختم ہوئے۔''(45)

شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں:

''میراجی بڑے گندے آدمی تھے۔ اُنھیں کبھی کسی نے نہاتے ہوئے نہیں دیکھا، بلکہ مُنہ دھوتے بھی نہیں دیکھا۔ بال وحشیوں کی طرح ہمیشہ بڑھے رہتے۔ کبھی نہ تیل ڈالتے اور نہ اُنھیں بناتے۔۔۔۔ سادھوؤں کی سی کنٹھی بھی ڈال لی تھی۔ اُن کے بچپن سے بڑی گھن آتی تھی۔۔۔۔ گرمیوں میں بھی گرم کوٹ پہنتے، نہایت موٹے اور بھدے ٹپو کا اچکن نما کوٹ اور اُسی کا پتلون۔ جاڑا، گرمی سب میں یہی گرم لباس چلتا۔''(46)

شوکت تھانوی لکھتے ہیں:

''وہ عجیب الخلقت انسان تھا جو گرمیوں میں جاڑے کے کپڑے پہنے ہوئے، ہاتھ میں مداریوں کے گولے لیے، گلے میں موٹے موٹے دانوں کی مالائیں ڈالے لمبے لمبے بال اُلجھائے، میرابائی کے بھجن گاتا۔''(47)

اخلاق احمد دہلوی کہتے ہیں:

''میراجی پتلون بغیر جیبوں کی پہنتے اور شیروانی کی جیبوں میں اپنے غیر مطبوعہ مسودات، فلم ایکٹرسوں کی نیم برہنہ تصویروں، ٹوٹی ہوئی چوڑیوں، استعمال شدہ سوباؤں کے ملغوبے سے تھیلا سا بنائے رکھتے۔ موسموں کے لحاظ سے کبھی نہ پہنتے اور سامان مطلق نہ رکھتے۔ نہ تکیہ، نہ بستر نہ چارپائی۔''(48)

منٹو کو اِس ہیئت کذائی اور رویّے میں رہبانیت اور درویشانہ پن نظر آتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اِس انسان نے اپنی کیا ہیئت کذائی بنا رکھی ہے۔ لمبے لمبے غلیظ بال جو گردن سے

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 27 (1,1)

نیچے لٹکتے تھے۔فرنچ کٹ سی داڑھی،میل سے بھرے ناخن۔۔۔۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مہینوں سے اُس کے بدن نے پانی کی شکل نہیں دیکھی۔۔۔۔لیکن اُس کی غلاظت،اُس کے لمبے بال،اُس کی فرنچ کٹ داڑھی،گلے کی مالااور وہ تین آہنی گولے اُس کے معاشی حالات کے مظہر معلوم نہیں ہوتے تھے۔اُن میں ایک درویشانہ پن تھا۔ایک قسم کی رہبانیت۔"(49)

مختار صدیقی میراجی کو ایک باغی قرار دیتے ہیں۔ایسا باغی جس نے سماج،مذہب اور کہنہ روایات کی بوسیدگی سے بغاوت کی۔وہ لکھتے ہیں:

"جس معاشرے نے اُنھیں پیدا کیااور پروان چڑھایا اُس سے متنفر اور باغی تھے لیکن یہ بغاوت اپنی ذات تک محدود تھی۔"(50)

گو یہ بغاوت اُن کی اپنی ذات تک محدود تھی مگر اس بغاوت کا انجام بقول ممتاز مفتی یہ ہوا کہ:

"میراجی نے انتقاماً خود اپنی شخصیت کے پرزے پرزے کر کے اُنھیں اُڑا دیا،بکھیر دیا۔غصّے کے چمچے سے اپنی شخصیت کو انڈے کی طرح پھینٹ دیا۔انوکھی گھمن گھیریوں میں گھما دیااور پھر میراجی نے فاتحانہ انداز سے سر اُٹھایا۔۔۔۔۔۔"ایسے ہی ہیں،نہیں ایسے نہیں،اس سے بھی بدتر ہیں،ہاں کرلو ہمارا کیا کرتے ہو۔"(51)

کسی نے کیا کرنا تھا؟ اُنھوں نے اپنے ساتھ جو کیا خود ہی کیا۔

تابش دہلوی کہتے ہیں:

"وہ سچے آدمی تھے اور اسی سچائی کو ہر جگہ دیکھنا چاہتے تھے۔دُنیا اور دُنیا کے تعلقات میں،فطرت میں،ذہن وفکر میں اور اُن کے خدوخال میں۔غرض اپنے اِرد گرد کی ہر چیز کو وہ اپنے ذہن کی مطابقت سے دیکھنا پسند کرتے۔"(52)

ایسا ممکن نہیں تھا مگر اس کی سوچ یہی تھی۔شاید اسی لیے منٹو نے اُسے ایک ایسا بھٹکا ہوا مسافر کہا ہے جو نگری نگری گھوم رہا ہے۔

"منزلیں قدم قدم پر اپنی آغوش اُس کے لیے وا کرتی ہیں۔مگر وہ اُن کی طرف

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 28 (1,1)

دیکھے بغیر آگے نکلتا جا رہا ہے۔۔۔کسی ایسی جگہ، جس کی کوئی سمت ہے نہ رقبہ۔۔۔۔
ایک ایسی تکون کی جانب جس کے ارکان اپنی جگہ سے ہٹ کر تین دائروں کی شکل
میں اُس کے گرد گھوم رہے ہیں۔"(53)

احمد بشیر بھی اُنھیں ایک ایسا بھٹکا ہوا راہی قرار دیتے ہیں جس کی کوئی منزل نہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

"اُس کی کوئی منزل نہ تھی۔ اُس کو صرف چلتے رہنے سے کام تھا۔ اُس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ اُس کے پیر سوجے ہوئے تھے۔ تلووں سے خون رِستا تھا۔ مگر وہ صحرائی بگولے کی طرح جنگل جنگل پھرتا رہا۔ نہ اُس نے کسی سے راستہ پوچھا نہ کبھی پیچھے مُڑ کر دیکھا۔"(54)

وہ بظاہر بھٹکا ہوا راہی جس کا کام صرف چلنا تھا، جس کی کوئی منزل نہ تھی، اُس نے اپنی منزل کا سراغ اپنے من میں تلاش کر لیا۔ زندگی کے پے در پے تھپیڑوں کی تاب نہ لا کر اُس نے اپنی ہی ذات میں پناہ ڈھونڈ لی۔ قدرت اللہ شہاب کے مطابق:

"میراجی نے زندگی کے خونی بھیڑیئے سے بھاگنے کے لیے جو راستہ اختیار کیا وہ اُسے اُس کے اپنے نہاں خانوں میں لے گیا۔ نہاں خانہ خواہ دل کا ہو یا دماغ کا اکثر تاریک ہوتا ہے۔"(55)

ان تاریک راستوں کا انتخاب کرنے کے بعد اُس "باغی" نے انتقام کے لیے بھی اپنی ذات ہی کو منتخب کیا۔ لباس اور جسم کی صفائی سے تو وہ پہلے ہی لاپروا ہو چکے تھے، پھر خود لذّتی اور شراب کا بھی شکار ہو کے رہ گئے۔ شاہد احمد دہلوی کا بیان ہے کہ:

"میراجی جنسی اعتبار سے ایک گنجلک تھے۔ خدا جانے استمنا بالید کا اُنھیں چسکا کہاں سے لگا کہ جیتے جی نہ چُھوٹا اور اُنھیں کسی جوگا نہ رکھا۔"(56)

اِس عمل پر شرم سار ہونے کی بجائے وہ اسے فخریہ بیان کرتے تھے، اور کہا کرتے تھے کہ اس کی بدولت میری سب تمنّائیں پوری ہو جاتی ہیں۔ شاہد احمد دہلوی اِس امر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ ہمیں کہتے:

"آپ ایک ایک کا مُنہ تکتے اور دل میں حسرت لیے رہ جاتے ہیں۔ میں کسی کو دیکھتا

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 29 (1,1)

ہوں تو اُس کا لطف بھی حاصل کر لیتا ہوں۔۔۔۔۔جب کہا جاتا کہ یہ تو بڑی غلط چیز ہے تو جواب ملتا کہ میں سائنٹفک طریقے کا دست کار ہوں۔ اِس دست کاری میں اُنھیں اِتنا غلو تھا کہ قیدِ مقام سے بھی گزر چکے تھے۔اُن کے پتلون کی بائیں جیب تو بنی ہوئی تھی مگر جیب کا کپڑا غائب تھا۔"(57)

میراجی چونکہ عام انسانوں سے مختلف تھے یا مختلف نظر آنا چاہتے تھے، اِس لیے اُن کا لذّت کا تصوّر اور لذّت کے ذرائع بھی مختلف تھے۔لذّت کے حصول کے لیے اُسے عورت سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا بلکہ وہ عورت کو اِس عمل کے لیے ایک بے معنی اور مجہول شے سمجھتے۔احمد بشیر صاحب کے نزدیک عشق وِشق اپنی جگہ مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو کسی بندش میں گرفتار سمجھتے ہی نہ تھے۔اُن کا نروان اُن کی اپنی اَنا کی لذّت میں تھا۔احمد بشیر صاحب کے بقول:

"میراجی لذّت کا غلام تھا۔۔۔اُس نے اپنے شبستانِ عیش کے دروازے صرف اپنی ذات ہی پر کھولے تھے اور کسی کو اس میں جھانکنے کا موقع نہیں دیا۔وہ دُنیا کے جھمیلوں سے بے نیاز اپنی ذات میں چُھپ کے چوری چوری لذّت لیتا رہا۔۔۔۔اُس نے لذّت کشی کے تمام تقاضے پورے کیے۔۔۔۔۔لذّت کے تقاضے پورے کرنے میں اُسے بہت دسترس حاصل تھی بلکہ اس سلسلے میں اُسے "یدِ بیضا" عطا ہوا تھا۔وہ اپنے یدِ بیضا کا بڑے شوق اور اعتماد سے ذکر کیا کرتا تھا۔"(58)

شاید یہی سبب تھا کہ میراجی اپنی ذات میں سمٹ کر رہ گئے تھے۔اَنا پرستی، لذّت پرستی، ہیئت کذائی، لباس اور زندگی کی دوسری اُلجھنوں نے اُنھیں ایک پُراسرار شخصیت بنا دیا تھا۔

میرا سے ثناء اللہ کا وصال نہ ہوا نہ ہو سکا۔اس نہ ہونے یا نہ ہو سکنے کا ردِّ عمل میراجی خود تھا۔اور صورتِ حال یہ تھی کہ محبوب سے وصال کے لیے محبوب کا وجود بھی لازم نہیں تھا بلکہ وہ خود ہی عاشق، خود ہی معشوق اور خود ہی وصال تھے۔میراجی کی جنسی اجابت بارے منٹو لکھتے ہیں:

"اُس نے مجھے دہلی میں بتایا تھا کہ اُس کی جنسی اجابت عام طور پر ریڈیو سٹیشن کے اسٹوڈیو میں ہوتی ہے۔جب یہ کمرے خالی ہوتے تھے وہ بڑے اطمینان سے اپنی حاجت رفع کر لیا کرتا تھا۔"(59)

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 30 (1,1)

اِس عمل سے منٹو نے ایک نتیجہ اخذ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''وہ اشخاص جو اپنی خواہشاتِ جسمانی کا فیصلہ اپنے ہاتھوں کو سونپ دیتے ہیں، عام طور پر مخلص ہوتے ہیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خود کو صریحاً دھوکہ دیتے ہیں مگر اس فریب دہی میں جو خلوص ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔''(60)

منٹو میراجی کو ایک دل چسپ اور پرلے درجے کا مخلص انسان قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''میراجی نے شاعری کی بڑے خلوص کے ساتھ، شراب پی بڑے خلوص کے ساتھ، بھنگ پی بڑے خلوص کے ساتھ، لوگوں سے دوستی کی اور اُسے نبھایا۔ اپنی زندگی میں ایک عظیم ترین خواہش کو حُل دینے کے بعد وہ کسی اور سے دھوکہ فریب کرنے کا اہل ہی نہیں رہا تھا۔ اس اہلیت کے اخراج کے بعد وہ اِس قدر بے ضرر ہو گیا تھا کہ بے مصرف سا معلوم ہوتا تھا۔''(61)

بہر حال اِس دل چسپ، بے ضرر اور مخلص انسان نے خود کو زندگی بھر اذیّت بھی بڑے خلوص سے دی۔ خود کو اذیّت دینے میں خود لذّتی کے ساتھ ساتھ شراب نے بھی پورا ساتھ دیا۔ شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں:

''شراب نوشی کی لت خدا جانے میرا کو کہاں سے لگی۔۔۔۔۔۔ پہلے رات کو پیتے تھے پھر دن کو بھی پینے لگے۔ سوڈا یا پانی ملانے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ یونہی بوتل سے مُنہ لگا کر غٹا غٹ چڑھا جاتے تھے۔''(62)

منٹو صاحب کہتے ہیں، اُنھوں نے شراب پی بڑے خلوص کے ساتھ۔ شراب پی کر کبھی کسی نالی میں گرے ہیں اور کبھی کسی سڑک پر بے ہوش پڑے ہیں۔ اخلاق احمد دہلوی اور شاہد احمد دہلوی نے اُن کی بے ہوشی کے قصّے بیان کیے ہیں۔ اخلاق احمد دہلوی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''کئی کئی لڑکیوں سے ایک ہی وقت میں عشق کرنے کے باوجود ایک ہی لڑکی ''میرا سین'' کے عشق کی مالا جپتے اور اسی طرح ساری شرابیں ملا کر ہر قماش کے لوگوں کے ساتھ پیتے۔''(63)

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 31 (1,1)

پیسے پاس نہ ہوتے تو دوست احباب سے مانگ کر شراب خرید کر پیتے۔منٹو صاحب لکھتے ہیں:

''بہت دیر تک اُس کو ہر روز ساڑھے سات روپے دینا میرا فرض ہو گیا۔۔۔اس کے لیے میں اس رقم کا انتظام کر رکھتا۔سات روپے میں رم کا اڈھا آتا تھا۔باقی آٹھ آنے اُس کے آنے جانے کے لیے ہوتے تھے۔''(64)

اور جب فلم انڈسٹری کے حالات خراب ہونے کے سبب منٹو صاحب کا بھی ہاتھ کچھ تنگ ہو گیا اور میراجی کی شراب کا خرچہ برداشت کرنے کے قابل نہ رہے تو میراجی نے ''بھنگ'' کھانی شروع کر دی۔ اِس خود لذّتی اور شراب نوشی نے اس معصوم اور بے ضرر انسان کو ایسی اخلاقی پستیوں میں گرا دیا کہ میراجی ایک غلیظ پیکر کی مستقل صورت بن کر رہ گئے۔

انتظار حسین لکھتے ہیں:

''میراجی گرمیوں میں اوورکوٹ پہنتے تھے،میراجی کے ناخنوں میں میل پھنسا رہتا تھا، میراجی ہاتھ میں تین آہنی گولے رکھتے تھے،میراجی نے میرا سے عشق کیا۔میراجی شراب پیتے تھے۔۔۔یہ سب واقعات ہیں۔یہ تمام تجربے کن کیفیات سے گزر کر شاعر کے لیے واردات بنتے ہیں؟ ذات کی گہرائی میں کس کس جذبے اور کس کس خیال سے مل کر نیا جنم لیتے ہیں؟ اصل بات تو جاننے کی وہ ہے۔''(65)

انتظار حسین صاحب نے مزید لکھا ہے کہ:

''وہ اپنے تجربات کے بارِ گراں میں ہمارے لیے زندگی بسر کر گیا۔اُس کو سراہنا ہمارے ذمے ہے،ہمارا فرض ہے۔

نامرادانہ زیست کرتا تھا
میر کا طور یاد ہے ہم کو

(66)

مقامِ شکر ہے کہ ہمارے ناقدین اور خاکہ نگاروں نے اس فرض کو خوب نبھایا ہے۔میرا جی کی شاعری کے ساتھ ساتھ اُن کے طور طریقوں کو بھی بیان کیا۔اُن کی شخصیت کی من جملہ

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 32 (1,1)

خرابیوں کے ساتھ ساتھ اُن کی خوبیوں کو بھی شمار کیا ہے۔

شاہد احمد دہلوی کا کہنا ہے کہ:

''میراجی کی شخصیت میں بیسیوں خرابیاں آ گئی تھیں، لیکن طبعاً وہ ایک شریف انسان تھے۔ دوستوں کے لیے دامے، درمے، قدمے ہر طرح کی خدمت کرنے کو تیار رہتے تھے۔۔۔۔ میراجی کو میں نے کبھی کسی سے بدزبانی کرتے نہیں دیکھا۔ وہ کسی سے مذاق تک نہیں کرتے تھے۔ ادب آداب ہمیشہ ملحوظ رکھتے۔ اُن کی بھونڈی وضع قطع پر بے تکلف دوست پھبتیاں کستے مگر وہ صرف مسکرا کر رہ جاتے اور کبھی الٹ کر کوئی سخت جواب نہ دیتے۔۔۔ اُنھیں دیکھ کر اندر سے دل کہتا تھا کہ یہ ایک عظیم انسان ہے۔ اِتنی نفرت انگیزیوں کے باوجود دل اُس کی طرف کھنچتا تھا۔ ایسا مقناطیسی شخصیت کا انسان میں نے کوئی اور نہیں دیکھا۔''(67)

شاہد احمد دہلوی صاحب نے اُنھیں ایک مقناطیسی شخصیت رکھنے والا عظیم انسان قرار دیا ہے۔ اِس لیے کہ میراجی کا ظاہر باطن ایک تھا۔ اُنھوں نے کبھی اپنے عیبوں کو نہیں چھپایا، نہ کبھی اپنی خوبیوں کے قصّے بیان کر کے داد طلب کی۔ ریاکاری اُن میں نام کو نہیں تھی۔ میراجی کی اَنا پرستی کے باوجود احمد بشیر صاحب اُن کی گفتگو میں وضع داری کے قائل ہیں۔ اُن کے بقول:

''بات چیت کے رکھ رکھاؤ میں بہت محتاط تھا۔ انتہائی غصّے میں بھی اُس کی زبان سے کسی کے لیے ''تم'' کا لفظ نہ نکلتا تھا۔۔۔۔۔ اور انتہائی بے تکلفی کے باوجود حفظِ مراتب کی کڑی حدود میں رہتا تھا۔''(68)

ڈاکٹر عبادت بریلوی میراجی کے بارے میں کہتے ہیں:

''میراجی بلا کے ذہین تھے، اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ ہر موضوع پر اپنی مخصوص رائے رکھتے تھے۔ مزاج میں بے باکی تھی مگر انداز دھیما اور نرم۔ وہ بہت صاف گو تھے اور کوئی بات چھپا نہیں سکتے تھے۔ اور مزاج میں سادگی تھی۔ یہاں تک کہ اُنھیں اپنی اہمیت کا احساس نہیں تھا۔''(69)

منٹو اُن کے اندازِ گفتگو اور اِنسانی رویّے کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 33 (1,1)

''عام گفتگو میں وہ بڑا واضح دماغ تھا۔ اُس کے دماغ میں مکڑی کے جالے نہیں تھے اور اُس کی باتوں میں کوئی اُلجھاؤ نہیں ہوتا تھا۔۔۔۔ وہ پرلے درجے کا ایسا مخلص انسان تھا جس کو اپنی اس قریب قریب نایاب صفت کا بھی مطلق احساس نہیں تھا۔''(70)

میراجی کو لباس پہننے کا سلیقہ تھا یا نہیں تھا مگر بات کرنے اور لوگوں سے ملنے ملانے کا سلیقہ ضرور تھا اور وہ انسان کو انسان سمجھ کر ہی ملتے تھے۔ اخلاق احمد دہلوی اِس بارے میں اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''میراجی تقریباً چھ برس تک باقاعدہ دِلّی رہے اور دِلّی کے ادیبوں سے لے کر دِلّی کے تانگے والوں اور فقیروں تک سے یکساں سلوک کے ساتھ ملتے رہے۔ وہ انسان انسان میں فرق کرنا نہیں جانتے تھے۔ کہتے تھے گاندھی جی چاہے بھنگی کالونی میں رہیں یا بھنگی گاندھی کالونی میں رہے، میرے لیے سب برابر ہیں۔''(71)

یہ کوئی معمولی رویّہ نہیں ہے اور نہ ایسا رویّہ اور طرزِ عمل کسی عام اور معمولی آدمی کا ہو سکتا ہے۔ یہ اُن کا کام ہے جن کے حوصلے ہوں زیادہ، جو انسان کی بطور انسان عزت اور عظمت کے قائل ہوں۔ میراجی ''فرعون با سامان'' قسم کے افسروں کا آملیٹ بنانے کا ہُنر جانتے تھے اور اُنھیں چیلنج کر کے، وارننگ دے کر اور بتا کر اُن کا آملیٹ بناتے تھے، مگر عام آدمی کی خدمت اور ہمدردی میں وہ اپنی نظیر آپ تھے۔ مختار صدیقی لکھتے ہیں:

''دوستوں کا ذکر کیا، ساتھی کارکنوں اور معمولی شناساؤں کے لیے وہ اِتنا کچھ کرتے تھے کہ ہم دوستوں کے لیے کر سکیں تو بہت بڑا احسان کریں۔ لوگوں کی عرضیاں لکھنے لکھوانے سے لے کر، قرضے کا اہتمام کرنا، اُن کی دفتری اور غیر دفتری اُلجھن سلجھانا، ہومیوپیتھی کی دوا مہیا کرنا۔ اُن میں ادبی جوہر کی نمود و نمائش، غرض اُن کے مرنے جینے کے سب کاموں کا ٹھیکہ اُن کے پاس تھا۔''(72)

عام آدمیوں کے کاموں کا اِس طرح ٹھیکہ لینا اور عملی طور پر اس طرح خدمت کرنا، میراجی کی عظمت اور بڑے پن کی دلیل ہے۔ عام آدمی سے اِتنا دوستانہ اور خدمت کا جذبہ رکھنے کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ تُند مزاج بھی تھے۔ جتنے منکسر المزاج تھے اُتنے ہی انانیت کے قائل۔

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 34 (1,1)

بقول اخلاق احمد دہلوی:

''شاعر کا دل، محتسب کا دماغ اور فوجی چال ڈھال رکھنے کی وجہ سے وہ اکثر اوقات اپنے دوستوں کے سنبھالے نہ سنبھلتے۔ وہ بے قاعدگیوں تک میں باقاعدگی اور خاص نوع کے نظم وضبط کے قائل تھے۔۔۔۔۔ میلے لباس اور اپنے عُجلی پن کے باوجود مردِ معقول نظر آتے۔۔۔۔۔۔ بغیر صابن ہاتھ دھوئے کھانا نہ کھاتے اور کھانا کھا کر اپنے کپڑوں سے ہاتھ صاف کر لیتے۔''(73)

یہ اِس لیے تھا کہ اُن میں ظاہر داری یا ریاکاری نہیں تھی۔ اُن کا ظاہر باطن ایک تھا۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ باطن روشن تر تھا اور وہ کسی قسم کے کمپلیکس کا شکار نہیں تھے۔

میراجی کی ایک اور بڑی انسانی صفت، جس کا خاکہ نگاروں نے خاص ذکر کیا ہے، وہ روپے پیسے کے لالچ، حرص و ہوس سے بے نیازی اور بے رغبتی ہے۔ اُنھوں نے زندگی بھر روپے پیسے کو اہمیت نہیں دی۔ روپیہ پیسہ ہاتھ آیا تو اُسے بے دردی سے اُڑا دیا، لُٹا دیا، غریبوں میں بانٹ دیا اور پھر اپنی فاقہ مستی میں خوش اور مطمئن۔ ممکن ہے اِس مادی عہد میں اِسے میراجی کی کم عقلی یا حماقت سے تعبیر کیا جائے مگر حقیقت میں یہ میراجی کی عالی ظرفی اور عظمت کی کہانی ہے۔

احمد بشیر صاحب لکھتے ہیں:

''میراجی کو کبھی دولت مند بننے کی آرزو نہیں ہوئی۔ اُسے تو روپے جیب میں رکھنے کی عادت ہی نہیں تھی۔ روپیہ اُس کے لیے ایک غیر مانوس چیز تھی، جیسے سکّے اُس کی جیب میں جلنے لگتے ہوں۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں اُس کے تن بدن میں آگ نہ لگ جائے۔ اِس لیے وہ جلد از جلد جیب خالی کر دیتا تھا۔''(74)

زندگی گزارنے کے لیے پیسہ ضروری بھی ہے۔ ایک دفعہ میراجی کو ضرورت پڑی تو بقول احمد بشیر:

''میراجی نے حاجت سے مجبور ہو کر ایک فلم میں ڈاکیے کا پارٹ بھی کیا اور اُس کے معاوضے میں پچاس روپے بھی پائے، جن کی اُس نے شراب پی ڈالی۔ وہ شراب نہ پیتا تو روپے کہیں پھینک کے آجاتا۔''(75)

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 35 (1,1)

میراجی اپنی شخصیت کے حوالے سے دوسروں سے منفرد تھا اور زندگی کے ہر عمل میں اپنی انفرادیت کو قائم رکھا، مگر یہ عمل محض اپنی انفرادیت کے دِکھاوے کے لیے نہیں تھا بلکہ اُس کی شخصیت کا حصہ تھا۔ اخلاق احمد دہلوی صاحب نے میراجی کی روپے پیسے سے بے رغبتی کے بارے بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''میرے علم میں ہے کہ اُن کے مجموعوں کے اُنھیں سات سات سو، آٹھ، آٹھ سو ملے لیکن دوسرے ہی دن میراجی کو کوڑی کوڑی کا محتاج پایا۔ پینے پلانے کے بعد جو کچھ بچتا وہ چپڑاسیوں، بھنگیوں اور تانگے والوں میں بانٹ دیتے، اور پھر بھی اگر کچھ پیسے بچ رہتے تو اُنھیں سڑک پر اُچھال دیتے اور خالی ہاتھ گرتے پڑتے گھر جا کر سو جاتے۔''(76)

اخلاق احمد دہلوی صاحب نے میراجی کی شخصیت کی اِس عادت اور فطرت کے اور قصّے بھی بیان کیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، ایک بار اُنھیں شاہد احمد دہلوی صاحب سے اچھی خاصی رقم ملی۔ بقول میراجی چھ ہزار چھوسو چھبیس روپے چھ آنے، چھ پائی۔ یہ کثیر رقم بھی اُنھوں نے بانٹ دی، اُچھال دی۔ اور اخلاق احمد صاحب نے اُنھیں ایک سڑک پر بے ہوشی کے عالم میں پڑے دیکھا۔ گھر پہنچا کر جیبیں دیکھیں تو اُن میں صرف چار سو باقی تھے اور وہ شاید اِس لیے بچ گئے کہ سڑک پر اُچھالنے سے پہلے بے ہوش ہو گئے۔ ایک تانگے والے نے اخلاق احمد صاحب کو بتلایا کہ:

> ''ایک دفعہ بابو جی (میراجی) نے اِتنی سی دُور کے (یعنی تھوڑے سے فاصلے کے) مجھے سو روپے دیے تھے اور کہا تھا ''جا بچہ تیرا کلیان ہو۔''(77)

دوسروں کے کلیان کے لیے وہ ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ میراجی کی انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق کی ایک کہانی ڈاکٹر رشید امجد نے یوں بیان کی ہے:

> ''بمبئی میں میراجی نے اپنے دوست نسیم الظفر سے کہا: ''میں نے 2170 روپے جمع کر لیے ہیں۔ مکالمے اور گیت کے پانچ ہزار ایک پروڈیوسر سے طے ہوئے ہیں۔ کل ایک ہزار پیشگی مل جائے گی۔ بس اب میں ایک مہینے کے لیے لاہور چلا جاؤں گا۔ اُس وقت وہاں ایک مشہور ترقی پسند شاعر بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے میراجی کی بات سُن کر رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔۔۔ ''اگر دو ہزار کہیں سے مل جائیں تو اپنی ایک بہن کو سینی ٹوریم میں

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 36 (1,1)

داخل کرادوں، تب دق کا دوسرا اسٹیج ہے، جان بچ سکتی ہے۔لیکن دو ہزار کہاں سے لاؤں؟" یہ کہ کر وہ رونے لگے۔میرا جی نے کہا، دو ہزار کل تم مجھ سے لے لینا۔۔۔۔۔چلو جہاں اِتنے دن لاہور سے دُور گزرے وہاں کچھ اور سہی۔میں دو تین مہینے بعد لاہور چلا جاؤں گا۔"(78)

مگر پھر وہ کبھی ماں سے ملنے لاہور نہ آسکا۔انسانوں کے جنگل میں بنگری بنگری بھٹکتا یہ مسافر گھر کا رستہ بُھول گیا اور بقول احمد بشیر صاحب:

"بغلوں میں ہاتھ دبائے، سر جھکائے، ان دیکھی، اَن سُنی پُر اسرار گھاٹیوں میں گھومتے گھومتے ایک دن وہ ایک سُونی پگڈنڈی پر گر کے مر گیا۔"(79)

منٹو اُن کی موت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اچھا ہوا وہ جلدی مر گیا۔اُس کی زندگی کے خرابے میں اور زیادہ خراب ہونے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔"(80)

اختر الایمان نے قیوم نظر کے نام ایک خط میں میرا جی کی زندگی کے آخری لمحات کو بیان کیا ہے۔اُن کی بیماری، علاج اور میرا جی کے دورانِ علاج بھی انتہا کی بد پرہیزی اور اپنی من مانیوں کا تذکرہ کیا ہے۔اختر الایمان کا کہنا ہے کہ:

"ہم نے اُنھیں بچانے کی کوئی کوشش اُٹھا نہ رکھی لیکن افسوس کہ خود اُنھوں نے ہمارا ساتھ نہ دیا۔"(81)

اِسی قسم کا ایک خط اختر الایمان کی بیوی سلطانہ منصوری نے مظہر ممتاز کو لکھا ہے اور اِس بات پر تعجّب کا اظہار کیا ہے کہ:

"پاکستان میں یہ افواہ کیسے پھیل رہی ہے کہ میرا جی نے نہایت کسمپرسی کے عالم میں انتقال کیا، جب کہ ہم نے اُن کا ہر طرح خیال رکھا اور بمبئی کے سب سے بڑے ہسپتال کنگ ایڈورڈ میموریل ہسپتال میں اُن کے علاج کی کوشش کی، مگر میرا جی بلا کے بد پرہیز تھے۔جس سے اُن کی حالت دن بدن خراب ہوتی گئی اور ہماری کوئی کوشش کامیاب نہ ہوسکی اور آخر کار 3 نومبر 1949ء، شام کے چار بجے اُن کا

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 37 (1,1)

انتقال ہوگیا۔"(82)

خط کافی طویل ہے جس میں اُنھوں نے اپنی تمام تر کوشش، علاج اور اُن کی بد پرہیزیوں کی تفصیل درج کی ہے۔ اِس لیے یہ کہنا مناسب نہیں ہے کہ میراجی کا انتقال کسمپرسی کے عالم میں ہوا۔

بہر حال میراجی 3 نومبر کو اِس دُنیا سے رُخصت ہوئے اور 4 نومبر 1949ء کو اُنھیں میرن لائن قبرستان بمبئی میں دفن کر دیا گیا۔

لوگوں کی عصبیت اور نظریاتی اختلاف کے غبار میں انسانی قدروں کے اوجھل ہونے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اختر الایمان نے یہ گلہ ضرور کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"تمھیں معلوم ہے میراجی کے جنازے میں بمبئی جیسے عظیم شہر میں کتنے لوگ شامل ہوئے تھے؟ صرف چار، میرے ہم زلف (سرن جی) مدھوسودن، پریم (شالیمار فلم کمپنی کے ملازم) اور میں۔"(83)

اِن چاروں نے مل کر سب انتظام کیا اور اُس بھٹکے ہوئے مسافر کو آخری منزل تک پہنچایا۔ اس شخص کی آخری منزل، جس کی کوئی منزل نہیں تھی۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی میراجی کی موت پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وہ درد و کرب کا ایک مجسّمہ تھے۔ اُنھیں زندگی کی کوئی بھی منزل راس نہیں آئی۔ وہ زندگی بھر تڑپتے اور تلملاتے رہے اور بالآخر اُنھوں نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔۔۔۔۔۔۔ میراجی مر گئے، بہت افسوس ہے۔ لیکن سب سے بڑا افسوس اِس بات کا ہے کہ میراجی کے ساتھ ایک دُنیا ختم ہوگئی۔ ایک مخصوص رُجحان ختم ہوگیا۔ ایک انداز ختم ہوگیا۔ ایک اِدارہ ختم ہوگیا۔ ایک تحریک ختم ہوگئی۔"(84)

ڈاکٹر عبادت بریلوی کی تحریر میں اُن کے غم، دُکھ، افسوس اور ہمدردی کے جذبات کی جھلک واضح اور نمایاں ہے مگر شوکت تھانوی صاحب کہتے ہیں، میراجی مرے کب ہیں؟ وہ رُجحان اور تحریک کب ختم ہوئی ہے۔ میراجی تو بھوت بن کر جیئے اور مرنے کے بعد مزید زندہ ہو رہے

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 38 (1,1)

ہیں ۔میراجی جیسےلوگ نہیں مرتے مگر ایسے لوگ سمجھ میں بھی کم آتے ہیں ۔

شوکت تھانوی لکھتے ہیں:

''وہ شخص جو ثناءاللہ بن کر پیدا ہوا،اور میراجی بن کر مرا۔وہ مسلمان جو ہندو میتھالوجی کا دیوانہ تھا،وہ شاعر جس کو مذہبیات،جنسیات اور نفسیات کے مطالعہ کا جنون تھا،وہ کنوارہ جو میراسین پر مر کر زندہ رہا اور پھر دِلّی میں بادلی بیگم اور بلّی خانم کے عشق کا دم بھرتا رہا، مگر کسی کا شرمندۂ احسان نہ ہوا۔وہ شرابی جس کو خود شراب پیئے جا رہی تھی،وہ وجدانی تخلیہ میں قرآن پاک سُن کر روتا اور دم تحریر،بغیر دیوناگری میں''اوم'' لکھے ہوئے، کچھ نہ لکھ سکتا،غور کیجئے،ایسا آدمی سمجھ میں کیوں کر آسکتا تھا؟اس قسم کی شخصیتیں سمجھنے سمجھانے کے لیے ہوتی ہی کب ہیں؟ان پر غور کیجیے تو عقل کا زیاں،غور نہ کیجیے تو ذہنی فالج کا خطرہ۔''(85)

شوکت تھانوی صاحب نے عقل کے زیاں کا تھوڑا بہت رِسک لیا ہے مگر ذہنی فالج سے محفوظ ہو گئے ۔ایسا ہی رِسک سحاب قزلباش نے بھی لیا ہے ۔وہ سحاب قزلباش جس نے زندگی بھر سیدھے مُنہ اُس سے بات تک نہ کی اور اُس بارے ایک لائن تک نہ لکھی کہ نہ جانے اُس کی اُلٹ کھوپڑی کیا سمجھ بیٹھے ۔مرنے کے بعد اُس کی تصویر سامنے رکھے اُس سے باتیں کرتے ہوئے اعتراف کر رہی ہے کہ اُس کی رُوح بڑی مقدّس اور معصوم تھی ۔

''گندگی میں لتھڑے جسم میں مقدّس،معصوم،حسین اور پیاری روح ۔''(86)

شاہد احمد دہلوی نے ایک جملے میں میراجی کی مکمل شخصیت کو بیان کر دیا ہے:

''اس غلیظ پیکر میں لطیف روح تھی ۔''(87)

آہ،میراجی،غلیظ پیکر ۔۔۔۔۔۔ واہ میراجی لطیف

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 39 (1,1)

حواشی

1۔ الطاف گوہر، پیش لفظ ''کلیاتِ میراجی''، مرتب ڈاکٹر جمیل جالبی، اُردو مرکز، لندن، 1988ء، ص26

2۔ قدرت اللہ شہاب، ''یومِ میراجی'' کے موقع پر صدارتی خطبہ (تاریخ ندارد)، مطبوعہ ''نقوش''، ادارہ فروغِ اُردو، لاہور، شمارہ 27، 28، نومبر دسمبر 1952ء، ص118

3۔ میراجی، ''کچھ اپنے بارے میں''، مشمولہ ''میراجی، ایک مطالعہ'' مرتب ڈاکٹر جمیل جالبی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1990ء، ص469

4۔ ایضاً، ص467

5۔ ایضاً، ص469

6۔ سحاب قزلباش، ''میرا کوئی ماضی نہیں''، فضلی سنز، کراچی، 1995ء، ص16

7۔ میراجی، ''کچھ اپنے بارے میں''، مشمولہ ''میراجی ایک مطالعہ، ص471

8۔ محمد اکرام اللہ کامی، ''میرا بھائی''، مشمولہ ''ادبی دُنیا''، لاہور، فروری 1950ء، ص102

9۔ ڈاکٹر رشید امجد، ''میراجی، شخصیت اور فن''، مغربی پاکستان اکیڈمی، لاہور، 1995ء، ص28

10۔ محمد حسن عسکری، خاکہ ''میراجی''، مشمولہ ''میراجی ایک مطالعہ''، 1990ء، ص77

11۔ اخلاق احمد دہلوی، ''پھر وہی بیاں اپنا''، مکتبہ عالیہ، لاہور، 1979ء، ص34، 35

12۔ مظہر ممتاز، ''یہ میراجی ہیں''، مشمولہ ''نقوش''، لاہور، شمارہ 14، ص26

13۔ ڈاکٹر رشید امجد، ''میراجی، شخصیت اور فن''، ص29

14۔ مظہر ممتاز، ''یہ میراجی ہیں''، مشمولہ ''نقوش''، لاہور، شمارہ 14، ص26

15۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ''نظمِ جدید کی کروٹیں''، سنگت پبلشرز، لاہور، 2018ء، ص56

16۔ ایضاً، ص56، 57

17۔ ایضاً، ص57

18۔ ڈاکٹر رشید امجد، ''میراجی، شخصیت اور فن''، ص104

19۔ ممتاز مفتی، ''پیاز کے چھلکے''، الفیصل، لاہور، 2000ء، ص135، 136

20۔ ڈاکٹر رشید امجد، ''میراجی، شخصیت اور فن''، ص105

21۔ عصمت چغتائی، ''سوکھے پتے''، مشمولہ ''چراغ روشن ہیں''، مرتب عقیل جعفری، اٹلانٹس پبلی

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 40 (1,1)

کیشنز، کراچی، 2016ء، ص96

22۔ سحاب قزلباش، ''میراجی''، مشمولہ ''میرا کوئی ماضی نہیں''، فضلی سنز، کراچی، 1995ء، ص21

23۔ عصمت چغتائی، ''سوکھے پتے''، مشمولہ ''چراغ روشن ہیں''، ص102

24۔ ڈاکٹر رشید امجد، ''میراجی، شخصیت اور فن''، ص44

25۔ سحاب قزلباش، ''میراجی''، مشمولہ ''میرا کوئی ماضی نہیں''، ص16

26۔ اخلاق احمد دہلوی، ''پھر وہی بیاں اپنا'' ص26

27۔ ڈاکٹر رشید امجد، ''میراجی، شخصیت اور فن''، ص45

28۔ تابش دہلوی، ''دید باز دید''، حیات اکیڈمی، کراچی، 1990ء، ص41

29۔ مختار صدیقی، ''اکیلا''، مشمولہ ''میراجی ایک مطالعہ''، لاہور، ص187

30۔ مظہر ممتاز، ''یہ میراجی ہیں''، مشمولہ ''نقوش'' لاہور، شمارہ 14، ص29،
ڈاکٹر رشید امجد، ''میراجی، شخصیت اور فن''، ص70

31۔ احمد بشیر، ''جو ملے تھے راستے میں''، گورا پبلشرز، لاہور، بار دوم، 1997ء، ص121

32۔ ایضاً، ص122

33۔ ایضاً، ص130

34۔ ایضاً، ص122

35۔ ایضاً، ص122

36۔ عصمت چغتائی، ''سوکھے پتے رمیراجی''، مشمولہ ''چراغ روشن ہیں''، ص93

37۔ ایضاً، ص95

38۔ ایضاً، ص102

39۔ ایضاً، ص100

40۔ سحاب قزلباش، ''میرا کوئی ماضی نہیں''، ص22

41۔ ایضاً، ص23

42۔ ایضاً، ص31

43۔ ڈاکٹر رشید امجد، ''میراجی، شخصیت اور فن''، ص48

44۔ ایضاً، ص49

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 41 (1,1)

45۔ محمود نظامی، ''میراجی''، مشمولہ ''نقوش، شخصیات نمبر''، جلد اول، ص593

46۔ شاہد احمد دہلوی، ''گنجینۂ گوہر''، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2018ء، ص147، 149

47۔ شوکت تھانوی، ''میں میراجی کو نہیں جانتا''، مشمولہ ''نقوش'' نمبر 15، 16، سالنامہ، لاہور، 1950ء، ص89

48۔ اخلاق احمد دہلوی، ''پھر وہی بیاں اپنا''، ص176

49۔ سعادت حسن منٹو، ''گنجے فرشتے''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2009ء، ص59

50۔ مختار صدیقی، ''اکیلا''، مشمولہ ''میراجی، ایک مطالعہ''، ص180

51۔ ممتاز مفتی، ''پیاز کے چھلکے''، ص132

52۔ تابش دہلوی، ''دید باز دید''، ص140

53۔ سعادت حسن منٹو، ''گنجے فرشتے''، ص65

54۔ احمد بشیر، ''جو ملے تھے راستے میں''، ص107

55۔ قدرت اللہ شہاب، صدارتی خطبہ مشمولہ ''نقوش'' لاہور، شمارہ 27، 28، نومبر، دسمبر، 1952ء، ص119

56۔ شاہد احمد دہلوی، ''گنجینۂ گوہر''، ص152

57۔ ایضاً، ص152

58۔ احمد بشیر، ''جو ملے تھے راستے میں''، ص120

59۔ سعادت حسن منٹو، ''گنجے فرشتے''، ص64

60۔ ایضاً، ص64

61۔ ایضاً، ص65

62۔ شاہد احمد دہلوی، ''گنجینۂ گوہر''، ص147

63۔ اخلاق احمد دہلوی، ''پھر وہی بیاں اپنا''، ص176

64۔ سعادت حسن منٹو، ''گنجے فرشتے''، ص66

65۔ انتظار حسین، ''علامتوں کا زوال''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2009ء، ص156

66۔ انتظار حسین، ''علامتوں کا زوال''، ص166

67۔ شاہد احمد دہلوی، ''گنجینۂ گوہر''، ص153

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 42 (1,1)

68۔ احمد بشیر، ''جو ملے تھے راستے میں''، ص124

69۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ''آوارگانِ عشق''، ادارہ، ادب وتنقید، لاہور، 1980ء، ص44

70۔ سعادت حسن منٹو، ''گنجے فرشتے''، ص64

71۔ اخلاق احمد دہلوی، ''پھر وہی بیاں اپنا''، ص28

72۔ مختار صدیقی، ''اکیلا''، مشمولہ میراجی ایک مطالعہ''، ص181

73۔ اخلاق احمد دہلوی، ''پھر وہی بیاں اپنا''، ص176

74۔ احمد بشیر، ''جو ملے تھے راستے میں''، ص127

75۔ ایضاً، ص127

76۔ اخلاق احمد دہلوی، ''پھر وہی بیاں اپنا''، ص31

77۔ ایضاً، ص30

78۔ ڈاکٹر رشید امجد، ''میراجی شخصیت اور فن''، ص93

79۔ احمد بشیر، ''جو ملے تھے راستے میں''، ص107

80۔ سعادت حسن منٹو، ''گنجے فرشتے''، ص71

81۔ اختر الایمان، ''میراجی کے آخری لمحے''، مشمولہ ''نقوش''، لاہور، شمارہ 27، 28، نومبر، دسمبر، 1952ء، ص123

82۔ مظہر ممتاز، ''یہ ہیں میراجی''، مشمولہ ''نقوش''، شمارہ نمبر 14، لاہور، ص31

83۔ اختر الایمان، ''میراجی کے آخری لمحے''، مشمولہ ''نقوش''، لاہور، ص123

84۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ''آوارگانِ عشق''، ص57

85۔ شوکت تھانوی، ''میں میراجی کو نہیں جانتا''، مشمولہ ''نقوش''، شمارہ نمبر 15، 16، سالنامہ، 1950ء، ص90

86۔ سحاب قزلباش، ''میرا کوئی ماضی نہیں''، ص24

87۔ شاہد احمد دہلوی، ''میراجی''، مشمولہ ''میراجی شخصیت اور فن''، مرتب کمار پاشی، نئی دہلی، ماڈرن بپلشنگ ہاؤس، 1981ء، ص19

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 43 (1,1)

میراجی

کچھ اپنے بارے میں

میں نسلاً کشمیری (آرین) ہوں۔ جنم بھوم کے لحاظ سے پنجابی، زبان کے لحاظ سے اُردو بولنے والا اور تخیّل و تفکّر کے لحاظ سے مشرق اور مغرب کے گُھلے ملے خطوط کا پابند۔ لیکن محمد حسن عسکری نے فہمائش کی ہے کہ اِس اظہارِ نفسی میں مجھے اپنی ادبی تخلیقات کے ترکیبی تاثرات کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ اِس لیے میرے خیال میں حالات کے اِس سرسری جائزے کو شیکسپیئر کے چار مصرعوں سے شروع کیا جا سکتا ہے جن کا مفہوم یہ ہے کہ۔۔۔۔۔۔''میں نے دو بار محبت کی ہے، راحت افزا محبت بھی اور یاس انگیز بھی، میری زندگی کا بہتر پہلو ایک جوانِ رعنا ہے اور بدتر پہلو ایک عورت ہے جو مجھے بدی کی ترغیب دیتی رہی''۔۔۔۔۔۔لیکن اِن اشعار میں بدی والے ٹکڑے سے میری زندگی کو کوئی تطابق نہیں ہے۔ اِس لیے بھی کہ مجھے کسی نے کوئی ترغیب نہیں دی (جو کچھ میری زندگی میں ہوا، میرے جبلّی تجسّس اور طبعی رُجحانات سے ہوا یا پھر محض حُسنِ اتفاق اور سہل انگاری سے) اور اِس لیے بھی کہ بدی میری نظر میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ لیکن یہ اندازِ نظر ذہنی شعور کے بعد کی بات ہے اور اِس شعور کی نشو و نما کا معاملہ طفلی سے تعلق رکھتا ہے، جب فاعلی حیثیت سے ذہن گھریلو روایات کے ماتحت حرکت کرتا ہے۔

بعض پڑھنے والے جانتے ہوں گے کہ میری نظموں کا نمایاں پہلو اُن کی جنسی حیثیت ہے اور اِس لیے بیشتر مجھے اِسی نقطۂ نظر سے گزرے ہوئے واقعات کو دیکھنا ہوگا۔

میرے زمانۂ طفلی میں ابا جان بندھیاچل سے آگے گجرات کاٹھیا واڑ کے علاقے میں ملازم تھے۔ یہ وہی علاقہ ہے جس میں کچھ عرصے کے لیے رہ کر مہارانی میرا بائی بھی اپنے گیتوں کا جادو جگا آئی تھیں۔ لیکن بچپن میں زمین کے اِس حصّے میں مجھے اِن گیتوں سے سامنا نہیں ہوا۔ ہمارے والد وہاں ایک چھوٹی لائن پر اسسٹنٹ انجینئر تھے۔ مشہور تاریخی مقام چمپانیر کے قریب

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 44 (1,1)

(ہالول) میں ہم رہا کرتے تھے، جہاں سے چار پانچ میل ہی دُور پاوا گڑھ کا پہاڑ تھا جس کی چوٹی پر کالی کا ایک مندر تھا۔ ہمارے بنگلے کے صحن سے یہ پہاڑ دِکھائی دیتا تھا۔ میرا ایک مصرع ہے: ''پربت کو اِک نیلا بھید بنایا کس نے؟ دُوری نے''۔۔۔ لیکن یہ پہاڑ کا منظر نزدیک ہوتے ہوئے بھی میرے لیے ایک نیلا بھید تھا۔ ایک ایسا راز جس کی دل کشی ذہن پر ایک گہرا نقش چھوڑتی ہو۔ اُن علاقوں میں ساون کا موسم چار ماہ تک رہتا ہے اور یوں سال کے کافی عرصے تک برسات کے دھندلکے میں پربت کا منظر ایک خاص موہنی کرتا معلوم دیتا ہے۔ پربت کی سپاٹ تصویر میں جگہ جگہ گرتے ہوئے دھارے اگرچہ سفید لکیریں سی ہوتے ہیں لیکن اُن کی نفسیاتی اور جنسی اہمیت اب آ کر مجھ پر کُھلی ہے۔ برسات کے موسم میں سانپوں کی کثرت بھی اُس مقام کی خصوصیت ہے۔ ایک بچے کے لیے سانپ کا خطرناک پہلو اتنا نمایاں نہیں ہوتا جتنا وہ اس کی دل کشی جو آدم اور حوا کی حکایت کے مطابق آغازِ عالم سے اب تک انسان کے ذہن میں ایک تخیّلی ورثے کے طور پر موجود ہے۔ یہ تو تھیں باتیں پربت کے دُھندلکے، بہتے ہوئے دھارے اور رینگتے ہوئے رنگا رنگ سانپوں کی۔ لیکن اب چلتے ہوئے انسانوں کا ایک واقعہ بھی ان میں شامل کر لیجیے۔

جب ریلوے کا انگریز انجینئر دورے پر آیا کرتا تو اکثر اُس کی تفریح کے لیے شکار کا انتظام بھی کیا جاتا۔ بڑے جو کچھ کرتے ہیں، چھوٹے بندر کی ارتقائی نسل ہونے کے لحاظ سے اُن کی نقل کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ بچپن کے کھیلوں میں ہمارا ایک کھیل شکار بھی ہوا کرتا تھا۔

ریلوے کا ڈاک بنگلہ ہمارے بنگلے سے کچھ دُور واقع تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک انجینئر دورے کے سلسلے میں آیا ہوا تھا۔ اُس کے بیٹے اور بیٹی کے ساتھ میری بہن اور میں اور ہمارے خاندانی ملازموں کے دو بیٹے اُس بنگلے کے وسیع باغ میں یونہی کھیلنے کے لیے گئے۔ ہمارے اور ساتھی ڈاک بنگلے کے چوکیدار کا بیٹا اور بیٹی جمنا بھی تھے۔ ان علاقوں میں بھیل قوم کی آبادی ہے۔ یہ زراعت پیشہ قوم چوری، ڈاکے کے علاوہ ہانکے کے شکار کے لیے بھی مشہور ہیں۔ اِس شکار میں ''مچان'' پر بیٹھا جاتا ہے اور دو چار میل دُور سے بھیلوں کا ایک دائرہ مختلف آوازوں سے

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 45 (1,1)

حیوانات کو ڈراتے ہوئے گھیر کر لاتا ہے۔ چنانچہ ڈاک بنگلے میں ہم بھی ہانکے کا شکار کھیل رہے تھے۔ کینر کے ایک پیڑ کو مچان تصوّر کیا گیا تھا۔ انجینئر کا بیٹا اور میں بھیل بن کر کچھ دُور نکل گئے تھے۔ اتنے میں ہمارے خاندانی ملازم کے بیٹے نے آ کر اطلاع دی کہ جمنا بہت بُری لڑکی ہے۔ وہ تو پیڑ پر بیٹھے ہوئے رفع حاجت کر رہی ہے۔ میں نے بھی اپنے گھر کی روایات کے مطابق تربیت یافتہ ہوتے ہوئے اِس بات کو بُرا جانا۔ لیکن اِس واقعے کی جنسی نوعیت کا ایک نقش طفلی ہی میں ذہن پر قائم ہو گیا۔ بول و براز اور اس کے متعلقہ عمل کی نفسیاتی وضاحت کا علم تو اب آ کر ہوا ہے، مگر اُس زمانے میں نہ صرف اِن باتوں میں ایک غیر شعوری نوعی دلکشی تھی بلکہ فطرت سے ہم آہنگی کا احساس بھی تھا!

پربت سے دُور سے نظر آتا ہوا کُہر ا ایک لٹکا ہوا دامن تھا جس نے نسائی پیکر سے متعلق ہو کر آئندہ زندگی میں خواہشات کے اثر سے ایک ایسی حیثیت اختیار کر لی جس سے رہائی حاصل کرنے کو شعر کا سہارا لینا پڑا۔ یوں لباس میں دلچسپی ابتدا سے ہی طبیعت کا خاصہ رہی۔

گجرات کاٹھیا واڑ میں جو لہنگے پہنے جاتے ہیں، اُن کی کیفیت راجپوتانے یا ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے لہنگوں سے مختلف ہے۔ اُس لہنگے کی ساخت سیدھی ہے، کمر سے ٹخنوں تک ایک جھول سا، ہلکی ہلکی لہروں کا ایک نازک جھرمٹ جسے دیکھ کر میری نگاہوں میں پہننے والی تو ایک لچکتی ہوئی ٹہنی بن جاتی ہے اور لباس جھیل یا دریا کی سطح جس پر ہلکی ہلکی لہریں کبھی جھوم اُٹھتی ہوں، کبھی ٹھہر جاتی ہوں۔ اس کے خلاف راجپوتانے کا لہنگا ایک سمندر کی سی کیفیت رکھتا ہے۔ ایک طوفانی شئے ہے جس میں جنگل کا گھنا۔۔۔۔۔ گرم جادو معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا پسندیدہ لباس ساڑی ہے لیکن اِس میں حرکت نظر نہیں آتی۔ اس میں ایک ٹھہراؤ ہی ٹھہراؤ ہے۔ ایک ایسا ٹھہراؤ جو کسی بگولے کی ہیئت میں محسوس ہو سکتا ہے، یعنی حرکت کے باوجود بگولے کی شکل میں جو کسی ستون کا سا تعیّن موجود ہے۔ وہی تعیّن ساڑی میں بھی دِکھائی دیتا ہے۔ ساڑی پہنے ہوئے کوئی نسائی پیکر میرے ذہن میں لٹکے ہوئے پردے یا چھائے ہوئے دُھندلکے کا تصوّر لاتا ہے ۔۔۔۔۔

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 46 (1,1)

اُوپر لباس کے متعلق جو ایک دو باتیں میں نے لکھیں، اُن کے مظاہرے مجھے اپنی نظموں میں بہت سی جگہوں پر دِکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً ''دامن کھائے جھکولے''، ''پیراہن کی سرسراہٹ آرزو انگیز ہے۔''

اور۔۔۔۔۔۔۔

''اُس کو اُٹھنا ہے، اُسے گرنا ہے''
''کوئی ملبوس ہو، کوئی پردہ''
''اور انسان بھی ملبوس، پردہ ہی تو ہے''

اور۔۔۔۔۔۔۔

''جب پھسلتے ہوئے ملبوس لرزتے ہوئے جا پہنچے تھے''
''فرش پر، ایک مسہری کے ٹھہرے پر ہوا آویزاں''

اور۔۔۔۔۔۔۔

''چند کاغذ کے یہ ٹکڑے ہیں، جنھیں موڑ کے رکھا میں نے''
''کوئی آنچل ہے، کوئی دامن ہے''

اور۔۔۔۔۔۔۔

''دامن ایک پردہ ہے جس کے اُس پار
کس کو معلوم ہے کیا بات ہے، کیا منظر ہے''

اور۔۔۔۔۔۔۔

''دُور اِک ٹیلا تھا اُس ٹیلے پہ تھے دو پیکر''
''ایک کی ساڑی زرکار کنارہ دل میں''
''سطحِ دریا پہ ستاروں کا سماں لاتا تھا''

اور۔۔۔۔۔۔۔

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 47 (1,1)

''کوئل آنچل اُڑتا بادل''

اور اِسی قسم کی اور بہت سی مثالیں مل سکتی ہی۔نسائی لباس کا یہ بیان زندگی کے ایک اور پہلو پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔یعنی عورت سے دُوری۔۔۔۔۔آسودہ عشقی۔

احساس کی قبل از وقت بے داری اسکول کے زمانے ہی میں ہوئی۔یہ وہ زمانہ تھا جب تحت الشعور میں ایک اور چھچھلتا ہوا واقعہ جمود اختیار کر چکا تھا۔ایک دفعہ جب ریلوے کی ملازمت کے سلسلے میں ملتان کے قریب ہمارا قیام تھا،ساتھ کے مکان سے اسٹیشن ماسٹر کی بیٹی کوئی سوغات کی چیز ہمارے ہاں لائی۔دائیں ہاتھ پر اُس نے تھال کو تھام رکھا تھا اور بائیں ہاتھ سے چق کو ہٹاتی ہوئی دروازے میں داخل ہوئی۔میں دروازے کے ساتھ ہی ایک آرام کرسی پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔اُس نے دہلیز سے داخل ہو کر دیکھا کہ کمرے میں کوئی نہیں،صرف میں ہوں،مجھ سے پوچھا اور میں نے اندر کی طرف اِشارہ کیا کہ گھر کے لوگ اُدھر ہیں اور وہ چلی گئی۔لیکن ایک لمحہ ٹھٹھک کر کھڑے رہنے کے دوران میری نظر نیم جنسی احساسات کے ساتھ اُس پر جمی رہی۔اُس نے ایک سفید دھوتی پہن رکھی تھی اور دس گیارہ سال کی عمر نیز شاید گھر کی بات ہونے کے خیال سے کوئی زیر جامہ نہ تھا۔چنانچہ سورج کی کرنیں لباس کے پردے میں سے چھنتے ہوئے زیریں جسم کے خطوط کا اظہار کر رہی تھیں۔

یہ چوری کا منظر بھی تحت الشعور کی پاتال سے گُھل گُھلا کر مختلف بھیس بھرتا ہوا کئی جگہ اپنی نظموں میں مجھے دِکھائی دیا ہے۔چنانچہ''روزن،کھڑکی اور دروازے''کی میں یہی وجہ سمجھتا ہوں۔

والد کی ملازمت کے سلسلے میں چند ماہ بلوچستان کے کہستانی ماحول میں بھی گزرے ہیں۔لیکن یہاں کے مناظر میں وہ گہری اور گھنیری کیفیت نہیں محسوس ہوئی جو ہندوستان کے ایسے گرم مرطوب خِطّۂ زمین میں ہو سکتی ہے۔زندگی کی بدلتی ہوئی کیفیتیں مجھ کو سندھ کے مختلف مقامات میں بھی لے گئی ہیں،لیکن یہاں صرف دو جگہیں قابل ذکر معلوم ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ایک سکھر میں دریائے سندھ کا منظر،جس کے کنارے پر کچھ عرصہ بیٹھے رہنے کے بعد بعض دفعہ دریا کی ہستی ایک لیٹے ہوئے عفریت کی مانند محسوس ہوتی تھی۔ایک ایسا عفریت جس میں ہیبت بھی ہو اور دلکشی بھی۔دوسرا ماحول کراچی

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 48 (1,1)

سے سینتیس میل دُور دابے جی کا مقام ایک پھیلا ہوا اُونچا نیچا سبزے سے معرّا میدان۔ کہیں کہیں خشک جھاڑیاں یا خشک پست قد پیڑ، ایک طرف سامنے چار میل کے فاصلے پر سمندر کے ساحل کی دُھندلی لکیر اور یہیں ساحل پر شمالی ہند کے مشہور عاشق پُنوں کی محبوبہ سسّی کا باغ۔ معلوم نہیں یہ باغ محض روایت ہے یا حقیقت اور اِس ماحول میں ہمیشہ سمندر کی طرف سے آتی ہوئی تُند ہوائیں۔ یہاں سے میرے ذہن پر صرف اُداسی، بیزاری اور ویرانی ہی کے نقش ہوئے۔ کیونکہ اوّلاً یہاں رہنا میری مرضی کے خلاف، دوسرے شہری زندگی کی یہاں کوئی بات نہیں تھی اور بنگلے کے پاس سے گزرتی ہوئی مسافر گاڑیوں کی کھڑکیوں سے جھانکتے ہوئے چہرے ہی ایک تسکین کا سامان تھے۔

اس کے بعد لاہور کی باتیں ہیں۔ لاہور میں مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ۔۔۔۔ تینوں لحاظ سے زندگی میں وسعت پیدا ہوئی۔ مشاہدے اور تجربے پہلے شروع ہوئے اور مطالعہ بعد میں۔

یہیں مخلوط تعلیم کی کمی نے میرے ذہن کو اُس رستے کی طرف مائل کیا جس کا ذکر اس سوانحی جائزے کے شروع میں ہے۔ لیکن افسوس کہ یہ سفر محض ایک روحانی تجربہ بن کر ہی رہ گیا۔ البتہ اِس نے اُس گہرے تجربے کے لیے زمین تیار کر دی جس نے زندگی میں نہ صرف ایک مقصد پیدا کر دیا بلکہ انسانی علم کے لحاظ سے بھی میری معلومات میں اضافہ کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ دوسرا تجربہ جنس مخالف سے تعلق رکھتا ہے۔ مغرب میں شاید شیکسپیئر کی بات سچ ہو کہ ''عورت تیرا نام کمزوری ہے'' لیکن مشرق کے خصوصاً ہندوستانی نوجوانوں کے موجودہ حالات دیکھتے ہوئے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ ''عورت تیرا نام صدمہ ہے۔''

یہی حال مادی لحاظ سے اِس تجربے کا تھا۔ اِس سلسلے میں بچپن ہی سے دُور کی چیزوں (پربت، دُھندلکا) سے جو رغبت لاشعور میں جاگزیں ہو چکی تھی، اُس نے اپنا کرشمہ دِکھایا اور اپنی حماقتوں اور آدرشی جبلّت کی وجہ سے زندگی کا یہ پہلو یکسر تشنۂ تکمیل رہا۔ البتہ ذہنی نشوونما پر اُس نے جو اثر چھوڑا اُس کی بہت سی علامتیں مجھے اپنی نظموں میں دِکھائی دیتی ہیں۔ اِس پہلو سے متعلق میں تفصیل سے فی الحال گریز چاہتا ہوں اِس لیے اور کوئی بات نہیں کہتا۔

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 49 (1,1)

مشاہدے کے لحاظ سے اگر چہ بحیثیتِ مجموعی زندگی کے ہر پہلو کی طرف میرے تجسس نے مجھے راغب کیا، لیکن موجودہ صدی کی بین الاقوامی کشمکش (سیاسی، سماجی اور اقتصادی) نے جو انتشار نوجوانوں میں پیدا کر دیا ہے وہ بالخصوص میرا مرکزِ نظر رہا اور آگے چل کر جدید نفسیات نے اُس تمام پریشان خیالی کو جنسی رنگ دے دیا۔ مطالعے کے لحاظ سے اس زمانے میں نہ صرف مغربی، انگریزی اور فرانسیسی ادب نے میری رہنمائی کی بلکہ مغربی تفکّر اور سائنس نے بھی اپنا اپنا اثر کیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مشرقی روایات اور صدیوں کے اثاثے سے بیگانگی رہی۔ ویشنو خیالات نے نہ صرف مذہبی لحاظ سے اپنا نقش چھوڑا بلکہ اُس کی ادبی روایات بھی کچھ اِس انداز سے بروئے کار آئیں کہ دل و دماغ ایک جیتا جاگتا برندابن بن کر رہ گیا۔ سرسری طور پر میں کہہ سکتا ہوں کہ مشرق سے مہارانی میرا بائی، چنڈی داس اور امرو نے مجھ پر اثر کیا اور مغرب سے والٹ وٹمن، ڈی ایچ لارنس، شیفانے، میلارے اور چارلس باؤلیئر نے، مفکرین میں سے چارلس ڈارون، سگمنڈ فرائڈ، سر جیمز جینیز، آئن سٹائن (جن کے نظریے کو میں نہیں سمجھ سکتا)، ہیولاک ایلس اور رابندر ناتھ ٹیگور قابلِ ذکر ہیں۔ اُردو شعراء کی فہرست یہ ہے: امیر خسرو، سید انشاء اللہ، میر تقی میر، غالب، حفیظ جالندھری، عبدالرحمٰن بجنوری، مولوی عظمت اللہ اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر۔

بہت سی باتیں ایسی ہیں جو اِس سرسری جائزے میں نہیں آسکیں لیکن اُن کے لیے کسی اور وقت کو معیّن سمجھنا چاہیے۔ آج کل میں ماہنامہ ''ادبی دُنیا'' میں نائب مدیر کے فرائض انجام دے رہا ہوں (گزشتہ تین سال سے) اور یہ تعلق گزراوقات کے علاوہ اِس لیے بھی پسندیدہ ہے کہ مجھے اُردو کی جدید شاعری خصوصاً آزاد نظم سے دلچسپی ہے۔

(مشمولہ ''میراجی ایک مطالعہ'')

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 50 (1,1)

اکرام اللہ کامیؔ

میرا بھائی

میں اُس آدمی کی بابت لکھ رہا ہوں جو آج ہم میں نہیں ہے۔ دُنیا میرا جی کا نام جانتی ہے لیکن میرا ذہن ماضی کے دُھندلکوں میں اُبھرتے ہوئے خاکے دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ چھوٹی چھوٹی بے ربط باتیں، بے معنی کام۔ یہ ۳۰ برس پہلے کی بات ہے۔ اُن کی عمر سات سال اور میری تقریباً تین سال کی تھی۔ میں ثناء بھائی کے ساتھ (میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، میرا جی کو ثناء بھائی کہا کرتا تھا) ہالول کے قصبے میں جو چمپانیر کے قریب ہے ایک گجرات اسکول میں جاتا تھا۔ چار بجے، مستقبل سے بے خبر، جس کی اُنھیں چنداں پروا بھی نہیں تھی۔ ثناء بھائی، بہن جو مجھ سے بڑی ہیں، میں اور مولانا رشید۔ رشید ہمارے ماموں کے لڑکے ہیں۔ ثناء بھائی مجھے کامی اور اُنھیں مولانا رشید کہا کرتے تھے۔ بہن کو عزیزؔ کے نام سے پکارتے تھے۔ اُس وقت سے ہی ثناء بھائی کی حیثیت ہم میں ایک لیڈر کی ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ جتنی باتیں ہم لوگ کرتے تھے، وہ اُنھیں کی تجویزوں کے مطابق ہوا کرتی تھیں۔ وہ ہم سب میں بڑے تھے۔ اِس لیے ہم اُن کی بات مانتے تھے۔ میری طبعیت شروع ہی سے ذرا تیز ہے۔ اِس لیے جب کبھی غصّہ آتا تو رشید کو ساتھ لے کر ثناء بھائی کے خلاف بغاوت کی جاتی جس کا موقعہ کھیلوں میں اکثر مل جاتا تھا۔ اسکول بہت دُور تھا۔ راستے میں وقت کافی ملتا اِس لیے ہمارے دماغ اکثر بے ضرر شرارتوں کی طرف رجوع کرتے تھے، جن میں زیادہ حصّہ میرا اور رشید کا ہوتا تھا۔ ثناء بھائی زیادہ تر سنجیدگی ہی سے کام لیتے تھے۔ گھر سے اسکول تک تین چیزیں ہماری توجہ کا زیادہ مرکز رہتیں۔ جب ہم گھر سے روانہ ہوتے تو ایک برساتی نالہ ہمارا ساتھ دیتا جو خشک رہتا تھا۔ لیکن برسات کے موسم میں اُس کی طغیانی خاصی تباہ کُن بن جاتی تھی۔ یہ ہالول ریلوے اسٹیشن سے ایک طرف رہ جاتا تھا۔ ریلوے اسٹیشن بھی دلچسپ

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 51 (1,1)

جگہ تھی۔ اور کیوں نہ ہوتی ؟ جب کہ اس کا چھوٹا سا گودام مونگ پھلی کی بوریوں سے بھرا رہتا تھا۔ اسکول سے واپسی پر ہم یہاں بوریوں میں سے مونگ پھلیاں نکال کر کھایا کرتے تھے۔ ایک بار میں بوریوں کے درمیان ایسا پھنسا کہ نکلنا دُشوار ہوگیا۔ چنانچہ ثناء بھائی اور رشید نے بہن کا دوپٹہ لے کر نیچے لٹکایا کہ پکڑ کر اُوپر آجاؤ۔ مگر چھٹکارا تب ہی ملا جب نوکر جو گھر سے بھیجا گیا تھا ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچا۔ بوریوں میں سے مونگ پھلیاں نکال کر کھانا ہمارا من بھاتا شغل تھا۔ اس کے بعد ایک بہت بڑا تالاب آتا تھا، جس کی وسعت اور گہرائی کے خیال سے ہم سب دُور ہی رہا کرتے تھے۔ دن کا زیادہ حصّہ آنے جانے میں صرف ہو جاتا تھا۔ باقی کھیلوں میں۔ کھیلوں میں ایک لڑکی جمنا بھی شامل ہوا کرتی تھی۔ وہ اُن دِنوں کافی بڑی تھی۔ ہمارے بنگلے کے پچھواڑے ہی ڈھاک کا جنگل شروع ہو جاتا تھا جہاں ہم ہانکے کے شکار کا کھیل کھیلا کرتے تھے۔ ہانکے کا شکار ایسے کھیلا جاتا ہے کہ کچھ آدمی شکار گھیر کر شکاریوں کی طرف لاتے ہیں، جو اُونچے درختوں پر مچانوں میں بیٹھتے ہیں۔ درختوں پر اِس لیے بیٹھنا پڑتا ہے کہ ہانکنے میں ہر قسم کا جانور آسکتا ہے، ایک گیدڑ سے شیر تک۔ چنانچہ ثناء بھائی ہمیشہ شکاری، میں شیر اور رشید ہانکنے کے لیے بھیل بنا کرتے تھے۔ ثناء بھائی املتاس کی پھلی لے کر جو دو اڑھائی فٹ لمبی ہوتی ہے، درخت پر جا بیٹھتے اور اگر شکاری زیادہ دلیری دکھاتا تو نیچے ہی گزارہ ہو جاتا تھا۔ پھر بھیل ہانکتا، شیر نکلتا، پھلی کی بندوق چلتی اور شیر مر جاتا۔ ایک دفعہ میں اَڑ گیا کہ یہ کیا مطلب ہے کہ ثناء بھائی ہر باری شکاری بنتے ہیں اور مجھے شیر بن کر مرنا پڑتا ہے۔ اب کی دفعہ میں شکاری بنوں گا، اور ثناء بھائی شیر بنیں۔ کھیل شروع ہوا۔ ثناء بھائی شیر بن کر ہاتھوں اور پیروں پر چلتے ہوئے نکلے اور شکاری نے پھلی کی بندوق چلانے کی بجائے لاٹھی چلائی۔ ثناء بھائی کمر پکڑ کر بلبلانے لگے۔ اِسی طرح بچپن کی باتوں کے ساتھ ساتھ وقت گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ ابا جان کی تبدیلی بلوچستان ہوگئی۔ اور ہم گجرات کاٹھیاواڑ جنگل درخت اور سبزے کا علاقہ چھوڑ کر کوہستانی سرزمین میں پہنچ گئے۔

اب ہم بوستان میں رہنے لگے۔ یہاں بھی ثناء بھائی سکول میں پڑھتے رہے اور

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 52 (1,1)

میں اُن کے ساتھ برائے نام جاتا رہا۔ ثناء بھائی اکثر ہمیں لے کر پہاڑیوں کی چوٹیوں پر پہنچتے اور پھر انھی گہری پیچ دار پگڈنڈیوں میں بیٹھ کر پھسلتے ہوئے نیچے آجاتے۔ یہ کھیل بار بار کھیلا جاتا، گو کہ امّاں یہ کھیل کھیلنے سے ہمیشہ روکتی تھیں۔ پہاڑ کے دوسری طرف ایک ندی تھی وہاں بھی ہم اکثر جاتے تھے اور بہتے ہوئے پانی کے کنارے کنارے یا ایسی جگہوں پر جہاں پانی کم ہوتا تھا، گول گول پتھروں میں ہمارے کھیل ہوا کرتے تھے۔ اُن دِنوں گاہے گاہے قبائلی لوگوں کے حملے ہوا کرتے تھے، جو اطلاع دے کر آتے۔ اِس لیے اچھا خاصا ہنگامہ ہو جاتا تھا۔ گھر میں اُس وقت ثناء بھی ابا جان کے علاوہ سب سے بڑے تھے۔ چنانچہ امّاں اور گھر کے لوگوں کو تسلی وغیرہ دیتے تھے۔

کچھ عرصے کے بعد ہم سکھر آ گئے۔ چونکہ ابا جان کا کام یہیں تھا، اِس لیے یہیں رہنے لگے۔ ریلوے پنجابی سکول سکھر میں جس کے ابا جان سیکرٹری تھے، ہم داخل ہوئے۔ یہاں مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ ثناء بھائی نظمیں لکھتے ہیں۔ اگرچہ مضامین لکھنے کا سلسلہ اس سے بہت پہلے کا تھا۔ ثناء بھائی اُن دِنوں چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے۔ اُنھیں کتابوں کا بہت شوق تھا۔ اُن کے پاس جب بھی پیسے ہوتے وہ کتابیں خریدتے۔ یہاں تک کہ تھوڑے ہی عرصے میں ثناء بھائی کی لائبریری میں چار پانچ سو کے قریب کتابیں اکٹھی ہو گئیں۔ جس کی اُنھوں نے باقاعدہ فہرست مرتب کر رکھی تھی۔ لائبریری میں ہر قسم کی کتابیں تھیں لیکن اُنھیں زیادہ شوق نظموں کی کتابوں کا تھا چنانچہ ایک بار جب عید کے موقع پر ہمیں عیدی ملی تو ثناء بھائی نے مجھ سے پوچھا، تم پیسوں کا کیا کرو گے؟ میں نے کہا خرچ کروں گا۔ کہنے لگے کیوں نہ کتابیں خریدی جائیں۔ میں رضامند ہو گیا۔ وہ دارالاشاعت پنجاب لاہور کی ایک فہرست نکال لائے اور کہا کہ تم کتاب پسند کر لو۔ میں نے ایک کتاب چُنی جس میں کسی سوداگر اور جن کا قصہ تھا۔ ثناء بھائی کہنے لگے اِس کی بجائے یہ خریدو۔ اِس میں بہت اچھی نظمیں ہیں، میں نہ مانا اور ثناء بھائی نے وہ کتاب خرید لی۔ سکول کی پڑھائی کی بہ نسبت وہ اپنے شوق کی طرف زیادہ توجہ کیا کرتے تھے۔ مجھے یہ بات خاص طور سے اِس لیے یاد ہے کہ اُن کے لیے ایک اُستاد گھر پر پڑھانے کے لیے رکھا گیا تھا، جس سے مجھے بھی پڑھنا پڑتا

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 53 (1,1)

تھا۔ثناء بھائی اپنے شوق کی کتابوں کا مطالعہ بہت زیادہ کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ کھیلوں میں بھی کم حصہ لیتے۔سوائے اِس کے کہ کبھی کرکٹ کھیل لی جاتی یا پھر ہائی۔ ہائی کھیلنے کے لیے اُنھوں نے کھجور کی سوکھی ہوئی شاخیں جو آگے کی طرف سے گول سی ہوتی ہیں، بہت سی اکٹھی کر رکھی تھیں۔ بال ٹینس کے استعمال کیے جاتے تھے۔سکول کے ڈراموں میں پارٹ بھی لیتے تھے۔ اور اِس سلسلے میں اُنھوں نے سکھر سکول کے سالانہ جلسے میں انعام بھی حاصل کیا تھا۔اُنھیں گانے کا بھی شوق تھا۔اور بچپن میں بہت اچھا گایا کرتے تھے۔ایک ادبی مجلس بھی بنی ہوئی تھی جس کے وہ سیکرٹری تھے،اور بہت سرگرمی سے کام کرتے تھے۔اُن دِنوں وہ سامری تخلص کیا کرتے تھے۔

کچھ عرصہ ہم نے جیکب آباد میں بھی بسر کیا تھا۔ یہاں ثناء بھائی اور میں ایک سندھی سکول میں پڑھا کرتے تھے۔جیکب آباد اسٹیشن کے شیڈ کی پچھلی طرف بہت بڑے بڑے تالاب تھے جہاں ثناء بھائی ہم کو لے جاتے۔ان کے کنارے اونچے اونچے سرکنڈے اُگے ہوئے تھے۔ تالاب کے کنارے سیپ گھونگے بہت ملتے تھے اور ہم یہی اکٹھے کرنے جاتے تھے۔

اِسی طرح کبھی کہیں اور کبھی کہیں ثناء بھائی سے ساتھ رہا۔جب میں لاہور سے آٹھویں جماعت کو چھوڑ کر ابا جان کے پاس ڈابھے جی پہنچا تو ثناء بھائی وہیں تھے۔اُن کا کمرہ علیحدہ تھا۔ اِس کمرے میں چاروں طرف کتابیں، رسالے، اخبارات ہر قسم کے اُردو اور انگریزی۔اور انگریزی رسالوں میں سے ورق پھاڑ پھاڑ کر تصویریں انبار در انبار نظر آتی تھیں۔اِس قدر اکٹھے کاغذات سے مجھے اور گھر والوں کو بعض وقت کوفت ہونے لگتی تھی۔ڈابھے جی کی رہائش شاید ثناء بھائی کو پسند نہ تھی۔ کیونکہ اُنھوں نے چُھپ کر یہاں سے لاہور چلے جانے کی کوشش بھی کی لیکن پکڑے گئے۔بعد میں ابا جان اور اماں کی اجازت سے چلے آئے۔لاہور، یہ وہ جگہ ہے جہاں ایک چھوٹی سی بات سے ثناء بھائی کی زندگی میں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہوگیا۔یہ واقعہ یونیورسٹی گراؤنڈ کا ہے۔ یہاں ہر سال بنگالیوں کی سالانہ کھیلیں ہوا کرتی تھیں۔ایک سال اسی موقعہ پر ثناء بھائی اور سلیم سوز گراؤنڈ میں بیٹھے تھے۔ثناء شاید اُن دِنوں دسویں میں ہوا کرتے تھے اور سلیم گورنمنٹ کالج لاہور میں۔اُن

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 54 (1,1)

کی شعر و شاعری کے سلسلے میں اکثر یہاں نشست ہوا کرتی تھی۔ کھیلوں کے دن بھی یہ وہیں تھے کہ اچانک دو بنگالی لڑکیاں ان کے قریب سے گزر گئیں۔ دونوں نے اُنھیں دیکھا اور پھر ہونی ہوئی اور ثناء بھائی میرآجی بن گئے اور سلیم، سوزؔ۔ ان بنگالی لڑکیوں کے نام میرا سین اور پروتما گپتا تھے۔ میرا سین سر شادی لال کی کوٹھی کے سامنے اونچے بخارچے والے مکان میں رہتی تھی۔ یہاں ثناء بھائی اکثر آتے۔ دُور سے رنگ دار ساڑھیوں کو لٹکا ہوا دیکھتے اور شعر کہتے۔ میرا سین ایف سی کالج میں پڑھتی تھی جو وائی ایم سی اے کے قریب ہوا کرتا تھا۔ میرآجی گھر سے کالج اور کالج سے گھر ان گنت بار میرآ سے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر اُس کا پیچھا کرتے اور یہ فاصلہ اُن کی زندگی میں صرف دو بار ٹوٹا۔ ایک اُس وقت جب کہ وہ راستے میں جا رہی تھی، میرآجی جلدی سے بڑھے اور کہا مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ اُس نے دیکھا اور پھر تیزی سے چلی گئی۔ اور دوسری دفعہ اُس وقت جب اُنھوں نے اُسے ایک خط دیا۔ صاف کاغذ جس پر صرف میرآ لکھا تھا۔ اُس نے لے کر پڑھا اور چل دی۔ اُنھی دِنوں میرا جی نے دسویں کا امتحان دیا، اور ہر پرچے میں صرف اپنا رول نمبر لکھ کر چلے آتے رہے۔ شاید یہ بھی میرآ کے لیے خط تھے جن پر سوائے میرآ کے اور کچھ لکھا نہ جا سکتا تھا۔ اس کے بعد میرآجی سنبھالے نہ سنبھل سکے۔ اُن کی ہر بات بدل گئی۔ گویا اُنھوں نے ایک نیا جنم لیا ہے۔

ابا جان کی ریٹائرمنٹ کے بعد ہم نے مستقل طور سے لاہور ہی رہنا شروع کر دیا۔ کچھ عرصے کے بعد میرا جی نے حلقۂ اربابِ ذوق میں بہت زیادہ دلچسپی لینا شروع کی۔ جس کی سب کمیٹیوں کی اکثر نشستیں بقول اُن کے منشی مہتاب الدین کے مکان کی بیٹھک میں ہوا کرتی تھیں۔ میں چونکہ خاموش تماشائی کی حیثیت سے شامل ہوتا تھا، اس لیے آج مجھے بہت سے شناسا چہرے یہاں نظر آتے ہیں۔

جب مجھے وائلن بجانے کا شوق ہوا اُن دِنوں میرا جی ادبی دُنیا میں ابا جان کی مرضی کے خلاف کام کر رہے تھے۔ اُنھوں نے مجھے اکثر لائبریری سے راگ کے متعلق کتابیں لا کر

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 55 (1,1)

دیں۔اب میراجی کا معمول کچھ ایسے ہوا کرتا تھا۔وہ بیٹھک ہی میں سویا کرتے تھے۔صبح دس بجے کے قریب اُٹھتے، چائے کے لیے تیار ہوتے۔ چائے ہمیشہ گلاس گلاس میں پیتے تھے۔کھانڈ بہت زیادہ استعمال کرتے تھے۔کم ازکم دو بڑے چمچے ایک گلاس میں اور ساتھ پراٹھے۔اور اکثر کہا کرتے تھے کہ زندگی بڑھانی چاہتے ہو تو صبح چائے کے ساتھ پراٹھے کھاؤ۔اُس کے بعد شام سے پہلے ایک مرتبہ آتے اور پھر گھر سے نکل جاتے۔کتابوں کا اچھا خاصا بستہ اُن کی بغل میں رہا کرتا تھا۔ یونیورسٹی گراؤنڈ بہت جا کر بیٹھا کرتے تھے۔ پرانی انارکلی میں نائی کی ایک دُکان ہوا کرتی تھی۔ نائی کا نام نشچے رکھا ہوا تھا۔وہاں بھی اکثر جاتے تھے۔رات کو پڑھتے تھے۔کبھی دو بج جاتے، کبھی تین اور کبھی صبح ہی ہو جاتی اور پھر دن کا وہی معمول۔

میراؔ جی جب دہلی ریڈیو اسٹیشن پر ملازم تھے، میں دہلی گیا تو کہنے لگے، وائلن نہیں لائے، تمھارا پروگرام کراتے۔ میں نے کہا چلیے ریڈیو اسٹیشن ہی دکھلائیے۔ دوسرے دن آنے کے لیے کہا۔ چنانچہ میں اور سیٹھ صاحب، یہ مولانا رشید کے چھوٹے بھائی ہیں اور ان سے میراؔ جی کا حساب ہوا کرتا تھا۔ پیسوں کے لین دین کا۔ ہم دونوں ریڈیو اسٹیشن گئے۔اُن کی معیت میں سٹوڈیوز پھر کے دیکھے۔ جب ہم لوٹنے لگے تو کہنے لگے، وہ سامنے دُکانیں ہیں۔ یہاں کھانے پینے کی چیزیں ہوتی ہیں۔تم بھی کچھ کھالو اور کھانا نہیں تو پی لو۔لیکن ہم نے کہا کہ ہم چلتے ہیں۔اچانک کہنے لگے، وہ آدمی جو جا رہا ہے جانتے ہو کون ہے؟ دُور ایک آدمی جا رہا تھا۔ہم نے کہا معلوم نہیں۔کہنے لگے یہ میاں مٹھو ہے۔بہت بڑا آرٹسٹ ہے Genius اور پھر ہم گھر لوٹ آئے۔

جب میں دِلّی سے واپس آنے لگا تو اسٹیشن پر چھوڑنے آئے اور رخصت سے پہلے کہا، دیکھو کوئی شخص میرے بارے میں کبھی کوئی بات دریافت کرے تو ہمیشہ سچ کہنا۔ اِس پر میں نے آج تک سختی سے عمل کیا ہے۔ دِلّی میں ایک بار امّاں اور بہن نے میراؔ جی کو شادی کے لیے کہا تو فلسفیانہ انداز میں جواب دیا کہ لوگ شادی کرتے ہیں، اولاد پیدا کرتے ہیں، نام چلتا ہے لیکن یہ

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 56 (1,1)

چیزیں مٹ جاتی ہیں۔ میری شادی شاعری سے ہوئی ہے۔ یہ اشعار میرے بچے ہیں جو ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

۱۹۴۳ء میں جب کہ میں لاہور ہی میں تھا، وہ دہلی سے پندرہ بیس دن کے لیے آئے۔ ایک رات جب کہ میں سیکنڈ شو سینما دیکھ کر آیا تو بیٹھک میں سے گزرا اور میں نے دیکھا کہ میراجی پلنگ پر بیٹھے ہیں اور دو آدمی لالہ جی اور نواب صاحب بھی تشریف رکھتے ہیں۔ اُن کے نام بشیر احمد اور دین محمد ہیں۔ میراجی یہی کہا کرتے تھے۔ ایک نظر میں معاملہ بھانپا اور کوٹھے پر سونے چلا گیا۔ ابھی تھوڑی سی دیر ہی ہوئی تھی کہ آواز آئی، کامی، میں نے سوچا کہ اب نیچے جانا پڑے گا۔ چنانچہ اُسی طرح نیچے چلا آیا۔ میں لنگوٹ باندھ کر سویا کرتا ہوں۔ اس وقت تولیہ کاندھے پر رکھ لیا۔ میراجی نے دیکھا تو کہا، لو شو مہاراج تشریف لے آئے ہیں۔ میں نے کہا کیا بات ہے؟ کہنے لگے یہ لوگ تمھارا وائلن سُننا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا اچھی بات، کیا سُنیئے گا؟ کہنے لگے پہلے اِنھیں سُنا دو۔ میں تو اپنی چیز بعد میں سُنوں گا۔ پہلے میں نے دو راگ اُنھیں سُنائے۔ پھر کہا کہ اب؟ آواز آئی کہ جے جے ونتی۔ میں نے جے جے ونتی کا الاپ شروع کیا۔ ہلکی لَے اور دھیمے سُروں میں۔ میں بجا رہا تھا، میرا جی سُن سُن کر مدہوش ہوئے جا رہے تھے۔ اس سے پہلے میں نے اُن کی یہ حالت نہیں دیکھی تھی۔ راگ کی تیزی کے ساتھ اُن کا جنون بھی شدت اختیار کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ جس پلنگ پر وہ بیٹھے ہوئے تھے، اُس کے ٹھہرے کے ساتھ سر مارنا شروع کر دیا۔ میں نے ساز یک لخت بند کر دیا۔ نغمہ خاموش ہو گیا۔ راگ کا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ اچانک اُنھوں نے کہا، خدا تمھاری اُنگلیوں میں برکت دے۔ میں نے یہ فقرہ کچھ ایسے سُنا جیسے کوئی ساؤ ھو کسی کو دُعا دیتا ہے۔ اس کے بعد جب تک میراجی لاہور رہے، میں نے وائلن گھر پر رکھنا چھوڑ دی۔ اگرچہ کئی بار اُنھوں نے کہا، میں ٹال گیا۔ کیونکہ اُس رات کے واقعات کا اعادہ کرنا نہ چاہتا تھا۔

میراجی سے ایک بار میرا جھگڑا بھی ہو گیا تھا۔ اور یہ آخری تھا۔ بات دراصل یوں ہوئی کہ میں بہن سے جھگڑ پڑا۔ اِس پر میراجی چڑ گئے۔ چنانچہ آپ نہایت غصّے میں مجھے مارنے کے لیے

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 57 (1,1)

آئے۔ اُنھوں نے ہاتھ میں لوہے کا ایک ڈنڈا سا پکڑ لیا۔ یہ دیکھ کر میں نے کلہاڑی تھامی جو میرے قریب پڑی تھی۔ میرآجی نے ڈنڈا رکھ دیا۔ میں نے کلہاڑی رکھ دی۔ پھر میرآجی میری جانب بڑھے اور بے تحاشہ مُکّے مارنا شروع کر دیے۔ کُچھ دیر میں اپنے آپ کو بچاتا رہا۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ وہ باز نہیں آئیں گے، سر اُن کے آگے کر دیا۔ جب دل بھر گیا تو اپنے دالان میں جا کر پان بنانا شروع کر دیے۔ میں گھر سے امّاں کو بتانے کے لیے نکلا تو کہنے لگے، نکل جا میرے گھر سے۔ میں نے کہا، گھر آپ کا نہیں ہے، ابا جان کا ہے۔ شاید یہی بات تھی کہ وہ اکثر بعد میں منشی مہتاب الدین کا مکان کہنے پر اصرار کیا کرتے تھے۔ امّاں اُس وقت ماموں کے یہاں تھیں۔ میں نے جا کر بتایا۔ امّاں گھر آئیں اور میرآجی پر ناراض ہوئیں۔ امّاں کے جانے کے بعد میرآجی میرے پاس آئے اور کہا، دیکھو ابا جان کو یہ بات معلوم نہ ہو۔ اُنھیں رنج ہوگا۔ اور میرے آنسو نہ تھمتے تھے۔ اُنھوں نے رومال دیا جس پر کتھے کے داغ لگے ہوئے تھے کہ آنسو پونچھ لو۔ اور تھوڑی دیر کے بعد میں نے بینجو بجانا شروع کر دیا، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ جب تک میرآجی کا ساتھ رہا، اُن کا دم میرے لیے غنیمت تھا۔ کیونکہ آج میری زندگی اُن کا عکس بن کر رہ گئی ہے۔ ویسے تو میرآجی کا سلوک ہم سب گھر کے لوگوں سے انتہائی محبت آمیز تھا لیکن اُن کے لیے سب سے زیادہ ماں، پھر بہن اور آخر میں کا کا خصوصیت لیے رہے۔

میرآجی پہلے ہی ہم سے دُور چلے گئے تھے، اور اب وہ بہت ہی دُور ہیں لیکن اب میں اپنے آپ کو اُن سے زیادہ قریب سمجھتا ہوں۔

(ادبی دُنیا، فروری 1950ء)

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 58 (1,1)

احمد بشیر

اکیلا

اور جب وہ جانے لگا تو لوگ اکٹھے ہو گئے۔ وہ حیرانی سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بچوں کو اپنے گیند بلے بھول گئے۔ عورتوں کو گھونگھٹ نکالنا یاد نہ رہا۔ مرد پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگے۔۔۔۔۔۔ عرصہ دراز تک وہ کوورلاج میں رہا تھا لیکن کسی نے اُسے سمجھا ہی نہ تھا۔ اُسے جانا ہی نہ تھا۔

اور اب وہ سب چلّا رہے تھے: ''تم جا رہے ہو، کیوں جا رہے ہو تم؟ کس طرح جا سکو گے تم؟'' اور وہ یوں کھڑا تھا جیسے رام بن باس کو جا رہے ہوں۔ لیکن اُس کے نچلے ہونٹ پر مسرت کی ایک دبی ہوئی کرن سی لرز رہی تھی جیسے وہ چوری چوری لذّت لے رہا ہو۔۔ لوگ چیخ رہے تھے۔ لیکن جب وہ جانے لگا تو اُس نے مُڑ کر بھی نہ دیکھا۔

میرا جی ایک بھٹکا ہوا راہی تھا۔ عمر بھر وہ اپنی انا کی اوگھٹ گھاٹیوں میں سنگلاخ پگڈنڈیوں کی خاک چھانتا رہا۔ اُس کی کوئی منزل نہ تھی۔ اُس کو صرف چلتے رہنے سے کام تھا۔ اُس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ اُس کے پیر سُوجے ہوئے تھے۔ تلووں سے خون رِستا تھا۔ مگر وہ صحرائی بگولے کی طرح جنگل جنگل پھرتا رہا۔ اُس نے کسی سے راستہ نہ پوچھا۔ اُس نے کبھی پیچھے مُڑ کر بھی نہ دیکھا۔ کیونکہ اُس کی کسی سے جان پہچان نہ تھی۔ بغلوں میں ہاتھ دبائے، سر جھکائے ان دیکھی ان سُنی پراسرار گھاٹیوں میں گھومتے گھومتے ایک دن وہ ایک سُونی پگڈنڈی پر گر کے مر گیا۔ اُس کو زندگی سے جو کچھ لینا تھا، لے چکا تھا۔ زندگی اُس کے لیے اب بے لذّت شے ہو چکی تھی۔ اب جینا بیکار ہو چکا تھا۔ اُس کی ہتھیلی سے تیسرا گولا غائب ہو چکا تھا۔ اُس کی مُٹھی کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 59 (1,1)

میں نے میراجی کے ساتھ کچھ عرصہ گزارا ہے، لیکن میں نے اُس کی زندگی میں شرکت نہیں کی، کیونکہ اُس کی زندگی اُس کی اپنی اَنا سے اِس قدر لدی ہوئی تھی کہ اُس میں کسی کی شرکت کی گنجائش ہی نہ تھی۔ یوں ہی زندگی کے ایک موڑ پر میری اُس سے ملاقات ہوگئی۔ تھوڑی دُور ہم دونوں ساتھ چلے، پھر وہ یک لخت ایک طرف کو ہولیا۔ راستے میں اُس نے میرے ساتھ باتیں کی تھیں۔ میرے مسائل پر دھیان دیا تھا، مجھے مشورے بھی دیے تھے۔ لیکن وہ میرا رفیق نہیں بنا تھا۔ وہ اپنے آپ میں گُم رہا۔ اُس کو صرف اپنا خیال تھا۔ اپنی ذات کے سوا اُسے کوئی غم نہیں تھا۔ اپنی انا اُس کے شانوں پر جزیرے کے بوڑھے کی طرح سوار تھی۔ اُس کو صرف اپنے عیش، اپنی لذّت اور اپنی آسودگی کا فکر تھا۔

میراجی لذّت کا غلام تھا۔ وہ جو انانیت سے حاصل ہوتی ہے۔ اُس نے اپنے شبستانِ عیش کے دروازے صرف اپنی ذات پر ہی کھولے تھے اور کسی کو اس میں جھانکنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ دُنیا کے جھمیلوں سے بے نیاز اپنی ذات میں چھپ کے چوری چوری لذّت لیتا رہا۔ اُس نے ساری زندگی اپنی ذات کی بندگی میں گزاری۔ اُس نے کبھی اپنے آقا کو ناراض نہیں کیا۔ اُس کا یہ جذبہ اِتنا قوی اور خود مختار تھا کہ وہ خود اپنی تسکین بن جاتا تھا اور خارجی ذرائع کی ضرورت کا احساس بھی پیدا نہ ہونے دیتا تھا۔ اُس نے پوری عمر انسانوں کے بھرے جنگل میں گزاری، مگر خود ایک بے برگ و بار درخت بن کر الگ کھڑا رہا۔ اُس کو اِس بات کا بھی ملال نہیں تھا کہ زرد کانٹوں کی نوکوں پر پتیاں نہیں اُگ سکتیں اور کوئی اِس تھوہر کے سائے میں نہیں بیٹھ سکتا۔ اُسے اپنی اَنا سے فرصت کہاں تھی کہ وہ اوروں کا غم کھاتا۔ وہ اپنے خول سے کبھی باہر نہ نکل سکا۔ اس شبستانِ عیش کے خول میں ساری عمر اُس نے اپنے آپ کو قید رکھا۔ اُس کا کوئی دوست، کوئی بہن بھائی، کوئی ماں باپ نہیں تھا۔ وہ بلکتے ہوئے کبھی اپنی ذات ہی سے لپٹ لیتا اور کبھی بے چین عاشق کی طرح اپنی انا کے زانو پر سر رکھ کر سو جاتا۔

میں نے میراجی کو اُس کے آخری دِنوں میں بمبئی میں دیکھا جب وہ کرشن چندر کے گھر

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 60 (1,1)

میں رہتا تھا۔ یہ ۱۹۴۷ء کے اوائل کا زمانہ تھا۔ اُس زمانے میں ہندوستان کے بیشتر لکھنے والے بمبئی پہنچ چکے تھے۔ بمبئی پہنچتے ہی لوگ کرشن چندر کے گھر کا رُخ کرتے کیونکہ بمبئی میں مکانوں کی بہت قلت تھی۔ زیادہ تر ادیب تو کرایہ اُدھار لے کر بمبئی پہنچتے تھے اور اِس لیے بھی کہ کرشن چندر کے مکان نے خیراتی سرائے کی سی شہرت اختیار کر لی تھی۔ جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اُس زمانے میں کرشن چندر کے یہاں آٹھ دس مشٹنڈوں کا مستقل ڈیرہ تھا اور کچھ لوگ مستقل آتے رہتے تھے۔ یہ سرائے وکٹوریہ ٹرمنس سے سترہ اسٹیشن دُور اندھیری کے ساحل پر واقع تھی۔ اِس میں تاڑ اور ناریل کے ہرے بھرے جُھنڈ تھے، آم اور چیکو کے پیڑ تھے، جنگلی پھولوں کی جھاڑیاں تھیں۔ بہار رُت میں کوئل کوکتی اور طوطے شور مچاتے تھے۔ اب بھی یہ سرائے اس طرح ہری بھری اور اس طرح آباد ہوگی جیسی کہ میں نے اُس زمانے میں دیکھی تھی۔ اب بھی کرشن چندر وہیں رہتا ہے۔ نچلی منزل میں اُس کی خاموش اور شفیق بیوی اور تقریباً گونگے بچے اور دوسری منزل میں وہی خانہ خرابوں کا ڈیرہ جو دن بھر لکڑی کی چھت کو اپنے قدموں سے کھٹ بڑھئی کی طرح ٹھوکتا رہتا ہے۔

پاکستان بننے کے بعد میں بمبئی نہیں گیا۔ کوورلاج کے متعلق مجھے کوئی نئی خبر نہیں ملی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہاں اب بھی وہی نقشہ ہے۔ کوورلاج کی ریت ہی ایسی ہے۔ خانہ خرابوں نے اس کا رستہ دیکھ لیا ہے اور گھر والوں کو کھٹ بڑھئی کی ٹھک ٹھک کی عادت ہو چکی ہے اور مشٹنڈے افسانہ نویس، شاعر، فلمی ایکسٹرا، گویّے، مزدور لیڈر اور ناکام فلم ڈائریکٹر وہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔

کوورلاج کی نچلی منزل تین کمرے ہیں۔ کمرے کیا ہیں بڑے بڑے ہال ہیں۔ اُس زمانے میں ان ہالوں میں بڑا سناٹا تھا۔ کرشن چندر رات دن کام میں مصروف رہتا تھا۔ اُس کی بیوی کو سب کچھ برداشت کر لینے کی عادت ہو چکی تھی۔ اُس کی پیاری پیاری بچیاں سکول سے آ کر بھی گھر آئی ہوئی معلوم نہیں ہوتی تھیں۔ کرشن چندر کا دوست اور بھائی مہندر وہیں رہتا تھا مگر اُس کا سارا وقت دوسری منزل میں کٹتا تھا۔ کرشن چندر کی چھوٹی بہن سرلا چُپ چاپ گھر میں بیٹھی ہندی

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 61 (1,1)

میں افسانے لکھ لکھ کے اُردو میں ترجمہ کیا کرتی تھی۔ان کمروں میں سے کوئی آواز نہیں آتی تھی۔ ایک سناٹا چھایا رہتا تھا مگر اِس سناٹے سے خوف نہیں آتا تھا بلکہ عجیب طرح کے تقدس کا احساس ہوتا تھا۔کوورلاج کی دوسری منزل تعمیر کے اعتبار سے پہلی منزل جیسی تھی۔اس میں بھی وہی تین ہال تھے، بالکل اُسی وسعت اور کشادگی کے مگر ان میں ہر وقت یوں شور وشغب رہتا تھا جیسے کوئی آبشار گر رہا ہو۔فرش لکڑی کا تھا۔نچلی منزل والوں کو اُوپر والوں کے ایک ایک قدم کا احساس ہوتا رہتا تھا۔ان ہالوں میں وشواستر عادل، ممتاز مفتی، ساحر لدھیانوی، کرشن چندر کی کچھنی کے تین ایکسٹرا ایکٹر آتے جاتے اور ٹھہرتے تھے۔لیکن میراجی کی وہاں مستقل سکونت تھی۔اپنے پڑوسیوں سے اس کے اچھے تعلقات تھے۔اگرچہ بظاہر وہ سب سے باتیں کیا کرتا تھا اور ہر ایک کی مشکلات سُنا کرتا تھا مگر دراصل وہ سب سے بے تعلق اور الگ تھلگ اپنے آپ میں گم رہتا تھا۔کبھی کبھی اضطراری طور پر یوں باتیں کرنے لگتا جیسے ابھی کسی گہرے خواب سے جاگا ہو، جیسے کسی خوف ناک گھپ اندھیرے سے گھبرا کر باہر نکل آیا ہو۔۔۔۔۔۔مگر اس اضطراری بے داری کے بعد جلد ہی وہ پھر اپنے خول کے اندر گم ہو جاتا جہاں سے اُس کی خبر نہ آتی تھی۔حقیقت یہ ہے کہ اُس کو اپنے پڑوسیوں کی کچھ خبر ہی نہ تھی مگر اِس لاتعلقی کے باوجود وہ اپنے ہمسایوں کو مختلف مسائل میں مشورے دیتا تھا، اُن سے بحث کرتا تھا، اُلجھتا تھا۔اُس کی گفتگو اور بحث تعلق کے اظہار سے خالی تھی۔اُس کی ہر بات ایک فتویٰ تھی، جسے عقل، منطق اور انصاف سے کوئی تعلق نہ تھا۔وہ دھونس اور جبر سے بات کرتا تھا۔اُس کی بات کو جھٹلانا کفر تھا۔پھر وہ اپنی سانپ کی سی آنکھیں نکال کے گھورتا تھا۔اپنے اُلجھے ہوئے بالوں کو جھٹکتا تھا۔پھر اپنے گولے ہاتھ میں لے کے گم ہو جاتا۔

اُس کی گمشدگی واضح اور شعوری نہ تھی۔یہ اُس کی فطرت تھی اور اس کے پڑوسی اُس کے اِس رُوپ سے اچھی طرح واقف تھے۔بمبئی جانے سے پہلے میں نے میراجی کے بارے میں طرح طرح کے قصے سُن رکھے تھے۔اس کے گھونسلے کے سے بالوں، اُس کی سانپ کی سی آنکھوں، اُس کی جوگیوں والی مالا اور اُس کے محبوب گولوں کی داستانیں مجھ تک پہنچ چکی تھیں۔

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 62 (1,1)

اُس کے اُلجھے ہوئے مغموم گیت بھی میں نے پڑھے تھے مگر میں نے اُسے دیکھا نہیں تھا۔ بلکہ جب میں کرشن چندر کی سرائے میں پہنچا تو مجھے معلوم بھی نہ تھا کہ میراجی وہاں رہتا ہے۔

مفتی اور میں لاہور سے سیدھے کوورلاج پہنچے تھے۔ کرشن چندر ناشتے کی میز پر بیٹھا تھا۔ چھوٹی سی تپائی تھی جس پر چائے کے برتن، کچھ پراٹھے اور انڈے رکھے تھے۔ کرسیوں پر کرشن کے بیوی بچے، مہندر اور میراجی بیٹھے تھے۔ رسمی گفتگو کے بعد ہم دوسری منزل میں چلے گئے جہاں ہمیں آئندہ کئی مہینے گزارنے تھے۔

اُس روز میں میراجی کو اچھی طرح نہ دیکھ سکا۔ اگلی صبح جب میں غسل خانے کی طرف جا رہا تھا تو پو پھٹ رہی تھی۔ مشرقی افق سفید ہو چکا تھا۔ درمیانی کمرے کی مشرقی دیوار میں ایک بڑھاؤ تھا جس کے تین طرف لوہے کا جنگلہ تھا۔ اس جنگلے کے اندر ایک پھٹی پرانی دلائی پر میراجی سورج کی طرف منہ کیے، دھرنا مارے، دھیان لگائے بیٹھا تھا۔ پاس ہی بوسیدہ اخباروں کا ایک بنڈل رکھا تھا۔ میراجی نے چارخانہ کھدر کی موٹی قمیض اور خاکی کاڈرائے کی پتلون پہن رکھی تھی۔ اُس کے گھنے بال گڈمڈ ہو رہے تھے۔ ان میں سفید اور نیم سفید بالوں کی پتلی پتلی لٹیں بھی تھیں۔ مجموعی طور پر اُس کا سر راکھ کا ایک ڈھیر معلوم ہوتا تھا۔ صبح کی سنہری دھوپ اس راکھ پر خوب چمک رہی تھی۔ اُس کی پشت میری طرف تھی۔ میں اُس کے چہرے کے تاثرات نہ دیکھ سکا اور چپ چاپ غسل خانے کی طرف چلا گیا۔ میرے دل میں اُس کے لیے ہمدردی کا ایک دریا اُمڈ آیا۔ یہ ہمدردی ایسی تھی جیسی کسی سڑے ہوئے لاشے کو دیکھنے سے پیدا ہو جاتی ہے مگر اِس ہمدردی میں خوف بھی شامل تھا، ایسا خوف جو کسی اسرار کو نہ سمجھ سکنے سے پیدا ہو جاتا ہے۔ ہاتھ میں ڈیٹول کی شیشی تھامے میں غسل خانے سے لوٹ کے آیا تو میراجی جنگلے سے ٹیک لگائے کمرے کی طرف منہ کیے بیٹھا تھا۔ نہ جانے کیوں دیکھتے ہی میرے منہ سے نکلا ''اسلام علیکم'' حالانکہ میرا اُسے سلام کرنے کا قطعی ارادہ نہ تھا۔

''آداب عرض'' میراجی نے نہایت گہری کٹیلی آواز میں یوں کہا جیسے سلام کا جواب

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 63 (1,1)

دینے کی بجائے وہ سلام علیکم کی تصحیح کر رہا ہو۔ میں جانے لگا تو تحکمانہ لہجے میں بولا: ''یہ ڈیٹول کی شیشی مجھے دیجیے گا۔''

میں نے یوں شیشی اُس کی طرف بڑھا دی جیسے عمر بھر سے اُس کے احکامات بجالانے کا عادی ہوں۔ اُس نے بالٹی اُٹھائی اور شکریہ ادا کیے بغیر یوں شیشی کو تھام کر جیسے میں نے اُسے سرقے سے بچالیا ہو، وہ غسل خانے کی طرف چل دیا۔

میراجی نے چائے، مفتی اور میرے ساتھ پی، اِس لیے کہ ہم نے درخواست کی تھی اور میراجی نے یہ درخواست قبول کرلی تھی۔ چائے پلانے یا کھانا کھلانے والا میراجی سے شمولیت کی درخواست کرے یا نہ کرے، میراجی اس انداز سے شمولیت کرنے کا عادی تھا جیسے اُس نے درخواست قبول کرلی ہو۔ اگرچہ اِس قبولیت میں احسان کرنے یا اُٹھانے کا عنصر نہیں ہوتا تھا۔ میراجی نے ہماری درخواست بھی قبول کرلی تھی مگر یہ قبولیت ہم سے کسی تعلق کا اقرار نہیں تھی۔ اس قبولیت میں ہم سے انکار کا جذبہ بھی نہ تھا۔ اُس سے کسی جذبہ کا تعلق ہی نہ ہوتا تھا۔ اُس کو اِس بات کا احساس ہی نہیں تھا کہ وہ رسمی درخواست پر اجنبیوں، نو واردوں سے چائے پی رہا تھا۔ چائے پینا محض ایک عمل تھا، جذبات سے بے تعلق عمل۔ وہ آہستہ آہستہ چائے پیتا رہا، اُس نے ہم سے اِدھر اُدھر کی باتیں بھی کیں مگر یہ باتیں محض وقت گزارنے کے لیے تھیں۔ اِس ملاقات میں مَیں نے میراجی کو اچھی طرح دیکھا۔ وہ وہی کھدر کی قمیص اور خاکی کا ڈرائے کی پتلون پہنے تھا۔ اس کا کالر میلا تھا۔ پتلون بہت بڑی تھی، جسے اُس نے اوپر سے دوہرا کر کے ایک ٹائی سے کمر کے گرد باندھ رکھا تھا۔ کالر کا بٹن کھلا تھا جس میں سے اُس کی جوگیوں والی مالا کے بڑے بڑے موتی جھانک رہے تھے۔ اُس کے دائیں ہاتھ میں دو روپہلے گولے تھے۔ بائیں ہاتھ کی منجھلی اور چھوٹی انگلی میں لوہے کے دو باریک چھلے تھے۔ بغل میں وہی بوسیدہ اخباروں کا بنڈل تھا۔ وہ ابھی نہا کے آیا تھا لیکن ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے نہائے ہوئے برسوں گزر چکے ہوں۔ کپڑے بدلنے کے بعد میں نے پوچھا'' کہیے میراجی! اب کیا پروگرام ہے؟

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 64 (1,1)

''پروگرام۔۔۔۔۔؟''میراجی نے چونک کر یوں کہا جیسے مجھے ڈانٹ رہا ہو۔

''یعنی آپ یہیں رہیں گے، باہر نہیں جائیں گے کیا؟''

''نہیں جائیں گے، ضرور جائیں گے، یہاں کیا کریں گے۔۔۔۔۔'' میراجی نے مضطرب ہو کر مجھے پھر ڈانٹا۔

''کدھر جائیے گا؟''

''کہیں بھی چلے جائیں گے۔'' میراجی نے بظاہر بے فکری سے کہا مگر اِس بے فکری میں تردّد کا رنگ جھلکتا تھا جیسے میراجی سے کوئی کٹھن سوال کیا گیا ہو، جیسے اُس پر کوئی بہت بڑی آفت آن پڑی ہو۔

''تو پھر ہمارے ساتھ چلیے۔ ہمیں کچھ لوگوں سے ملنا ہے۔''

''ہاں، ہاں، کیوں نہیں، بمبئی کے بارے میں کچھ معلوم بھی ہے آپ کو؟'' میراجی نے تیز ہو کے یوں کہا جیسے ہم دونوں بچوں کا ممتحن ہو۔

''جی نہیں، ہم تو نو وارد ہیں، آپ جانتے ہی ہیں۔''

''تو سب سے پہلے اِس شہر کا جغرافیہ سمجھیے۔ پہلا کام یہ کیجیے کہ بمبئی کا نقشہ خرید لیے۔ یہاں مستقل فسادات ہو رہے ہیں، کہیں آپ کا آملیٹ بن جائے گا اور آپ کو خبر بھی نہ ہوگی۔''

میراجی کا یہ تحکمانہ انداز ہمیں سخت ناگوار ہوا لیکن اس داخلی احتجاج کے باوجود اُس روز ہم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ بمبئی کا نقشہ خریدا۔ پھر ہم اِدھر اُدھر گھومتے اور لوگوں سے ملاقاتیں کرتے رہے۔ میراجی ہمیں گاڑیوں کے اوقات، کرائے، سڑکوں کے نشیب و فراز، مقاموں کے بھید اور شخصیتوں کے اسرار کے متعلق یوں بتا رہا تھا جیسے وہ احکام جاری کر رہا ہو۔ اس نے خاص طور سے جو بات ہمارے ذہن میں بٹھائی وہ تھی جان کی حفاظت۔ اُس نے بتایا کہ بمبئی کی سڑکیں جنگلوں سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ چلتے ہوئے آگے پیچھے اور دائیں بائیں کا خیال رکھنا سخت ضروری ہے کہ کس پہلو سے چاقو کا وار کیا جا سکتا ہے۔ کس جانب سے چھری چل سکتی ہے۔

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 65 (1,1)

جن لوگوں سے ہمیں ملنا تھا میراجی کو اُن کے گھر معلوم تھے۔ جہاں ہمیں جانا تھا وہ شوق سے ہمیں لے گیا۔ جس بات پر ہم نے مشورہ طلب کیا میراجی نے بڑے ہوش اور شوق کے ساتھ احکامات جاری کیے اور جس بات پر ہم نے نہیں طلب کیا اُس پر بھی۔

ہم کئی جگہ گئے۔ میراجی مسلسل باتیں کرتا رہا۔ کبھی ادب کی، کبھی فسادات کی، کبھی اِدھر اُدھر کی۔ وہ بہت ہوشیاری سے چلتا تھا جیسے چوری کر کے آیا ہو، جیسے اُسے کسی حادثے کا انتظار ہو۔ سڑک پر جہاں بھی اُسے سگرٹ کی خالی ڈبیا دکھائی دیتی، بلاتکلف اُٹھا کے اُس میں سے پنّی نکالتا اور اخباروں کے بوسیدہ بنڈل میں رکھ لیتا۔

ہم بہت سے لوگوں سے ملے۔ میراجی ہمارا تعارف تو کراتا مگر پھر خود مسند پر بیٹھ کر ہمیں محفل سے خارج کر دیتا۔ تھوڑی سی باتیں کرتا پھر بے چین ہو جاتا اور وہاں سے بھاگ جانا چاہتا جیسے اُسے ڈر ہو کہ اُس کی چوری پکڑی جائے گی۔

کھانا ہم نے میراجی کے حکم سے دادر کے ایک ہوٹل میں کھایا۔ میراجی نے ہاتھ دھوئے پھر آ کے میز پر بیٹھ گیا۔ کھانے کے انتخاب میں اُس نے کوئی دلچسپی نہ لی۔ کھانا آ گیا تو اُس نے بائیں ہاتھ کی اُنگلی سے چھلّے اُتار کر میز پر رکھ دیے۔ پھر دونوں گولے اُن پر ٹکا دیے اور کھانے میں مصروف ہو گیا۔ ہم دن بھر کا کام ختم کر چکے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد ایک تنگ سی گلی میں سے گزر کر ہم دادر اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ گھر پہنچنے سے قبل ہم نے میراجی کی مدد سے بمبئی کے بہت بڑے بڑے بھید جان لیے تھے۔ ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ کن کن علاقوں میں جانا خطرناک ہے۔ میراجی نے نقشے پر ان علاقوں کے گرد دائرے بنا دیے تھے اور ہمیں کہا تھا کہ انھیں ازبر کر لو۔ گویا ماسٹر صاحب نے ہمیں گھر کا کام دے دیا تھا۔

سارا دن ہمارے ساتھ گزار کر رات کو وہ ہمارے ساتھ کوور لاج لوٹا اور کمرے میں داخل ہوتے ہی بالکونی میں جا کے یوں بیٹھ گیا جیسے ہم سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ پھر اُس نے ہم سے کوئی بات نہ کی۔ اُس کا ایک دلائی اور میلے تکیہ کا بستر کھلا پڑا تھا جس پر بجلی کی روشنی چھن چھن کر

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 66 (1,1)

پڑ رہی تھی۔ اُس نے بوسیدہ اخبارات کا دفتر کھولا اور اُس میں سے چُنی ہوئی پنیاں نکال کر گولوں پر جمانے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے دفتر سے ''کرائم اینڈ مسٹری'' کا ایک پرچہ نکالا اور اُس کے مطالعہ میں غرق ہو گیا۔

اس کے بعد ہمارا یہ معمول ہو گیا کہ صبح سے شام تک ہم تینوں مفتی، میراجی اور میں بمبئی کی گلیوں اور بازاروں میں بھٹکتے اور رات کو اپنے اپنے بستروں پر لیٹ جاتے۔

میراجی ہمیشہ سونے سے پہلے ''کرائم اینڈ مسٹری'' کے کچھ صفحے پڑھتا۔ کبھی کبھی گنگنانے لگتا اور پھر یک لخت بالکونی پر خاموشی چھا جاتی۔

میراجی کو میں نے کبھی عمدہ لٹریچر کا مطالعہ کرتے نہیں دیکھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میراجی کو عمدہ لٹریچر کا علم نہیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے بہت کم لوگوں کو عمدہ لٹریچر پر اس اعتماد سے بات کرتے دیکھا جو میراجی کا خاصہ تھا۔ اُس کی رائے نہایت واضح اور جابرانہ ہوتی تھی۔ وہ اپنی غلط رائے پر بھی نہایت شدت سے اَڑا رہتا تھا۔ میراجی اِس بات کو پسند نہیں کرتا تھا کہ کوئی اُس کو ٹوکے۔ وہ ذرا سا اختلاف بھی برداشت نہیں کرتا تھا۔ اُس زمانے میں وہ انجمن ترقی پسند مصنّفین کے اجلاس میں بڑی باقاعدگی سے شریک ہوتا تھا۔ مگر اُن جلسوں میں بھی اُس کا رویہ جابرانہ ہوا کرتا تھا۔ اُس کو انجمن کے اغراض و مقاصد سے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی۔ ترقی پسند مصنفین کا پیش کیا ہوا ادب بھی اُسے پسند نہ تھا مگر وہ انجمن کی کارروائی اور بحث میں ضرور حصہ لیا کرتا تھا۔ حمید اختر اُن دنوں بمبئی شاخ کا سیکرٹری تھا اور کارروائی لکھا کرتا تھا۔۔۔۔۔ اس سے اگر کوئی فقرہ چھوٹ جاتا یا وہ مصلحتاً اُسے چھوڑ دیتا تو میراجی فوراً بول اُٹھتا تھا اور اصرار کے ساتھ چُھوٹے ہوئے یا چھوڑے ہوئے فقرے درج کراتا تھا۔ میراجی کی تنقید کا انداز خالص ادبی تھا۔ مگر وہ ذاتیات میں بہت اُلجھتا تھا۔ جوش ملیح آبادی سے اُس کو خاص چڑ تھی۔ اس چڑ کی وجہ جوش کے کلام کی مقبولیت نہیں بلکہ جوش کی ذات تھی۔ میراجی جوش کو شاعر مانتا تھا مگر جس انداز سے اُس کی پوجا ہوتی اس سے وہ نہایت ناخوش تھا۔ چنانچہ جس جلسے میں جوش کو کچھ پڑھنا ہوتا، میراجی اُس جلسے میں خاص طور پر

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 67 (1,1)

شرکت کرتا۔ بحث کا آغاز ہمیشہ وشوامتر عادل کرتا اور اصول اور اعتراض کو چھوڑ کر جلد ہی مغلوب الغضب ہو کر چپ ہو جاتا۔ پھر میراجی بات اُٹھا لیتا اور اپنی پاٹ دار کڑی آواز میں تیکھے تیکھے اعتراض کرتا۔ وہ اپنی بات ہمیشہ کھنکھا کے شروع کرتا: ''جہاں تک ہم جانتے ہیں۔۔۔۔۔''، ''جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے۔۔۔۔۔'' اُس کو گلا کھنکارتے دیکھ کر سب اُس کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ایک جلسے میں جوش نے ایک طویل اور ادق نظم پڑھی تو وشوامتر عادل نے فوراً سوال اٹھایا کہ آپ نے یہ نظم قارئین کے کس طبقے کے لیے لکھی ہے۔ لیکن وہ جوش کے جواب کا انتظار نہ کر سکا اور اُس کی آواز بھرّا گئی۔ میراجی نے کہا: ''جہاں تک ہمارا خیال ہے یہ نظم عوام کے لیے نہیں لکھی گئی۔ کیونکہ یہ عوام کے فہم سے بالا ہے۔'' جوش نے کہا: ''یہ نظم میں نے پڑھے لکھوں کے لیے لکھی ہے۔''

''ہمارے عوام پڑھے لکھے نہیں ہیں تو یہ نظم آپ نے خواص کے لیے لکھی ہے۔'' میراجی نے کہا۔

''جی ہاں۔ وہ لوگ میری بات سمجھتے ہیں۔ عوام میری زبان نہیں سمجھتے۔'' جوش کے مُنہ سے نکلا۔

اگلی مجلس میں جب حمید اختر نے کارروائی پڑھ کے سنائی تو بحث کا یہ حصہ اس میں درج نہ تھا لیکن میراجی چوکنے والا نہیں تھا۔ اُس نے اس حصے کو کارروائی میں درج کروایا اور پھر مہینوں اس کارنامے کا چرچا کیا۔

کوورلاج میں یا کسی اور جگہ مصنفین کی موجودگی میں ادب کی بات چھڑ جاتی تو میراجی بڑے شوق سے اس میں حصہ لیا کرتا تھا اور اپنے فتوے دیا کرتا تھا۔ وہ مخاطب کی بات دھیان سے نہیں سنتا تھا۔ بیچ ہی میں فقرہ کاٹ کر اپنا حکم سنانے لگتا۔ لیکن انتہائی غصے میں بھی اُس کی زبان سے کسی کے لیے ''تم'' کا لفظ نہ نکلتا تھا۔ بات چیت کے رکھ رکھاؤ میں وہ بہت محتاط تھا۔ وہ دوسروں کے دل آزردہ تو کرتا تھا لیکن اپنے جملوں سے نہیں بلکہ اپنے انداز سے تیر و نشتر کا کام لیا کرتا

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 68 (1,1)

تھا۔ باتوں اور بحثوں کو چھوڑ کر خالص ادب یا عمدہ ادب سے اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اور جب بھی وہ اکیلا ہوتا تو ''کرائم اینڈ مسٹری'' میں گم ہو جایا کرتا تھا۔ ایسے پرچوں کے کئی شمارے اکثر اُس کی بغل میں رہتے تھے اور جہاں بھی وہ اس قسم کا پرچہ دیکھتا، اُٹھا کے لے آتا۔

اُس کو خودکشی کرنے اور قتل کر کے بچ نکلنے کے انوکھے طریقے معلوم تھے لیکن وہ کسی کو یہ طریقے نہ بتاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اُسے دوسروں کو جرم کی ترغیب دینے سے خوف آتا تھا بلکہ اِس لیے کہ وہ اپنے گرد ایک اسرار قائم رکھنا چاہتا تھا تا کہ موقعہ پائے تو زمین سے اونچا ہو کے کہے ''جہاں تک ہم جانتے ہیں۔۔۔۔۔''، ''جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے۔۔۔۔۔''

میراجی کو اپنی جان بہت پیاری تھی۔ اگرچہ وہ اپنے جسم کو طرح طرح کے دُکھ دیتا تھا مگر جہاں جان کا خطرہ ہوتا وہاں بھولے سے بھی نہ جاتا۔ یا تو زندگی سے محبت اور جان کی حفاظت کے جذبے نے اُس میں عجیب حواس اور حسیات پیدا کر دیے تھے یا محض اِس لیے کہ اُسے اسرار اور Suspence پیدا کرنے کا شوق تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اُس نے اچھی بھلی جمی جمائی محفل کو یہ اعلان کر کے اُکھاڑ دیا کہ یہاں قاتل حملہ کرنے والے ہیں یا یہاں سے واپسی کے بعد فلاں راستے یا فلاں مقام پر حملہ ہونے والا ہے۔ ایک مرتبہ میراجی، مفتی اور میں وکٹوریہ ٹرمنس سے ایک بس پر سوار ہوئے جو گول پیٹھا سے ہو کے گزرنے والی تھی۔ ہم ٹکٹ لے چکے تھے اور بڑے اطمینان سے بیٹھے تھے۔ ڈرائیور گیئر لگا چکا تھا کہ یک دم میراجی گھبرا کے چلّانے لگا: ''چلیے، نکل چلیے۔ گول پیٹھے میں اِس بس پر حملہ ہونے والا ہے۔'' مفتی جو ہمیشہ خوف زدہ رہتا ہے فوراً بس سے نکل آیا۔ مجھے بہت غصہ آیا مگر میں ان دونوں بزرگوں کے زیرِ اثر تھا، ناچار اُتر آیا اور بڑی مشکل سے ہم وکٹوریہ ٹرمنس سے گاڑی پر بیٹھے۔ اس احتیاط میں ہمارے دو گھنٹے خواہ مخواہ ضائع ہو گئے مگر اگلی صبح ہمیں معلوم ہوا کہ گول پیٹھا میں واقعی بس پر حملہ ہوا تھا کیونکہ اُسی دن مسلم لیگ نے ''ڈائریکٹ ایکشن ڈے'' منایا تھا۔ اس کے بعد تو میراجی نے مجھ پر دھونس جمانی شروع کر دی۔ وہ مجھے یقین دلانے لگا کہ میں فضا کو سونگھ کر بتا سکتا ہوں کہ فلاں جگہ جان کا خطرہ ہے۔ مجھے یقین

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 69 (1,1)

دلانے کی اس کوشش کے بعد اُس نے میرے رُوبرو اپنا انداز اور بھی پُر اسرار بنا لیا۔ ایک دفعہ میں نے اُس کی بات نہ مانی اور کالبا دیوی کی ایک ٹرام میں سوار ہو گیا جس کے بارے میں میراجی نے تباہی کا فتویٰ دیا تھا۔ میراجی نے مجھے بہت روکا مگر میں بضد سوار ہو گیا۔ ٹرام چلی تو میراجی نے مجھ سے کچھ اِس طرح ہاتھ ملایا جیسے وہ مُردے سے ہاتھ ملا رہا ہو۔ وہ وہیں کھڑا میری طرف یوں دیکھتا رہا جیسے ٹرام میں لاش جا رہی ہو۔ لیکن اُس روز کچھ بھی نہ ہوا اور بخیریت واپسی پر رات کو میں نے میراجی سے گپیں ہانکیں لیکن میراجی نے میرے زندہ لوٹ آنے پر حیرت یا ندامت کا اظہار نہیں کیا۔

میراجی کو اِس بات سے بہت تسکین ہوتی تھی کہ لوگ اُسے پُر اسرار سمجھیں۔ پُر اسراریت کے جنون میں وہ عجیب عجیب حرکتیں کیا کرتا تھا۔

وشوامتر عادلؔ اُن دِنوں ایک ایسی عورت کے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا جو اُس کے ایک دوست کی بیوی تھی۔ وہ بڑی پیاری اور نیک عورت تھی۔ وشوامتر کے دوست کو اُس کی پرخلوص محبت کا علم بھی تھا۔ شادی کے بعد وشوامتر عادل نے اپنی محبت کا رُخ بدلنے کی مخلصانہ کوشش کی تھی اور محبت کو احترام اور عقیدت کے جذبات میں بدلنے کی شدید سعی کی تھی لیکن اسی کوشش کی وجہ سے وہ جذباتی انتشار کا شکار ہو گیا اور شاید اِس جذباتی انتشار سے گھبرا کر اُس نے ایک دفعہ خودکُشی کرنے کی کوشش کی۔ اِس واقعہ کا میراجی کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔ اگرچہ میراجی کو وشوامتر عادل کا راز بہت عزیز تھا مگر اپنے پُر اسراریت کے جذبے سے مجبور ہو کے وہ کوور لاج کے چوک میں کھڑا ہو کے عجیب عجیب اشاروں اور کنایوں سے اس واقعہ کو نشر کیا کرتا تھا۔

پُر اسراریت کے شوق میں میراجی چھوٹے سے چھوٹے واقعہ اور چھوٹے سے چھوٹے آدمی کو اپنا تختۂ مشق بنانے کو تیار رہتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ کوور لاج میں ایک راشننگ انسپکٹر ناموں کے اندراج کی چیکنگ کے سلسلے میں آ پہنچا تو میراجی سے اُس نے نام پوچھا: ''میرا جی۔۔۔۔۔'' میراجی نے کہا۔

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 70 (1,1)

''باپ کا نام؟''

''مہتاب دین''

انسپکٹر نے حیرت سے دیکھا۔ پھر کہا: ''مذہب؟''

''سکھ۔''

انسپکٹر جھنجھلا گیا اور پھر بولا: ''دیکھیے صاحب ہم ڈیوٹی پر ہے ہم سے مجاک مت کرو۔''

اگرچہ مہتاب دین کا یہ بیٹا، نام سے بنگالی ہندو، شکل وصورت سے جٹا دھاری سکھ اور عقیدے سے نہ جانے کیا دِکھائی دیتا تھا مگر درحقیقت وہ ہندو تھا نہ مسلمان، نہ سکھ۔ وہ تو محض میراجی تھا اور راشننگ افسر کو پریشان ہوتے دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔

میراجی کو کسی مذہب سے واسطہ نہ تھا۔ اُسے انسانوں سے ظاہری ہمدردی تھی، ایسی ہمدردی جیسی راہ چلتے کسی روتے بچے کو دیکھ کر ہو جاتی ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، سب میراجی کے لیے روتے ہوئے بچے تھے۔ وہ ان روتے ہوئے بچوں کو دیکھتا اور اپنی راہ چلتا رہتا۔ اُسے مذہبوں، قوموں سے نہیں بلکہ ذہنیتوں سے نفرت تھی۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ اُسے ہندوؤں کی ایک مخصوص ذہنیت سے نفرت تھی۔ اُس نے مسلمانوں سے کسی لگاؤ کا اظہار کبھی نہیں کیا۔ مشرقی پنجاب سے جب قتل عام کی خبریں آتی تھیں تو اُسے مقتولوں سے ہمدردی ہوتی تھی۔ اب یہ اتفاق کی بات ہے کہ یہ مقتول زیادہ تر مسلمان تھے۔ فسادات اور قتل عام سے اُسے تکلیف ہوتی تھی۔ غالباً اِس لیے کہ موت کا ڈر اُس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ اور قتل وغارت کا قصہ سُن کر وہ محسوس کرتا جیسے وہ خود قتل ہو جانے والا ہے۔

مغربی پنجاب میں قتل عام کے وقت میں بمبئی چھوڑ چکا تھا۔ اِس لیے اُس کے جذبات کا مشاہدہ نہ کر سکا مگر مجھے یقین ہے کہ مغربی پنجاب میں زیادہ تر مقتول ہندو اور سکھ تھے۔ بس ایک عجیب مضطرب زمانہ تھا۔ کرشن چندر بھی ہندوؤں کے قتل عام پر غمگین ہو جایا کرتا تھا اگرچہ کسی مذہب سے اُسے کوئی تعلق نہ تھا۔ اِس کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمانوں کے قتل عام پر اُسے تکلیف نہ

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 71 (1,1)

ہوتی تھی۔ میں نے میراجی کو کسی مذہب کی مخالفت کرتے نہیں دیکھا لیکن وہ بودھ مت کو بہت پسند کرتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا میں تبت یا لنکا چلا جاؤں گا اور باقی عمر کسی خانقاہ میں گزاروں گا۔ اُس کی یہ خواہش کسی گہرے ارادے کا عکس نہیں تھی۔ اُسے بودھ مت مت کے گیان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میراجی کو تنہائی پسند تھی مگر ایسی تنہائی نہیں جیسی گیان دھیان رائے پسند کرتے ہیں۔ وہ تو ویرانے کی تنہائی سے ڈرتا تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ اُس کے گرد بھیڑ لگی ہو اور اس بھیڑ میں الگ مسند لگا کر بیٹھا رہے۔ اس بھیڑ کے درمیان مگر اس سے بہت دور۔ اُس کی اِس تنہا پسندی کی تسکین تو لاہور، دہلی اور بمبئی کے بازاروں میں بہتر ہو سکتی تھی۔ وہ اپنی ذات کے اونچے ٹیلے پر بیٹھ جاتا اور چوروں کی طرح اپنی انا میں گھس کر لذّت حاصل کرتا۔ ویرانے کی تنہائی اُس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ کیونکہ پھر اُس کو اپنی تنہائی کا احساس ہونے لگتا تھا۔ اور وہ گھبرا کر بازاروں اور ہجوموں کی طرف اُٹھ بھاگتا تھا۔

اُس کو آواگون کے فلسفہ پر ذہنی طور پر یقین تھا مگر اُسے نجات اور نروان کی پروا نہ تھی۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو کسی بندش میں گرفتار سمجھتا ہی نہ تھا۔ اُس کا نروان تو اُس کی اپنی اَنا کی لذّت میں تھا۔ اُس کی نجات یہی تھی کہ زندگی گزرتی چلی جائے اور اُسے اس کے گزرتے چلے جانے کا احساس ہی نہ ہو۔

بودھ کے فلسفے سے عملی طور پر اُسے کوئی علاقہ نہ تھا کیونکہ وہ بودھ کے بنیادی خیال یعنی ترکِ لذّت کا باغی تھا۔ میراجی نے دُنیا چھوڑ دی مگر لذّت پرستی نہ چھوڑی۔ اُس نے لذّت کشی کے تمام تقاضے پورے کیے۔ لذّت کو وہ روحانیت کی معراج سمجھتا تھا۔ چنانچہ اِس کاوش میں اُس کا جسم آزردہ اور روح آسودہ رہی۔ لذّت کے تقاضے پورے کرنے میں اُسے بہت دسترس تھی بلکہ اِس سلسلے میں اُسے ''یدِ بیضا'' عطا ہوا تھا۔ وہ اپنے ''یدِ بیضا'' کا بڑے شوق اور اعتماد سے ذکر کیا کرتا تھا۔ اُس کی ساری زندگی یدِ بیضا کے معجزوں اور ان معجزوں کے ذکر میں گزری۔ آخری عمر میں جب یہ معجزے فطری طور پر کم ہو گئے تو اُن کا ذکر بھی کم ہو گیا۔ مگر جب بھی ان کے ذکر کا موقع

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 72 (1,1)

آتا میراجی بے تکلف ہو کے ڈینگ مار کے اُن کا ذکر کرتا تھا۔ اُس کے معمولی ملنے والوں کو بھی یہ معلوم تھا کہ ہندوستان کے کس شہر کے کس کونے میں اُس کے دستِ کرشمہ ساز نے موتی بکھیرے ہیں اور اس گل کاری میں اُس نے کیسی کیسی لذّت پائی ہے۔

میراجی کا لذّت کا تصوّر عام انسانوں سے مختلف تھا۔ اِس لیے کہ اُس کے لذّت کے ذرائع بھی مختلف تھے۔ مثلاً لذّت کے حصول میں اُسے عورت سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ عورت اُس کے لیے ایک بے معنی اور مجہول شے تھی جسے اُس نے سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی۔ میراجی کے لیے وہ ایک خوب صورت بطخ تھی جس کے سفید سفید پر اُسے اچھے بھلے معلوم دیتے تھے لیکن جس سے کسی گہرے یا مستقل تعلق کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ اِس حقیقت کے باوجود میراجی نے دو تین مرتبہ عورت سے مصالحت کی کوشش کی۔ اگرچہ مصالحت کی یہ کوش سرسری اور محض تجرباتی تھی۔ اس کے لیے یوں تو سبھی عورتیں ایک جیسی تھیں جیسے سبھی بطخیں ایک جیسی ہوتی ہیں لیکن جن عورتوں سے اُس نے تھوڑی بہت رغبت ظاہر کی وہ چپٹی ناک اور چوڑے چہرے والی عورتیں تھیں۔ عام طور پر جن عورتوں کو حسین اور پُرکشش سمجھا جاتا ہے میراجی کو اُن میں کچھ دِکھائی نہیں دیتا تھا۔

سب سے پہلی عورت جس کی طرف میراجی نے رغبت ظاہر کی، وہی میرا سین تھی جس نے اُسے میراجی بنایا۔ میراجی نے اُس سے بھرپور عشق کیا۔ مگر اُس کا عشق بھی ناقابلِ فہم تھا۔ اُس نے عمر بھر میرا سین سے بات بھی نہ کی۔ اُس کی طرف آنکھ بھر کے دیکھا بھی نہیں اور ساری زندگی اُس کے نام پر تج دی۔ میراجی نے میرا سے کوئی مقصد وابستہ نہیں کیا۔ اُس کے حصول کی کوشش نہیں کی، فقط کچھ مدت اُسے چوروں کی طرح دیکھتا رہا اور پھر اُس کا نام اختیار کر کے اُس سے اور دُنیا کی تمام عورتوں سے آزاد ہو گیا۔ میرا کا ذکر کرتے ہوئے کسی خاص جذبے کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ ایسے بات کرتا تھا جیسے یہ افسانہ کسی دوسرے سے متعلق ہو اور وہ فقط اس کا راوی ہو۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا:

''آپ نے میرا سے کبھی اپنے عشق کا اظہار بھی کیا؟''

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 73 (1,1)

''اِس کا کبھی موقع ہی نہ ملا۔'' میراجی نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''مگر آپ نے کبھی کوشش کی؟''

''کی تھی۔۔۔۔۔''

''مثلاً ؟''

''مثلاً ہم نے ایک بار فیصلہ کیا کہ اُس سے بات کریں گے۔ ہم نے جواب سوچا کہ اگر اُس نے انکار کیا تو اُس کو یوں قائل کریں گے۔ اقرار کیا تو یوں پروگرام بنائیں گے۔ اچھی طرح غور کرنے کے بعد ہم اُس کے پاس پہنچے۔ ہم نے بات کی۔ وہ سُن کر خاموش ہوگئی۔ بالکل نہ بولی۔''

''تو پھر۔۔۔۔؟''

''پھر ہم چلے آئے۔''

''کیوں۔۔۔۔۔۔؟''

''کیونکہ یہ ہم نے سوچا ہی نہ تھا۔''

میراجی ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ اُسے میرا سے بات کرنے کا موقعہ ہی نہ ملا تھا۔ مگر میرا خیال ہے کہ یہ وہ محض زیبِ داستاں کے لیے کہا کرتا تھا۔ دراصل اُس نے کبھی دل سے چاہا ہی نہ تھا کہ میرا سے عشق کا اِظہار کرے۔ اُس کا مقصد تو چُھپ چُھپ کے لذّت لینا تھا۔ میرا تو محض ایک بہانہ تھی۔ اِس قسم کے بہانے زندگی میں اُس نے اور بھی بنائے جس میں ایک بہانہ ایک ادیب خاتون(۱) سے عشق تھا۔ میراجی نے اُن خاتون سے عشق کیا اور اپنے قول کے مطابق وہ اُن سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اُن سے میراجی کی ملاقات غالباً بمبئی جانے سے پہلے ہو چکی تھی لیکن بمبئی جانے کے بعد یہ عشق نما بہانہ بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ یہ کہانی بھی کم وبیش میرا کی کہانی سے ملتی جُلتی تھی۔ یہ خاتون میراجی سے بڑی شفقت سے پیش آتی تھیں۔ میراجی کو یک دم خیال آیا کہ ان سے شادی کرنی چاہیے۔ چند مہینے وہ اِس فکر میں غلطاں رہا کہ شادی کرنی چاہیے کہ نہیں۔ اِس فکر کے دوران اُس نے اُس خاتون سے ملنا چھوڑ دیا۔ آخر وہ اِس نتیجہ پر پہنچا کہ شادی کی بات ہو جائے تو

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 74 (1,1)

کیا مضائقہ ہے۔ چنانچہ وہ اُن کے گھر پہنچا۔ خاتون حسبِ سابق نہایت اخلاق سے پیش آئی اور اُس سے نہ آنے کا شکوہ کیا۔ میراجی ابھی بات کرنے کے لیے گلا صاف کر رہا تھا کہ ایک صاحب اندر داخل ہوئے۔ خاتون نے کہا: ''میرے شوہر۔۔۔۔ اِن سے ملیے۔''

میراجی بات کیے بغیر اُٹھ کر چلا آیا کیونکہ ظاہر ہے کہ یہ بات بھی اُس نے سوچی نہ تھی۔

میراجی کو تو اِس بات کا رنج بھی نہ ہوا ہوگا کیونکہ دراصل اُس کو اس خاتون سے عشق نہ تھا۔ اُسے شادی کی ضرورت اور آرزو ہی نہ تھی۔ چنانچہ وہ اپنے اِس خاص جذبے کا ذکر کسی خاص تاثر کے اظہار کے بغیر کیا کرتا تھا۔

اُس کا تیسرا بہانہ بادل نام کی ایک شاعر خاتون تھی۔ میں نے ان محترمہ کا ناک نقشہ نہیں دیکھا مگر میرے خیال میں یہ محترمہ بھی چوڑے چہرے اور چپٹی ناک کی مالک ہوں گی۔ ان سے بھی عشق کے اظہار کی صورت نہ بنی۔ میراجی نے کُل تین عورتوں سے رغبت محسوس کی اور اس کا فیصلہ کیا کہ چوڑے چہرے اور چپٹی ناک والی عورتیں بہت حسین ہوتی ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ چوڑے چہرے اور چپٹی ناک والی عورتیں میراجی کے بارے میں کیا رائے رکھتی تھیں۔ اور اِس خاص برانڈ کے علاوہ عورتوں کی دوسری جتنی قسمیں ہیں اُن کے دِلوں میں میراجی نے کیا تاثر پیدا کیا؟

میراجی میں بعض ایسی خصوصیات نظر آتی تھیں جن کی وجہ سے کچھ عورتیں اس سے عشق کرنے پر رضامند ہو سکتی تھیں۔ عشق تو میراجی کے لاابالی پن سے بہت سی عورتوں نے کیا ہوگا، لیکن چند ایک نارمل قسم کی عورتوں نے اُسے شوہر کی نظر سے چاہا بھی ہوگا کیونکہ بعض باتوں میں میراجی دُنیاوی اعتبار سے سیانا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اُس کی سیانت بعض اوقات تو چُبھنے لگتی تھی۔ بلکہ شبہ ہونے لگتا تھا کہ شاید میراجی ایک چالاک آدمی ہے اور اس نے جو روپ دھار رکھا ہے وہ ایک دکھاوا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اُس کے بہروپ سے متاثر ہو کر اُس کی ناز برداری کریں، اُس کی دیکھ بھال کریں، اُس کو شراب پلائیں، کھانا کھلائیں، ساتھ گھمائیں اور وہ خود کام اور محنت

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 75 (1,1)

سے بے نیاز مسند پر دیوتا بن کر بیٹھا رہے۔

میراجی کی ضروریات بہت مختصر تھیں لیکن وہ انھیں جس ڈھنگ، جس عمدگی اور جس کامیابی سے پورا کرتا تھا وہ بھولے بھالے بھکاری یا بے نیاز جوگی کا نہیں، زمانہ فہم آدمی کا حصہ ہے۔ بعض حالات میں اس میں اور ایک نارمل انسان میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا تھا۔

وہ پان بہت کھاتا تھا، دن میں اوسطاً چالیس پچاس۔ اور یہ لت ایسی تھی کہ اس کے بغیر اُس کا دن گزرنا مشکل تھا۔ اس کے ساتھ گھومنے والے دو چار مرتبہ پان کھاتے تھے تو اُسے بھی کھلا دیتے تھے۔ مگر اس سے میراجی کی طلب پوری نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ اُس نے ایک پان کھانے والے ساتھی کو یہ یقین دلایا کہ بمبئی کے پنواڑی پان بنانا نہیں جانتے۔ اِس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ پان کھانے والے ساتھی نے کوورلاج میں پان دان بنالیا جس کے لیے کتھا چونا اور چھالیا میراجی خود لایا۔ اس کے بعد میراجی ہر روز صبح گھر سے نکلنے سے پہلے چالیس پانوں کی گڈی بنا کر بغل میں رکھ لیتا اور دن بھر چباتا رہتا۔ پان کے علاوہ میراجی دو وقت کھانا بھی کھاتا تھا اور چار ایک پیالے چائے بھی پیتا تھا۔ اس کے لیے میراجی کو کسی پلان کی ضرورت نہ تھی۔ وہ جس کے ساتھ گھومتا تھا وہ اُسے ازخود کھانا کھلا دیتا تھا یا یوں سمجھیے کہ میراجی گھومتا ہی اُسی کے ساتھ تھا جو اُسے ازخود منت کر کے کھانا کھلا دے اور وہ منت نہ بھی کرتا، دعوت نہ بھی دیتا تو بھی کھانے میں شمولیت کرنے کے فن میں میراجی کی عظمت کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔ کھانے پینے کی ضروریات پوری کرنے میں میراجی کا رویہ ایسے ہی نارمل قسم کے آدمی کا تھا جس کا مقصد دوسروں کی گرہ پر زندہ رہنا ہو۔ میراجی ایسے دوستوں کو بہت پسند کرتا تھا جو اُسے روٹی کھلا دیتے تھے۔ مگر وہ کسی کا ممنون نہیں ہوتا تھا۔ وہ ایسے لوگوں کو بہت زیادہ عقل مند بھی نہیں سمجھتا تھا لیکن اس سلسلے میں وہ اپنے آپ کو بہت زیادہ عقلمند سمجھتا تھا اور اپنی کامیابی کی ڈینگیں بھی مارتا تھا۔

میراجی کی سیانت کی حد یہیں تک محدود تھی۔ اُس کی یہ خودغرضی دُنیادار انسانوں کی طرح تھی مگر اس عریاں قسم کی خودغرضی کے علاوہ اُس میں سماجی رکھ رکھاؤ اور خانہ داری کی بعض

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 76 (1,1)

صلاحیتیں بھی تھیں۔ وہ بات چیت میں بہت وضع دار اور ہوش مند تھا اور انتہائی بے تکلفی کے باوجود حفظِ مراتب کی کڑی حدود میں رہتا تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ اس شخص کو نہایت وسیع اور نہایت مکمل قسم کا سماجی تجربہ ہے اور اگر اس پر گھریلو ذمہ داری آن پڑے تو اس سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ میراجی مکمل طور پر سدھا ہوا نظر آتا تھا مگر شاید مکمل طور پر سدھا ہوا تھا نہیں، بلکہ حسبِ ضرورت مجبوری کی صورت میں اپنے آپ کو توڑ موڑ سکتا تھا، اپنے آپ پر قابو پا سکتا تھا۔

میراجی کو چاندنی رات سے محبت تھی۔ پونم کو وہ ہمیشہ اندھیری کے ساحل پر جایا کرتا تھا جہاں ناریل کے لمبے اور گھنے جھنڈ چڑھتے ہوئے سمندر کے خوفناک اور یکساں شور میں بہت ڈراؤنے اور پُراسرا معلوم ہوتے تھے۔ میراجی ان جھنڈوں سے پرے پانی کے قریب ٹھنڈی اور بھیگی ہوئی ریت پر لیٹ جایا کرتا تھا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کرتا تھا کہ میرے سر میں ریت ڈالو۔ چنانچہ اُس کے گھنے بال ریت کا ڈھیر ہو جاتے تھے اور وہ اسی طرح چپ چاپ گھنٹوں پڑا رہتا۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پھر دفعتاً وہ بال جھٹک کے کھڑا ہو جاتا اور گھر واپس آجاتا۔

ایک دفعہ جب میراجی چند دوستوں کے ساتھ اندھیری کے ساحل سے لوٹ رہا تھا تو ناریل کے جُھنڈ میں ایک ہیبت ناک آواز گونجی

''میراجی نے شراب چھوڑی ہے۔۔۔۔۔۔ایک رجعت پسند ٹوڈی ہے۔''

میراجی رُک گیا۔ غور سے دیکھا تو ایک سایہ سا ناریلوں کے تاریک سائے میں سے نکلا۔ قریب آنے پر ہم نے دیکھا کہ وہ نیاز حیدر تھا۔ نیاز حیدر اُس زمانے میں فلم سٹوڈیو میں مفت گیت لکھنے پر ملازم تھا۔ اُس کے صرف دو شغل تھے یا تو بیٹھ کر گیت لکھتا رہتا یا کوورلاج کے قریب سوروں کے ایک باڑے میں بیٹھ کر گھٹیا قسم کی دیسی شراب پیا کرتا۔ اس وقت وہ کسی دُور کے گاؤں سے پی کر آرہا تھا۔ اُس کو اِس بات پر بہت غصہ آتا تھا کہ میراجی نے شراب چھوڑ دی ہے۔ حالانکہ میراجی کو کہیں سے تنخواہ نہیں ملتی تھی اور اس کی اخلاقی شہرت نیاز حیدر سے بھی خراب تھی۔

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 77 (1,1)

میراجی کا شراب چھوڑ دینا واقعی حیرت ناک تھا مگر اس کی وجہ محض اقتصادی تھی۔ اگر وہ پی سکتا تو یقیناً پیتا۔ اس وقت بھی چھوڑنے کے باوجود شراب پینے میں میراجی کو کوئی اعتراض نہ تھا۔

شراب چھوڑنے کی فوری وجہ تو مجھے معلوم نہیں مگر اس سے کچھ روز قبل ایک ایسا حادثہ میراجی کے ساتھ پیش آچکا تھا جو اس فیصلے کی فوری وجہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اُس زمانے میں منٹو بھی بمبئی میں تھا اور میراجی بعض شامیں اُس کے ساتھ گزارا کرتا تھا۔ ایک دن میراجی پہنچا تو منٹو شراب پی رہا تھا۔ بوتل خالی ہو رہی تھی۔ میراجی کے لیے اُس میں سے آخری پیگ نکلا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میز پر ایک سالم ادّھار کھا تھا۔ میراجی نے قدرتی طور پر اُس پر نظر ڈالی۔ منٹو نے انکار کر دیا لیکن میراجی نے بوتل اُٹھالی۔ اِس پر منٹو نے اُسے بے تحاشا گالیاں دیں اور گھر سے نکال دیا۔ شاید اس بے عزتی کو میراجی نے شدت سے محسوس کیا۔

روپیہ حاصل کرنے کی خواہش میراجی کو بھی تھی۔ وہ بھی ایسے ڈھنگ سوچنے پر مجبور تھا جن سے ڈھیروں نہیں تو تھوڑا بہت روپیہ کمائے۔ لاہور اور دہلی کے زمانے میں میراجی نوکری وغیرہ کر کے روپیہ کما لیتا تھا۔ بمبئی میں اُس نے کوئی کام نہیں کیا یا اُس کو کام ملا ہی نہیں۔ وہ بڑے بڑے خواب تو دیکھتا نہیں تھا مگر تھوڑا بہت روپیہ پیدا کرنے کی خواہش کا ضرور اظہار کیا کرتا تھا۔ اِس خواہش کو پورا کرنے کے لیے اُس نے زیادہ تگ و دو نہیں کی۔ مگر سوچنے کی حد تک اُس نے بہت کچھ کیا۔ اس طرح سوچتے سوچتے ایک دن اُس نے کوورلاج میں اعلان کر دیا کہ میں بہت کامیاب دُکاندار ہوں۔

''کیسے میراجی!'' میں نے پوچھا۔

''آپ سیفٹی ریزر کتنے میں خرید سکتے ہیں؟'' میراجی نے پلاسٹک کا ایک سیفٹی ریزر دکھاتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس تو ہے میراجی۔۔۔۔!''

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 78 (1,1)

''نہیں اگر آپ کو خریدنا پڑے تو۔۔۔۔۔؟''

''تو یہ میں دس بارہ آنے میں خرید سکتا ہوں۔''

''ہم نے یہ ریزر ڈھائی آنے میں خریدا ہے۔ بتائیے کتنا منافع ہوا؟''

''سات آنے۔''

''سات آٹھ آنے فی ریزر'' میراجی نے کہا۔''اگر ہم ایسے پانچ ریزر بیچیں تو کتنا منافع ہوا۔ بہت منافع ہوانا! اور جہاں تک ہم جانتے ہیں ہم ایسے پانچ ریزر روزانہ فروخت کر سکتے ہیں۔''

میراجی اُس روز بہت خوش تھا۔ وہ دکان دار بننے کی سوچ رہا تھا کیونکہ اُس کی روپیہ کمانے کی دوسری تمام امیدیں ختم ہو چکی تھیں اور دکان داری کا خیال میراجی کی بے بسی کا بولتا ہوا ثبوت تھا۔ اس سے چند ہی دن پہلے میراجی انتہائی پریشانی کے عالم میں میرے پاس آیا تھا۔ میرے سامنے اپنی دو کتابیں پھینک کے بولا تھا:

''اِس میں سے ایسے گیت چُن دیجیے جو سمجھ میں آسکتے ہوں۔'' اور میں یہ مطالبہ سُن کر حیران رہ گیا تھا۔

''ہمیں ایک پروڈیوسر کو سُنانے ہیں۔'' میراجی نے کہا تھا''لوگ کہتے ہیں ہمارے گیت سمجھ میں نہیں آتے۔ آپ وچن دیں ورنہ ہم آپ کا آملیٹ بنا دیں گے۔''

''مگر میں کیوں وچن دوں میراجی!'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''اِس لیے کہ وہ پروڈیوسر بھی اتنا ہی جاہل ہے جتنے آپ ہیں۔ آپ کی سمجھ میں آ گئے تو اُس کی سمجھ میں بھی آجائیں گے اور ہمیں کام مل جائے گا۔''

اور اُس رات غالباً اضطراب کی وجہ سے میراجی نے''کرائم اینڈ مسٹری'' نہیں پڑھی۔ وہ اپنے گولوں پر پنیاں جماتا رہا اور میں اُن گیتوں پر نشان لگاتا رہا جو میری سمجھ میں آسکتے تھے۔ (2) مگر پروڈیوسر مجھ سے زیادہ جاہل نکلا اور اُس نے مدھوک سے گیت لکھوا لیے۔ چنانچہ اب میراجی نہایت سنجیدگی سے سیفٹی ریزر بیچنے کی سوچ رہا تھا۔

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 79 (1,1)

میراجی نے حاجت سے مجبور ہو کر ایک فلم میں ڈاکیے کا پارٹ بھی کیا اور اُس کے معاوضے میں پچاس روپے بھی پائے جن کی اُس نے شراب پی ڈالی۔ وہ شراب نہ پیتا تو روپے کہیں پھینک کے آجاتا کیونکہ اُسے روپے جیب میں رکھنے کی عادت نہ تھی۔ روپیہ اُس کے لیے ایک غیر مانوس چیز تھی جیسے سکے اُس کی جیب میں جلنے لگتے ہوں۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں اُس کے تن بدن میں آگ نہ لگ جائے، اِس لیے وہ جلد از جلد جیب خالی کر دیتا تھا۔

میراجی کو کبھی دولت مند بننے کی آرزو نہیں ہوئی۔ اُس کا روپے کا تصوّر بہت ہی مختصر تھا۔ وہ سِکوں کو نقرئی گول گول روٹیوں کی صورت میں سوچتا تھا۔ اُس کی انتہائے آرزو کُل گیارہ سو روپے تھی جو اُس کے ایک ہندو دوست نے دہلی میں ایک پٹھان سے قرض لے کر میراجی کو دیے تھے۔ میراجی کے اپنے بیان کے مطابق اُس کی سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ کسی طرح پٹھان کا قرض اُترے اور اُس کے دوست کی جان چھوٹے۔ میراجی کے خیال میں اُس کے سارے غم ختم ہو چکے تھے، صرف یہی ایک غم باقی تھا اور اس کو بڑی شدت سے محسوس کرنے کا اظہار کیا کرتا تھا۔ لیکن جب اُسے روپیہ ملتا تو شراب پیتے ہوئے اُسے اپنے ہندو دوست اور مہاجن پٹھان کا خیال بھی نہ آتا حتیٰ کہ آخری بوتل خالی ہو جاتی اور اگلے روز وہ آہ بھر کر کہتا:

''ہمیں صرف ایک غم باقی ہے۔''

میراجی کو روپے سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ البتہ کبھی کبھی اُسے ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ میں روپیہ خرچ کروں۔ ان لوگوں سے اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی جن کے پاس بہت روپیہ ہوتا ہے۔ لیکن اُسے مزدوروں اور کسانوں اور اُن لوگوں سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی جو سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ کا شکار ہوتے ہیں۔ اُس نے ان باتوں پر کبھی غور ہی نہ کیا تھا۔ لیکن اُس کے دوستوں کے حلقے میں بہت سے ترقی پسند اور کیمونسٹ ادیب تھے جن سے اُس کی روز ملاقاتیں ہوتی تھیں جو ادب کو تحریک سمجھتے تھے۔ میراجی اُن کا تمسخر اُڑاتا تھا۔ اِس تمسخر میں فلسفے یا دلیل کی نسبت ذاتیات کو زیادہ دخل ہوتا تھا مگر وہ بھی اِس صورت میں کہ میراجی کو اشتعال دلایا جائے ورنہ بات

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 80 (1,1)

ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ پر ختم ہو جاتی۔ اس سے بڑھ کر میراجی کو عوام یا عوام کے خادموں یا عوام کے دشمنوں سے کوئی واسطہ نہ تھا اور خواص تو کبھی اُس کے محل نظر ہوئے ہی نہیں۔

میراجی کو فنونِ لطیفہ سے گہری دلچسپی تھی۔ اگر چہ اس سلسلے میں اُس کی واقفیت محدود تھی۔ مصوّری کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا یا کم از کم اُس نے اس کا ذکر کبھی نہیں کیا۔ لیکن سنگ تراشی اور موسیقی سے اُسے بہت رغبت تھی۔ سنگ تراشی کو وہ فن کی حیثیت سے نہیں بلکہ اُس کے موضوعات کی وجہ سے پسند کرتا تھا۔ موسیقی میں البتہ اُسے بہت دل چسپی تھی۔ وہ بعض راگوں کی شکلوں، اُن کے تاثرات اور اُن سے وابستہ روایتوں سے واقف تھا۔ اُسے جے جے ونتی سے محبت تھی اور اِس راگنی کو وہ بڑے شوق سے سُنا کرتا تھا۔ اُس کا شوق سُننے اور لطف اندوز ہونے تک محدود تھا۔ فن کی جزئیات اور باریکیوں کو نہ وہ سمجھتا تھا نہ اُن کے سمجھنے کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔

میراجی نے اپنے آپ کو کسی طبقے سے منسوب نہیں کیا۔ اُس کو اپنی وحدانیت کا بہت زیادہ خیال تھا اگر چہ یہ وحدانیت وہ ادبی زندگی کے ابتدائی دور ہی میں منوا چکا تھا لیکن وہ اس پر قانع نہیں تھا۔ چنانچہ وہ نت نئی ترکیب سوچتا اور اُس پر عمل کرتا رہتا تھا۔ مجموعی طور پر وہ زندگی سے راضی تھا اور نامساعد حالات کو معمول سمجھتا تھا۔ اُس کو اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے چھوٹی چھوٹی امیدیں ہوتی تھیں لیکن وہ ان لوگوں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا تھا جنھوں نے اُس کی امیدیں پوری کی ہوں۔ وہ کسی کا ممنون نہیں ہوتا تھا نہ کسی سے اُس کو شکایت تھی۔ نہ اُس فلمی سیٹھ سے جس نے اُس کے گیت نہ سمجھے، نہ خیراتی ہسپتال کے اُس سخت بستر سے جس پر اُس نے دم توڑا۔

پھر ایک روز صبح سویرے بیدار ہوتے ہی بالکونی میں کھڑے ہو کر اُس نے اپنی پاٹ دار آواز میں کسی کو مخاطب کیے بغیر اعلان کر دیا:

''ہم آج پونا جا رہے ہیں۔''

''پونا جا رہے ہیں۔ پونا جا رہے ہیں۔'' یہ اعلان کو ورلاج کے در و دیوار سے ٹکرا کر گونجا۔

''میراجی پونا جا رہے ہیں۔'' کو ورلاج میں زیرِ لب چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور پھر وہ

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 81 (1,1)

بلند ہوتی گئیں۔

''آپ پونا جا رہے ہیں؟''کسی نے پوچھا۔

''ہاں، وہ بولا ہمارا یہی اِرادہ ہے۔''

''کیا پونا میں کام مل گیا؟''

''نہیں تو۔''

''کسی سے ملنے جا رہے ہیں؟''

''نہیں۔''

''کوئی ساتھ لے جا رہا ہے؟''

''فی الحال تو اکیلے ہی جا رہے ہیں۔''

''تو کرایہ۔۔۔۔کہیں سے روپیہ ملا ہے؟''

''نہیں تو۔''

اور جب وہ جانے لگا تو لوگ اکٹھے ہو گئے۔ وہ حیرانی سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بچوں کو اپنے گیند بلے بھول گئے۔ عورتوں کو گھونگھٹ نکالنا یاد نہ رہا۔ مرد پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگے۔ عرصہ دراز تک وہ اسی لاج میں رہا تھا لیکن کسی نے اُسے سمجھا ہی نہ تھا۔ کسی نے اُسے جانا ہی نہ تھا۔ لیکن اب وہ سب چلّا رہے تھے: ''تم جا رہے ہو۔ کیوں جا رہے ہو تم؟ کس طرح جا سکو گے تم۔۔۔۔۔؟'' اُن کی توجہ کا مرکز بننے پر اُس کی پُر اسراریت بڑھتی جا رہی تھی۔ پیشانی اور بھی تحکمانہ ہو گئی تھی۔ چہرے کی سنجیدگی میں رعب کا عنصر پیدا ہو چکا تھا جیسے لوگوں کی توجہ اُس کے لیے مسند بن گئی ہو اور وہ یوں کھڑا تھا جیسے رام بن باس کو جا رہے ہوں۔ لیکن اُس کے نچلے ہونٹ پر مسرت کی ایک دبی ہوئی کرن لرز رہی تھی جیسے وہ چوری چوری لذّت لے رہا ہو۔۔۔۔ لوگ چیخ رہے تھے، چلّا رہے تھے۔۔۔۔ مگر جب وہ جانے لگا تو اُس نے مُڑ کر بھی نہ دیکھا۔

۱۔ بہت کریدنے کے بعد احمد بشیر نے مجھے بتایا کہ وہ عورت عصمت چغتائی تھی (یونس جاوید) (جو ملے تھے راستے میں)

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 82 (1,1)

اخلاق احمد دہلوی

میرؔاجی کا اخلاق

تقریباً دس برس پہلے جب میں لاہور میں پہلی دفعہ میرؔاجی سے ملا تو میں اُنھیں دیکھ کر ڈر گیا۔ مَیں نے اِس سے پہلے اِس ہیئت کا کوئی شاعر یا ادیب نہیں دیکھا تھا۔ ہم لوگ دِلّی سے تفریحاً لاہور آئے تھے۔ شاہد صاحب، محمد مرزا صاحب دہلوی، ظفر قریشی صاحب اور ڈی اشرف صاحب۔ جب ہم ''ادبی دُنیا'' کے دفتر میں مولانا صلاح الدین صاحب اور میراجی سے ملنے کے لیے پہنچے تو ''ادبی دُنیا'' کے دفتر میں کوئی نہ تھا۔ صرف ایک عجیب وغریب حُلیے کا آدمی ایک کرسی پر ''اُردو'' میں بیٹھا کتابت کر رہا تھا۔ یہ بہت بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شخص ہمیشہ ہی کُرسی پر ''اُردو'' میں بیٹھا کرتا تھا یعنی پاؤں اُٹھا کر۔۔۔۔۔۔۔اُکڑوں۔۔۔۔!

شاہد صاحب نے اس غیر معمولی کاتب سے کہا ہمیں مولانا صلاح الدین صاحب سے ملنا ہے۔ کاتب نے جواب میں اِس طرح کھڑے ہونے کی کوشش کی کہ ہم سب کا جی چاہا کہ اُسے سہارا دیں، کہیں گر نہ پڑے لیکن کاتب فوجیوں کی طرح سیدھا کھڑا ہو گیا اور ایک خاص ''کھرج دار'' آواز کمرے میں گُونجی: ''معاف فرمائیے صلاح الدین صاحب اِس وقت دفتر میں نہیں ہیں۔''

مجھے آج تک یاد ہے، ہم سب یہ آواز سُن کر کچھ مرعوب سے ہو گئے تھے۔ شاہد صاحب بَمُشکل تمام یہ کہتے ہُوئے سُنائی دیئے۔۔۔۔''اور میراجی!۔۔۔۔

جواب ملا۔۔۔۔''یہ خاکسار ہی ہے''۔ ہم میں سے کسی کو یقین نہ آیا۔ اس ''چیز'' کو بھلا میرؔاجی کیسے سمجھ لیتے۔۔۔۔۔؟ اِتنا مشہور شاعر اور یہ وضع۔۔۔۔۔۔میرؔاجی نے کچھ جاپانی طریقے پر جھک کر ہم سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میری کیفیت اُس وقت بالکل اِس قسم کی تھی جیسے مُجھ پر کوئی ''ہپناٹزم'' کا عمل کر رہا ہو۔۔۔۔''تو آپ۔۔۔۔آپ ہیں میراجی!'' میری آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔''جی''!! بہت ہی کراری آواز میں جواب ملا۔ ظفر قریشی صاحب نے کچھ مصرع سا اُٹھانے کی کوشش

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 83 (1,1)

کی۔۔۔۔"یہ آپ نے گرمیوں میں گرم کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں؟" شاہد صاحب نے شاید نثر میں گرہ لگائی۔۔۔۔۔"گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔" مرزا صاحب نے اپنے خاص انداز میں قہقہہ سر کیا۔ اور ہم سب کو اِس "سوشل" قہقہے میں شرکت کرنی پڑی۔ میرا جی بھی مصنوعی انداز میں ہنسے۔ کُچھ عرصے بعد پتہ چلا کہ میرا جی کو ہنسنا آتا ہی نہ تھا، وہ دوسروں کو ہنسا سکتے تھے۔۔۔۔!! اِس سوشل قہقہے کے خاتمے پر میرا جی نے بتایا کہ اُن کے پاس ٹھنڈے کپڑے سِرے سے ہیں ہی نہیں۔۔۔! گرمی جاڑے یہی لبادہ پہنتے ہیں، کیا واہیات ہے، مرزا صاحب اپنی روز مرّہ پر اُتر آئے تھے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کسی کے پاس گرمیوں کا لباس نہ ہو۔ میرا جی نے بہت ہی جمے ہُوئے لہجے میں جواب دیا۔۔۔۔"ہوسکتا ہے۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مولانا صلاح الدین صاحب اور اُن کے ساتھ کُچھ اور حضرات کمرے میں داخل ہُوئے۔ صلاح الدین صاحب نے بہت خُوش ہو کر شاہد صاحب سے مصافحہ کیا۔ ہم سب کھڑے ہو گئے۔ صلاح الدین صاحب نے باقی حضرات کا تعارف شاہد صاحب سے یُوں کرایا: "آپ ہیں حفیظ صاحب ہوشیار پوری، کرشن چندر صاحب، اُپندر ناتھ صاحب اشکؔ اور راجندر سنگھ بیدیؔ صاحب۔" میرا جی نے آنے والے حضرات کی طرف رُخ کیا اور با آوازِ بلند کہا: "شاہد احمد صاحب دہلوی مدیر ماہنامہ "ساقی" دِلّی" اور پھر کہا "معاف فرمائیے باقی حضرات سے مَیں ابھی خُود واقف نہیں۔" شاہد صاحب نے ہم سب کا تعارف کرایا اور پھر میرا جی سے پُوچھا "آپ کو کیسے معلوم ہُوا کہ میں شاہد ہوں؟" جواب ملا "آپ کی صورت شاہد ہے! میں نے آپ کی تصویریں دیکھی ہیں اور شاید آپ کی بھی۔" مرزا صاحب کی طرف میرا جی نے اشارہ کیا۔ "آپ کی کتاب "اتا تُرک" حال ہی میں ریویو کے لیے آئی ہے۔ آئندہ اشاعت میں مَیں "اتاترک" پر ریویو لکھ دوں گا۔" مرزا صاحب کی کچھ تیوری چڑھ گئی۔ مرزا صاحب جیسے بہترین لباس پہننے والے مصنّف پر وہ شخص ریویو کرے جس کے پاس گرمیوں کا لباس تک نہ ہو۔ یہ اُنھیں اپنی ایک طرح سے توہین معلوم ہوئی اور پھر سب باتوں میں لگ گئے۔ مرزا صاحب نے ایک "قدآدم" سگار سُلگایا اور ادب

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 84 (1,1)

کے تجارتی پہلوؤں پر روشنی پڑنے لگی۔ شاہد صاحب! وہ ''شریر بیوی'' کی نئی کاپیاں آپ نے لکھوا لیں۔۔؟ اُپندر ناتھ اشک بولے ''کونپل'' کے تو ''پروف'' اب تیار ہو گئے ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ دو ہزار ہی چھپوائیے اور پھر بڑی دیر تک دو ہزار، ایک ہزار، اشتہارات ''پروف''، لیتھو پرنٹنگ کی مشکلات اور ایسے ہی غیر دلچسپ مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔

یکا یک سب نے میراجی کو یہ کہتے سُنا: ''حضرات! شری اُپندر ناتھ اشکؔ اپنی کویتا سُنائیں گے۔ جیسے ریڈیو پر اعلان کیا گیا ہو اور اشکؔ صاحب بلا تکلّف شروع تھے۔

''ہم ملے مجھے معلوم ہُوا تم چڑیا ہو چُوں چُوں کرتی، اُڑ جاتی۔۔۔۔۔ اور ہم ملے، مجھے معلوم ہوا تم ندی ہو، بل کھاتی، لہراتی'' وغیرہ۔ میراجی نے پھر اعلان کیا: ''صاحبو! میں خودکُشی کرنا چاہتا ہوں۔''! معاف فرمائیے میرا ''موڈ'' یکا یک خودکُشی کا ہو گیا ہے! یہ نعرہ سُن کر سب دَھم ہو گئے۔ شاہد صاحب برجستہ بولے ''کیا اشکؔ صاحب کی ''کویتا'' آپ کو اِتنی ناگوار گزری۔۔۔'' ''جی نہیں''۔ میراجی نے کہا: ''درحقیقت آج کل میں یورپ کے قتل کے مقدمات کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ میرے پاس سینکڑوں ایسے اشخاص کی تصویریں جمع ہیں جنھوں نے بڑے پُر اسرار طریقے سے قتل کیے لیکن یورپ اور امریکہ کی پولیس نے اُن قاتلوں کا کھوج لگا لیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں دُنیا میں اپنے سوا کسی کو قتل نہیں کرسکتا۔ تاکہ بعد میں پولیس میرا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ مَیں وصیت کرتا ہوں کہ میری لاش کا ''تجزیہ'' کسی اچھے ہسپتال میں اعلیٰ درجے کے ڈاکٹروں کے ہاتھوں کرایا جائے۔'' ظفر قریشی نے ذرا بے تکلّف ہو کر کہا: ''میراجی! آپ پر اس وقت یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ آپ کی یہ گفتگو تقریباً بے موقع سی ہے۔'' میراجی نے کہا ''آپ نے یہ ''سی'' لگا کر اپنے دِلّی والے ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ مَیں نے آپ کے افسانے پڑھے ہیں۔ آپ کی تحریر میں ''دہلویت'' اِتنی نہیں ہے لیکن بات چیت سے آپ پُورے دِلّی والے معلوم ہوتے ہیں۔'' ظفر قریشی نے کہا ''میں بھی کبھی کچھ عرصے آپ کے لاہور میں ''ادبی دُنیا'' کے اِدارے میں کام کرتا رہا ہوں مولانا تاجورؔ کی نگرانی میں، آپ سے مل کر اور بھی خوشی ہوئی۔'' میراجی نے کہا: ''لیکن معاف

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 85 (1,1)

فرمائیے گا آپ کی یہ گفتگو بھی کچھ بے موقع ''سی'' ہے۔'' میرا جی نے ''سی'' پر کچھ اِس طرح سے زور دیا کہ سب ہنس پڑے۔ پھر حفیظؔ صاحب ہوشیار پوری سے درخواست کی گئی۔ حفیظؔ صاحب نے غزل سنائی اور اب خود میرا جی کی باری تھی۔ کہنے لگے ''معاف فرمائیے حضرات! میں گاؤں گا۔ کیونکہ اکثر لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ''بلینک ورس'' اور ''فری ورس'' کو گایا نہیں جا سکتا۔'' شاہد صاحب یکا یک میرا جی کی طرف سب سے زیادہ متوجہ ہو گئے۔ کیونکہ اُنھیں موسیقی اور ادب دونوں سے برابر کا لگاؤ ہے۔

میرا جی نے گانا شروع کیا۔'' جے جے ونتی'' شاہد صاحب نے فوراً حاضرین سے راگ کا تعارف کرایا اور میرا جی گاتے گاتے رونے لگے۔ سب کو حیرت تھی کہ یہ روئے کیوں۔۔۔۔؟ کیا اِس لیے کہ ان کی نظم کی صحیح داد نہ مل سکی۔ میں نے جلدے سے اُن کا دل رکھنے کے لیے کہا'' بہت اچھی نظم تھی'' اور میرا جی بچوں کی طرح روتے روتے ایک دم خوش ہو گئے اور پھر خُود ہی کہا'' مجھے جے جے ونتی راگ بہت پسند ہے!! یہ جب میں خود گاؤں یا کسی اور سے سُنوں تو مُجھے رونا آجاتا ہے۔ آپ لوگ گھبرائیں نہیں۔'' چائے وغیرہ پی گئی۔۔۔۔ اور پھر ملنے کے'' وعدے وعید'' ہو کر محفل برخاست ہو گئی۔

مرزا صاحب نے باہر نکل کر کہا'' یہ شخص پاگل تھا۔'' شاہد صاحب بولے:'' میں نے بھی اِتنا عجیب وغریب آدمی آج تک نہیں دیکھا۔'' ظفر صاحب نے کہا'' بعض لوگ جان بوجھ کر بنتے ہیں۔ مُجھے یہ سب STUNT معلوم ہوتا ہے۔ FRAUD یہ شخص دیوانہ ہرگز نہیں اور مجھ سے مارے ڈر کے کوئی بات ہی نہ ہو سکی۔ قتل کے مقدموں کا مطالعہ، خودکُشی کا اِرادہ، کسی راگ سے کوئی خاص اثر لینا، یہ سب باتیں میرے دماغ میں گھوم رہی تھیں اور میرا جی کی شخصیت کی ایک ہیبت سی مُجھ پر طاری ہو کر رہ گئی۔

لاہور کی اِس ملاقات کے پُورے ایک برس بعد میرا جی دِلّی آئے۔ شاہد صاحب کے مکان پر اور کُتب خانہ علم وادب پر اکثر یہ آتے اور خوب جی بھر کر باتیں کرتے۔ دِلّی میں شام کو کُتب

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 86 (1,1)

خانہ علم و ادب پر اکثر ادیبوں کا مجمع رہتا تھا۔ شاہد صاحب، سید انصار ناصری، ظفر قریشی صاحب، صادق الخیری صاحب، تابشؔ صاحب دہلوی، فضل حق قریشی دہلوی، صلاح الدین قریشی صاحب دہلوی، مرزا فہیم بیگ چغتائی مرحوم، اشرف صبوحی صاحب دہلوی، محمد مرزا صاحب اور پیر ولایت حسین صاحب حمار دہلوی مستقل آنے والوں میں سے تھے۔ ان کے علاوہ کہیں سے بھی کوئی ادیب یا شاعر آتا تو یہ ممکن نہ تھا کہ وہ بغیر کتب خانہ پر پھیرا کیے دہلی سے واپس چلا جائے۔ میرآجی بھی یہاں روز شام کو آنے لگے۔ شروع شروع میں اُن کی باتیں کچھ سمجھ میں نہ آئیں لیکن کچھ عرصہ بعد یہ ہر دلعزیز ہونا شروع ہوئے اور رفتہ رفتہ بہت قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔ حد یہ کہ محمد مرزا دہلوی بھی انھیں پسند کرنے لگے۔ کبھی کبھی ان کے لباس پر اُن کو اعتراض ہوتا تھا لیکن میرآجی کی ذہانت اور بے پناہ خلوص کا لوہا وہ ضرور ماننے لگے۔ ظفر قریشی صاحب جنھوں نے پہلی ملاقات میں میرآجی کو STUNT اور FRAUD گردانا تھا اب اُن کا دم بھرنے لگے تھے۔ ظفر صاحب سے اور مجھ سے میرآجی کی خاص دوستی ہوگئی۔ وجہ یہ کہ باقی حضرات میرآجی کی نجی زندگی سے کچھ زیادہ مطمئن نہ تھے۔ میرآجی کی ظاہری شخصیت کی ہیبت میرے دل سے کم ہوگئی۔ اب میں زیادہ وقت اُن کے ساتھ رہنے لگا۔

ایک مرتبہ کسی نے کہا ''تعجب ہے شاہد صاحب شراب نہیں پیتے۔'' جواب میں جوش ملیح آبادی کا یہ شعر پڑھا گیا:

''ساقی'' کے مُدیر اور مئے ناب سے دور
برعکس نہند نام زنگی کافُور

میرآجی نے گلاس اُٹھا کر کہا: ''جوشؔ اور شاہد کے لیے۔'' اسرار الحق مجاز، جاں نثار اختر، ایم اے لطیف بی۔اے، اسلام الدین اور شوشنکر سنگھ ٹھاکر نے جنھیں اختصار کی وجہ سے ''تھری'' ایس ٹھاکر کہا جاتا تھا، میرآجی کے ساتھ اپنے اپنے گلاس بلند کیے اور سب نے مِل کر جوش ملیح آبادی اور شاہد احمد دہلوی کا جامِ صحت پیا۔

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 87 (1,1)

میرآجی تقریباً چھ برس تک باقاعدہ دِلّی میں رہے اور دِلّی کے ادیبوں سے لے کر، دِلّی کے تانگے والوں اور فقیروں تک سے یکساں خلوص کے ساتھ ملتے رہے۔ وہ انسان انسان میں فرق کرنا نہیں جانتے تھے۔ کہتے تھے "گاندھی جی چاہے "بھنگی کولونی"، میں رہیں یا بھنگی "گاندھی کولونی میں، میرے لیے سب برابر ہے۔" کبھی کبھی زیادہ نشے کی حالت میں وہ ایک شکایت اکثر کرتے تھے کہ "میری والدہ میری مادری زبان سے ناواقف ہیں۔" وہ کہتے تھے "میری مادری زبان اُردو ہے۔" اِس صدمے سے وہ کبھی کبھی رونے لگتے اور یہ بھی کہتے تھے کہ تم دیکھو گے کہ میں آخر میں بنگال چلا جاؤں گا۔ "بنگلہ" بڑی میٹھی بھاشا ہے مگر میں بنگال میں اُردو رائج کرنا چاہتا ہوں۔"

میرآجی کی تین مستقل محبوبائیں تھیں، "میرا سین" وہ بنگالن لڑکی جو ایف۔ سی کالج لاہور کی طالبہ تھی اور جس کی وجہ سے اُنھوں نے اپنا نام تبدیل کیا۔ اُردو زباب جو اُن کا اوڑھنا بچھونا تھی اور "انگلش پکچر" جس کے دیکھنے کا اُن کو بچپن سے شوق تھا۔ میرا سین کے لیے میں نے مستقل کا لفظ یوں استعمال کیا ہے کہ میرآجی نے دِلّی میں دو اور لڑکیوں سے بھی عشق کیا۔ جی ہاں، عشق۔۔۔۔! جن میں سے ایک کو وہ اپنے طور پر پیار سے بلی خانم اور دُوسری کو پیار سے بدلی یا بادلی بیگم کہا کرتے تھے۔ میرآجی کہتے تھے "عشق ایک پل کا بھی ہوسکتا ہے اور ایک عمر کا بھی۔ عمر کے مختلف حِصّوں میں مختلف افراد سے محبت ہوسکتی ہے مگر بعض نقش بہت گہرا بیٹھتا ہے اور وہ نقش ایک بنگالن ہی کا ہوسکتا ہے۔" ان دونوں لڑکیوں میں میرآجی کو اپنی مستقل محبوبہ میرا سین کے کچھ نقوش ملتے تھے۔ میرآجی کی صحت پر ان لڑکیوں کے عشق کا کافی بُرا اثر پڑا۔ وہ اور زیادہ شراب پینے لگے۔ اکثر نشے کی حالت میں وہ یہ شعر پڑھتے اور روتے روتے اُن کی ہچکی بندھ جاتی:

ہرگز نہ کیجو اُن سے محبّت تُو مصحفیؔ
ظالم غضب کی ہوتی ہیں یہ دِلّی والیاں

جب میرآجی اپنی دانست میں سمجھ لیتے کہ تخلیہ ہوگیا تو اپنے گلے کی ہندوانی

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 88 (1,1)

مالائیں گریبان سے نکال کر اور اُن مالاؤں کے ایک ایک دانے پر میرؔا، میرؔا پڑھتے اور بالکل اس آسن میں ہو بیٹھتے جس طرح سادھو گیان دھیان میں بیٹھتے ہیں۔ کبھی کبھی میرؔا کے بھجن بھی گاتے تھے۔ اُن کا مطالعہ مذہبیات، جنسیات اور نفسیات پر بے پناہ تھا۔ HINDU MYTHOLOGY سے اُنھیں خاص شغف تھا۔ شاید اِس لیے کہ اُن کی محبوبہ ''کافر'' تھی۔ میرؔا جی خود لاڈ میں کبھی کبھی میرؔا سین کو ''کافر'' کہا کرتے تھے۔ اُن کے پاس میرؔا سین کی ایک تصویر تھی جو کسی کالج میگزین میں سے اُنھوں نے تراش لی تھی اور میرؔا سین کی ایک حساب کی کاپی جو کسی دن کالج جاتے وقت شاید بے کار سمجھ کر اُس نے پھینک دی تھی۔ میرؔا جی اکثر جنون کی حالت میں اس کاپی کو آنکھوں سے لگاتے اور ''گھنٹوں'' میرؔا سین کی تصویر ایک پُرانے آئی گلاس سے دیکھتے۔ اِس شیشے کی وجہ سے شکل بڑی معلوم ہونے لگتی اور میرؔا جی اکثر اِس حالت میں نظمیں کہتے۔ پچاسیوں نظمیں اِسی کیفیت میں میرؔا جی نے کہیں۔ میرؔا جی ہر نظم شروع کرنے سے پہلے کاغذ پر دیوناگری خط میں ''اوم'' لکھت۔ ایک طرف تو ''اوم'' سے اُنھیں کچھ ایسی عقیدت تھی کہ اپنے دستخط بھی کبھی بغیر ''اوم'' لکھے نہ کرتے اور دوسری طرف یہ عالم بھی دیکھنے میں آتا کہ قاری زاہر القاسمی سے بالکل تخلیہ میں قرآن شریف سُنتے اور روتے۔

اپنے دِلّی کے قیام میں میرؔا جی نے جب کوئی نظم لکھی شائع ہونے سے پہلے ہم لوگوں کو سُنائی۔ ہم لوگوں سے یہاں میری مُراد ہے تھری ایس ٹھاکر، اسلام الدین، ایم اے لطیف بی۔اے اور میں۔ میرؔا جی کہتے تھے ''یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ ایک شخص پہلے ایم۔اے ہو اور پھر بی۔اے۔ ایم۔اے لطیف بی۔اے، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے ہم وطن تھے اور تقریباً آٹھ نو سال یورپ میں یوں ہی ہُش کُڈ اپھرنے کے بعد واپس آگئے تھے۔ لباس اور صورت شکل سے انگریز نژاد معلوم ہوتے تھے لیکن اطوار و عادات کے لحاظ سے اِس قدر دیسی کہ ولایتی شراب پینے میں تکلّف برتتے۔ میرؔا جی سے اُنھیں عشق تھا۔ ذرا ہکلا کر بولتے تھے۔ اِسی لحاظ سے میرؔا جی کہا کرتے تھے کہ اگر KING'S ENGLISH سُننی ہو تو ایم۔اے لطیف بی۔اے سے مِلو۔

اے یہ زمانہ جارج ششم کا تھا اور وہ ہکلا کر بولتے تھے

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 89 (1,1)

اکثر اپنے مُلاقاتیوں سے اسی طرح اُن کا تعارف کراتے۔ اُنھیں کی وجہ سے میرآجی نے فلم کا رُخ کیا۔

ہم لوگ اکثر یہ سوچا کرتے تھے کہ کیسے کوئی ایسی فلم کمپنی ڈھال لیں جس میں اپنی مرضی کی فلم بنائیں۔ روپے کا سوال نہ تھا کیونکہ روپیہ ٹھاکر کے پاس تھا لیکن ایک مشکل یہ تھی کہ ٹھاکر کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اور اُن کے چچا ٹھاکر کے ولی اور شملے کے ہوٹلوں کے نگران تھے۔ اور ٹھاکر ہر سال ہوٹلوں کی آمدنی کا لاکھوں روپیہ وصول نہ کر سکتے تھے کہ اُن کے چچا رقم کا کچھ ایسا حساب لگا کر ایس ایس ٹھاکر کو دیتے جس کا حاصل جمع آٹھ ہوتا اور اُس آٹھ کے چکر نے ٹھاکر کو تباہ کر رکھا تھا۔ وہ ایسی رقم لینے سے ہمیشہ انکار کر دیتے جس کا حاصل جمع آٹھ ہو۔ نتیجہ یہ کہ ٹھاکر کی مالی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ صرف اپنے دِلّی والے ہوٹل کے ایک کمرے میں وہ خود رہتے اور کھانے پینے کی طرف سے اُنھیں قدرے بے فکری تھی۔ سامان ٹھاکر کے پاس مطلق نہیں تھا۔ یعنی بستر تک ندارد۔ صرف تن کے کپڑے اور اُن کا بھی یہ حال کہ روز صبح جب غسل خانے جاتے تو کپڑے اُتار کر دھوبی کو دیتے اور جب تک ہوٹل کا دھوبی اُنھیں دھو سُکھا کر اور استری کر کے واپس نہ لاتا غُسل خانے میں بیٹھے سگڑا کرتے اور اخبار پڑھتے۔ کبھی کوئی ایسی رقم اگر اُن کو ملتی جس کا حاصل جمع آٹھ نہ ہوتا تو اُسے فوراً ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے۔ ٹھاکر کو آٹھ کا جنون یہاں تک تھا کہ سائیکل پر کبھی نہ بیٹھتے کیونکہ اس کے دونوں پہیّے مل کر آٹھ کے ہندسے کی شکل بن جاتے ہیں اور کیپسٹن سگریٹ کو کبھی ہاتھ نہ لگاتے کیونکہ کیپسٹن سگریٹ کو سترہ میڈل انعام کے مل چُکے تھے اور سترہ کا حاصل جمع آٹھ ہوتا ہے۔ ٹھاکر کی انھی اداؤں نے میرآجی کا دل موہ لیا تھا۔

ایک دن ہم سب فلم کمپنی ہی کی دُھن میں کہیں جا رہے تھے، راستے میں سڑک کے ایک سُنسان کنارے پر ایک سادھو بھبھوت ملے آٹھ کا ہندسہ بنا پڑا تھا۔ ٹھاکر کی چیخ نکل گئی۔ ہم لوگ قریب پہنچے، آٹھ کے ہندسے میں کوئی جُنبش نہ ہوئی۔ اسلام الدین نے اُس سادھو کو ٹٹول کر دیکھا۔ میرے مُنہ سے نکلا: ؎

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 90 (1,1)

کُریدتے ہو جو اَب راکھ، جُستجو کیا ہے

میراجی سر پکڑ کر سادُھو کے سرہانے بیٹھ گئے۔ایم۔اے لطیف بی۔اے نے کہا:

''فی الحال ہم فلم کمپنی کا مسئلہ ملتوی کرتے ہیں۔ان صاحب کی تکفین کا کام مقدم ہے۔

میراجی نے کہا:''سب سے پہلے ہمیں اِس کی لاش پر آنسو بہانے ہیں کیونکہ اِس بوڑھے کی موت پر دو آنسو بہانے والا بھی یہاں نظر نہیں آتا۔تھوڑی دیر بعد جوں توں کر کے سادھو کی اوّل منزل کا انتظام ہوسکا اور ہم لوگ اس بے کسی کی موت سے نڈھال ہو کر ایک قریب کے میکدے میں جا بیٹھے۔ میراجی نے گلاس اُٹھایا اور کہا:''اُس بُڈھے کے لیے جس کی لاش پر کوئی رونے والا نہ تھا۔''سب نے اپنے اپنے گلاس میراجی کے گلاس کے ساتھ بلند کیے اور زہر مار کر لیے۔

میراجی نے کہا:''میں آج کسی ظالم افسر کا''آملیٹ'' نہیں بناؤں گا۔آج مجھے اپنا ہی ''آملیٹ'' بنانا ہے۔''اور ہم سب کے روکتے روکتے میراجی نے اپنا''آملیٹ'' بنانا شروع کیا۔ اسلام الدین بمشکل میراجی کے ہاتھ سے وہ لوہے کے گولے چھین سکے جو میراجی ہر وقت اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے اور جن سے وہ اکثر خود سر افسروں کا آملیٹ بنایا کرتے تھے۔یہ گولے وہ تھے جو مداری بازی گری کے وقت اپنے مُنہ سے نکال کر لوگوں کو دکھاتا ہے۔خدا معلوم یہ میراجی کے ہاتھ کہاں سے لگے۔ان گولوں پر سگرٹوں کی پنّی تہ بہ تہ چڑھی رہتی تھی اور دُور سے یہ چاندی کے معلوم ہوتے تھے۔اگر ان میں سے ایک گولہ کبھی اِدھر اُدھر ہو جاتا تو میراجی بے چین ہو جاتے۔ان گولوں کو وہ خود''فہم کے انڈے'' BALLS OF WISDOM کہا کرتے تھے۔گولے چھن جانے سے میراجی کچھ بے دست و پا سے ہو گئے اور گلاس اُٹھا کر اپنے چہرے پر پوری طاقت سے مارا۔سارا چہرہ لہولہان ہو گیا اور اب اُن پر پورا پورا خودکشی کا موڈ طاری ہو چکا تھا۔یہ وقت ہم لوگوں کے لیے بہت آزمائش کا ہوتا تھا کیونکہ اس قسم کی کیفیت جب اُن پر طاری ہوتی تو پھر وہ کسی کی بات نہ سُنتے اور اپنا سر دیواروں سے ٹکراتے،اور سچ مچ خُودکُشی کر لینے پر تُل جاتے۔ اسلام الدین ایسے موقعوں پر سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہوتے اور اِس مرتبہ بھی ہمت کر کے

D 1/11/2025 2:59 PM PAGE 91 (1,1)

اسلام الدین ہی نے اُنھیں روکا۔ میں نے کہا: ''اگر یہی لیل ونہار ہیں تو پھر ہم سب کو صحرا میں نکل جانا چاہیے کیونکہ غالب کی اطلاع کے مطابق وہاں کوئی دیوار نہیں۔'' ٹھاکر نے کہا ''مگر یہ گولے! ان کا کیا علاج ہے'' اور ہم سب جیسے قائل سے ہو گئے اور پھر شہر ہی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ یوں کہنے کو میرآجی پطرس صاحب کے INTLLECTUAL GROUP میں بھی شرکت کرتے۔ شاہد صاحب کی بزمِ تہذیبِ ادب میں شامل ہوتے، نواب خواجہ محمد شفیع دہلوی کی محفلِ ادب میں بھی اپنی نظمیں سناتے اور دِلّی میں حلقۂ اربابِ ذوق کی شاخ کے جلسوں کو بھی حتّی الامکان کامیاب بناتے۔ جس کے رُوحِ رواں اُن دِنوں دِلّی میں ہز ایکسی لینسی محمد خلیل الرحمٰن، مختار صدیقی، مسعود الحسن تابشؔ دہلوی، اعجاز بٹالوی اور ضیاء جالندھری تھے۔ لیکن شاید روحانی سکون اُنھیں ہم لوگوں ہی میں میسّر آتا۔ شروع شروع میں دِلّی میں راشدؔ صاحب نے اُن کے بہت ناز نخرے اُٹھائے۔ راشدؔ صاحب کے ایران جانے کے بعد میرآجی کی حالت بہت نازک ہوگئی اور تقریباً ہر روز ہی خُودکشی کا موڈ اُن پر سوار رہنے لگا۔ کچھ عرصے تک محمود نظامی صاحب نے اُنھیں سنبھالے رکھا۔ لیکن راشدؔ صاحب کی یاد اُن کے دل سے محو نہ ہوسکی۔ میرآجی راشدؔ صاحب کی آواز سُنتے اور کہتے ''دوست چلا گیا۔'' ن۔م راشد صاحب کے ایران جانے کے کچھ عرصے بعد میں ایک دفعہ کوئی رات کے تین بجے کے قریب شاید کسی تھیٹر سے واپس آرہا تھا کہ بیچ چاندنی چوک میں دِلّی کی اس مشہور سڑک کے سب سے ''اہم چوراہے'' پر فوارے کے سامنے میں نے دیکھا کہ ایک آدمی بے سُدھ پڑا ہے۔ محض اِس خیال سے کہ کہیں کوئی فوجی ٹرک اس شخص کو کچلتی ہوئی نہ گزر جائے، میں قریب پہنچا اور چاہا کہ اس شخص کو اُٹھا کر کسی دوکان کے تختے پر لٹا دوں۔ نزدیک پہنچ کر پاؤں تلے کی زمین سرک گئی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ آپ ہیں۔! ایک ٹانگہ قریب سے گزرا، میں نے تانگہ ٹھہرایا اور تانگے والے نے اور میں نے مل کر اُنھیں تانگے میں ''بھروایا''، سوار کراتے وقت تانگے والے کی نظر اُن کے چہرے پر پڑی اور اُس نے چیخ کر کہا: ''ارے بابو جی۔۔۔!! میں نے پوچھا ''کیا تم اِنھیں جانتے ہو؟'' وہ بولا ''جی ہاں۔۔۔ ایک دفعہ بابو جی نے اتنی سی دُور کے مجھے سو

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 92 (1,1)

روپے دیے تھے۔ کہا تھا: ''جا بچہ تیرا کلیان ہو۔'' آج بھی معلوم ہوتا ہے بہت پی رکھی ہے۔ میں اِن بابو جی کا گھر جانتا ہوں، بنگش کے پُل پر رہتے ہیں۔'' میں نے کہا: ''تو پھر چلو بابُو جی کو گھر پہنچانا ہے۔ لیکن آج تمھیں ایک ہی روپیہ ملے گا۔ کیونکہ میرے پاس اِس وقت صرف ایک ہی روپیہ ہے۔'' تانگے والے نے کہا: ''حضور! آپ کیسی باتیں کرتے ہیں؟ آپ ایک پیسہ بھی نہ دیجیے'' اور تانگہ بنگش پُل کی طرف ہانک دیا۔

میں نے میرآجی کو گھر پہنچایا۔ تالے کُنجی کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔ گھر کا دروازہ کُھلا پڑا تھا۔ اندر ایک کمرہ تھا جس میں کتابوں اور رِسالوں کا بے ترتیب انبار لگا ہُوا تھا۔ نہ تکیہ نہ بستر، نہ اوڑھنا نہ بچھونا۔ مَیں نے میرآجی کی جیبیں ٹٹولیں، چار سو (۴۰۰) روپے ابھی باقی تھے۔ خدا معلوم یہ کس طرح بچ گئے۔ شاید انھیں سڑک پر اُچھالنے سے پہلے یہ بے ہوش ہو گئے کیونکہ یہی ان کی عادت تھی۔ اکثر میرے علم میں ان کے مجموعوں کے انھیں سات سات سو، آٹھ آٹھ سو روپے ملے، لیکن دوسرے ہی دن میں نے میرآجی کو کوڑی کوڑی کا محتاج پایا۔ پینے پلانے کے بعد جو کچھ بچتا وہ چپڑاسیوں، بھنگیوں اور تانگے والوں میں بانٹ دیتے اور پھر بھی اگر کچھ روپے بچ رہتے تو اُنھیں سڑک پر اُچھال دیتے اور خالی ہاتھ گرتے پڑتے گھر جا کر سو جاتے۔ چار سو روپے مَیں نے اُن کی جیب سے نکال کر احتیاطاً اپنے پاس رکھ لیے۔

دُوسرے دن میرآجی سے حسبِ معمول ملاقات ہوئی، میں نے پوچھا ''رات آپ گھر کیسے پہنچے؟'' کہنے لگے ''جیسے روز پہنچتا ہوں۔'' میں نے پُوچھا ''آپ کا کل رات کچھ نقصان تو نہیں ہوا؟'' میرآجی نے کہا ''فقیر کے پاس رکھا ہی کیا ہے؟ ہاں البتہ یہ یاد نہیں آتا کہ کل شام جو نئے مجموعے کی رقم مجھے ملی اُس کا کچھ حصّہ گھر منی آرڈر کیا یا نہیں؟'' میں والدہ کو کچھ روپے بھیجنا چاہتا تھا۔'' میں نے پوچھا ''کتنے روپے ملے تھے؟'' کہا: ''کچھ یاد نہیں آتا، بہر حال اچھی خاصی رقم شاہدؔ صاحب نے دی تھی۔ پانچ ہزار، چھ سو، چھبیس روپے، چھے آنے، چھ پائی۔'' اور پھر اپنی آواز میں اپنے ہی انداز کا جھٹکا پیدا کر کے کہا ''چھوڑو، روپے، آنے، پائی کے ذکر کو، یہ بتاؤ صبح سے بلی

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 93 (1,1)

خانم یا بادلی بیگم میں سے کسی سے ملاقات ہوئی؟'' میں نے کہا: ''ہاں، کہنے لگے'' آج راستے میں بہت بنگالنوں سے مڈبھیڑ ہوئی ۔ پانچ ہزار چھ سو چھبیس بنگالنیں آج ہی آج میں مل چکی ہیں ۔ یہ دِلّی میں بنگال کا جادو کہاں سے اِتنا آ گیا۔۔۔۔۔۔ میرا موڈ اس وقت بہت خراب ہے'' اور پھر کہا تم بادلی بیگم سے شادی کرلو۔'' میں نے کہا: ''میرے پاس شادی کے لیے روپیہ نہیں ۔'' کہا'' روپیہ میں مہیّا کر دوں گا۔تم کل شادی کرلو۔ بادلی بیگم تمھیں بہت پسند کرتی ہے اور ویسے خود بھی اچھی لڑکی ہے اور پھر یہ کہ مجھے اس سے محبت ہے۔'' میں نے کہا آپ کی محبوبہ سے میں کیسے شادی کرلوں؟'' میرآجی نے کہا'' اِس لیے کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کرے گی اور پھر کوئی تیسرا آدمی اُسے فضول لے کر چلتا بنے گا۔تمھارے پاس رہے گی تو میں بھی دیکھ لیا کروں گا۔'' یہ کہتے کہتے میرآجی کو غُصّہ آ گیا۔ایک دم چہرہ تمتمانے لگا اور حکم سنایا'' اگر تم نے کل اُس سے شادی نہیں کی تو میں تمھارا'' آملیٹ'' بنا دوں گا۔'' آملیٹ کا نام سُن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ۔ یہ سزا میرآجی نے صرف'' فرعون با سامان'' قسم کے افسروں کے لیے رکھی تھی ۔توبہ۔۔۔ جب اُنھیں کسی افسر کا آملیٹ بنانا ہوتا تو اُس کے پاس جاتے اور کہتے'' آج رات میں آپ کا'' آملیٹ'' بناؤں گا۔ رات کو چھ ہزار چھ سو چھبیس بج کر اُنسٹھ منٹ پر اور دوسرے دن سب سنتے کہ وہ افسر یا تو ہسپتال میں ہیں یا گھر ہی پر چوٹیں سینک رہے ہیں ۔تعجب یہ تھا کہ ہر افسر آملیٹ بننے کے بعد میرآجی کا مُرید ہو جاتا اور جو میرآجی کہتے، کرتا۔میرآجی نے گرج کر کہا: ''آج رات کو چھ ہزار چھ سو چھبیس بج کر اُنسٹھ منٹ پر تُم اپنا'' آملیٹ'' بنا ہوا پاؤ گے۔'' اور میرآجی نے حسبِ معمول اپنا وعدہ پورا کیا۔میرا آملیٹ بن چکا تھا۔ایم۔اے لطیف بی۔اے، ایس۔ایس ٹھاکر اور اسلام الدین سب کو حیرت تھی کہ یہ آخر اخلاقؔ کا آملیٹ کیوں بنا؟ اور سب اپنی اپنی جگہ ڈر رہے تھے۔ایم۔اے لطیف بی۔اے نے کہا ؎

آج وہ کل ہماری باری ہے

ٹھاکر صاحب کو پسینہ آ گیا، آخر وجہ کیا؟ مَیں اور میرآجی دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 94 (1,1)

تھے۔اسلام الدین نے جیسے آسمان سے باتیں کرنی شروع کیں۔''یہ ''آملیٹ'' نہیں بننا چاہیے تھا۔میرآجی نے ڈانٹ کر گھٹی ہوئی آواز میں کہا'' بکومت!''میں نے چوٹوں کی شدت روح کی گہرائی تک محسوس کی اور میرآجی سے کہا:''میرے آپ کے تعلقات آج سے ختم''اور چارسو روپے اُن کو یہ کہ کر واپس کر دیے کہ''یہ آپ کے ہیں، یہ لیجیے اور آئندہ مُجھ سے ملنے کی کبھی کوشش نہ کیجیے۔میرآجی رونے لگے۔

ایم۔اے لطیف بی۔اے،اسلام الدین اور ایس ایس ٹھا کر نے تجویز پیش کی آؤ سب مل کر بیٹھ جائیں کہیں پر اور پیئیں۔میں نے کہا''مجھ پر آج سے وہ شراب حرام ہے جس میں میرآجی بھی شرکت کریں۔میرآجی نے کہا''اخلاق صاحب مجھے معاف کر دیجیے۔''اور پلک جھپکتے میں ہم دونوں گلے مل گئے جیسے برسوں کے بچھڑے ملیں۔میرآجی نے ہومیو پیتھک طریقے پر میری چوٹوں کا علاج شروع کیا، کیونکہ''ہومیو پیتھک''علاج سے اُنھیں بہت عقیدت تھی اور خود اِس علم سے بخوبی واقف تھے۔''آملیٹ'' بنانے کے بعد وہ خُود ہی ہر ایک کی تیمار داری بھی کیا کرتے تھے۔چنانچہ میرے ساتھ بھی اُنھوں نے رواداری برتی۔

مجھ سے پوچھا''یہ چارسو روپے کیسے تھے؟''میں نے بتایا۔سخت متعجب ہوئے۔کہنے لگے''کمال کر دیا، مجھے تو بالکل یاد نہیں تھے۔''میں نے کہا:''یہ میں نے اس وقت کے لیے رکھ لیے تھے جب آپ کو حقیقی معنوں میں روپیوں کی ضرورت ہو۔ویسے روز کا کام تو کسی نہ کسی طرح چل ہی جاتا ہے لیکن اس وقت غُصّے میں میں نے یہ آپ کو دے دیے۔''میرا جی نے کہا:''یہ روپے میں والدہ کو بھیج دوں گا۔ماں بڑی نعمت ہے۔''پھر اپنی ایک کتاب مجھے دی، گیتوں کا مجموعہ''گیت ہی گیت''، میں نے کتاب کھولی، لکھا تھا:''اخلاق احمد کے نام جسے اِن گیتوں کے ماخذ معلوم ہیں۔''مجھے معلوم تھا بہت سے گیت میرآجی نے بلی خانم اور بادلی بیگم کی وجہ سے لکھے ہیں اور کچھ اور لڑکیوں کی وجہ سے بھی۔اِس سے پہلے ایک کتاب دِلّی کے نام معنون کر چکے تھے:''دِلّی کے نام جو مٹ سکتی ہے، مر نہیں سکتی۔''میرآجی، ایم۔اے لطیف بی۔اے کے ساتھ فلم کمپنی کے سلسلے

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 95 (1,1)

میں ہمیشہ کے لیے دلّی کو خیر باد کہہ گئے۔ دِلّی سے اپنے اِس جاں نثار کی جُدائی کا صدمہ برداشت نہ ہوسکا اور دِلّی کی حالت بگڑنی شروع ہوئی۔۔ مجھ سے دِلّی کا مٹنا دیکھا نہ جاسکا۔ مادرِ وطن کی لاش کو سسکتا چھوڑ کر میرؔاجی کے وطن آگیا۔ مجھے یقین ہے کہ دِلّی کی بدحالی کی خبر سُن کر جتنی میرؔاجی کو اذیّت ہوئی ہوگی، کسی دِلّی والے کو بھی نہیں ہوسکتی۔ میرؔاجی کے وطن پہنچ کر اتفاق سے میری مُلاقات ایک ڈاکٹر صاحب سے ہوئی۔ اُن ڈاکٹر صاحب کا نام اے۔ ڈی فرزوق ہے۔ یہ ''اچھرے'' میں ''ہومیوپیتھک'' علاج کرتے ہیں۔ میں نے اُنھیں پنجابی لہجے میں اُردو بولتے دیکھ کر پوچھا: ''آپ پنجابی کیوں نہیں بولتے؟'' ڈاکٹر اے۔ ڈی فرزوق نے جواب دیا: ''میں اپنے ایک دوست کی یاد میں اُردو بولتا ہوں۔ میرے وہ دوست بھی یہیں کے رہنے والے تھے۔ اُنھیں اُردو سے عشق تھا۔ آج کل شاید وہ بمبئی میں ہیں۔ بہت عرصے وہ دِلّی میں رہے پھر کسی فلم کمپنی کے سلسلے میں آگرہ چلے گئے۔ آگرہ میں کچھ کام نہ بنا تو لکھنؤ جا کر فلم کمپنی کو جمانے کی کوشش کی۔ آخر بمبئی پہنچے۔ مُجھ سے اکثر اُردو بولنے کی تاکید کرتے رہتے تھے۔ میرا ماتھا فوراً ٹھنکا۔ میں نے پوچھا: ''آپ کے اُن دوست کا نام کیا ہے؟'' ڈاکٹر صاحب نے بتایا۔۔۔ ''میں اُنھیں شروع ہی سے ثناء صاحب کہتا ہوں لیکن اور لوگ اُن کو میرؔاجی کے نام سے جانتے ہیں۔'' میں نے پوچھا: ''آپ سے اُن کی دوستی کیسے ہوئی؟'' ڈاکٹر اے۔ ڈی فرزوق نے جواب دیا: ''ہم مزنگ کے ایک سکول میں آٹھویں سے دسویں جماعت تک ساتھ پڑھے۔ ثناء صاحب میٹرک میں فیل ہو گئے کیونکہ اُن کا کورس کی کتابوں میں جی نہیں لگتا تھا اور میں پاس ہو کر ایف سی کالج میں داخل ہوگیا۔ ثناء صاحب مجھ سے ملنے کے لیے کالج میں آتے اور مجھے افسانہ نویسی کی تلقین کرتے۔ اُن کا خیال تھا مجھ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ ثناء صاحب جب آٹھویں جماعت میں تھے تو اِتنے عمدہ مضامین لکھتے تھے کہ اُستاد اور لڑکے سب دنگ رہ جاتے۔ اُن کے ہر مضمون میں دُنیا سے انوکھی کوئی بات ضرور ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کی اُن کے نام کے ساتھ ''صاحب'' کا لفظ استعمال ہوتا تھا ورنہ اِس عمر کے اور لڑکوں کو کوئی ''صاحب'' کے نام سے نہیں پکارتا۔ سارا اسکول اُس زمانے میں اُن کے

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 96 (1,1)

اچھوتے پن کی وجہ سے اُن کا شیدائی تھا۔

کالج میں میری ایک ہم جماعت تھی ''میرا سین'' اُس لڑکی کا نام تھا اور میرا نام چونکہ ''اے'' سے شروع ہوتا ہے، اِس لیے لڑکیوں کے بعد سب سے پہلے حروفِ ابجد کے حساب سے میں ہی بیٹھتا تھا۔ اُس زمانے میں ایف سی کالج میں نشست کا طریقہ ایسا ہی تھا۔ اتفاق سے میری اور ''میرا سین'' کی سیٹ برابر تھی۔ کچھ عرصے بعد میرا جی میری طرف اپنے اسکول کے اور ساتھیوں کی نسبت زیادہ مُلتفت رہنے لگے۔ اُنھیں میری ہم نشیں میرا سین سے کچھ موانست ہوگئی۔ رفتہ رفتہ ثناء صاحب نے بال بڑھانے شروع کر دیے۔ بال بڑھانے کی وجہ میرا جی یہ بتاتے کہ مقابلہ اُن کا کسی ''بالوں والی'' سے ہے۔ ثناء صاحب اور میں اکثر ساتھ سینما دیکھتے۔ کیونکہ انگریزی فلم دیکھنے کا مجھے بھی شوق تھا اور ثناء صاحب کو بھی۔ کبھی کبھی ہم اُردو فلم بھی دیکھتے۔ ثناء صاحب مجھے اکثر افسانوں کے پلاٹ بتاتے۔ مجھ سے اصرار کر کے لکھواتے اور پھر خُود ہی کتر بیونت کر کے چھپنے کے لیے بھیج دیتے۔ دیکھتے دیکھتے ثناء صاحب نے میرا سین کا اِتنا اثر قبول کیا کہ خود اپنا نام اُس کے نام پر میرا جی رکھ لیا۔ ثناء صاحب روزانہ کوئی بیس پچیس قدم کے فاصلے سے میرا سین کے پیچھے پیچھے چلتے اور گھر سے کالج تک اور کالج سے گھر تک اُسے پہنچا کر دم لیتے جس کی خود میرا سین کو اخیر دم تک خبر نہ ہو سکی۔'' ڈاکٹر اے۔ ڈی۔ فرزوق نے کہا: ''اُس لڑکی کے چہرے پر ہر وقت مُسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی اور شاید یہی آن میرا سین کی ثناء صاحب کو بھا گئی تھی۔ باقی وقت ثناء صاحب لائبریریوں میں کتابیں پڑھنے اور دوستوں سے ملنے جُلنے میں گزارتے اور مختلف اخباروں اور رِسالوں کے لیے کچھ لکھتے۔ رفتہ رفتہ اُنھیں اپنے سر پَیر کا ہوش نہ رہا، مہینوں نہ نہاتے نہ کپڑے بدلتے اور نہ حجامت بنواتے۔ اُن کی مسیں بھیگ چلی تھیں۔ ثناء صاحب کے لیے جوانی اور محبت کا آغاز ساتھ ساتھ ہوا۔''

یکا یک ڈاکٹر اے۔ ڈی فرزوق کو خیال آیا کہ وہ ایک اجنبی سے اپنے ایک دوست کے راز بلاوجہ کہے دے رہے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کی اِس کیفیت کو محسوس کیا اور کہا: ''میں اجنبی نہیں ہوں'' اور میں نے ڈاکٹر صاحب سے اپنا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر اے۔ ڈی فرزوق مارے

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 97 (1,1)

خُوشی کے مُجھ سے بغل گیر ہوتے ہوتے بچے اور اپنے اِس جذبے کو کچھ ضبط کر کے بولے: ''لیکن آپ یہاں آئے کیسے؟'' میں نے کہا: ''اس شہر میں۔۔۔۔۔۔ اِس لیے آیا ہوں کہ مجھ سے میرآجی کی دِلّی کا مِٹنا نہ دیکھا جا سکا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، ڈاکٹر صاحب مجھ سے اِس طرح ملتے ہیں جیسے ساتھ کے کھیلے ہوئے۔ اب میں میرآجی کے دیس میں ہوں۔ ایس۔ ایس۔ ایس ٹھاکر اور اِسلام الدین دِلّی ہی کی لاش کی رکھوالی کر رہے ہیں کہ کب میرآجی کی محبوب دِلّی پھر سانس لینے لگے۔ ایم۔ اے لطیف بی۔ اے شاید لکھنؤ میں ہیں۔ پتہ نہیں کیوں؟ لکھنؤ جس کے بارے میں کچھ عرصہ ہوا جوشؔ ملیح آبادی نے یہ قطعہ کہا: ؎

جلتی ہوئی شمعوں کے بجھانے والے
جیتا نہیں چھوڑیں گے زمانے والے
لاشِ دہلی پہ لکھنؤ نے یہ کہا
اب ہم بھی ہیں کچھ روز میں آنے والے

اور میرآجی۔۔۔۔۔۔۔ کون جانے وہ اب کہاں ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔!
اخباروں میں جو کچھ چھپا ہے، میرا جی نہیں چاہتا کہ اُس کا یقین کروں

(پھر وہی بیاں اپنا)

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 98 (1,1)

اخلاق احمد دہلوی

میرؔ آجی کی ایک اور تصویر

غالب نے کہا:۔

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

ن۔م راشد کہتے ہیں:۔

میں بھی سہ نیم، تُو بھی سہ نیم

اور میرؔ آجی کہا کرتے تھے: ''ہر شخص کے ایک سو ایک روپ ہوتے اب آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے۔'' اِس سے انکار کم لوگوں کو ہو سکتا ہے کہ ہر معاملے میں اپنی اپنی نظر ہوتی ہے اور اپنا اپنا نقطۂ نظر:

جب آسمان کے تارے کسی کو موتیوں کا زیور معلوم ہوتے ہیں، کسی کو کفن کے پھول اور کسی کو کوڑھ کے دھبے، تو کسی ایک شخص یا شخصیت کے بارے میں سب کی رائے یکساں کیسے ہو سکتی ہے اور پھر شخصیت بھی میرؔ آجی کی جن کی ظاہری سہ رنگی وضع قطع اور باطنی نیرنگیٔ طبع کے باعث ہر مصوّر کو یہ کہہ کر اعترافِ عجز کرنا پڑے کہ بسیار عشوہ ہاست بُتاں را کہ نام نیست!

اِسی لیے میرؔ آجی ٹھنڈی پتلون اور گرم اچکن، گرم کوٹ ٹھنڈی پتلون، جاڑوں میں سولا ہیٹ میں اور گرمیوں کی ٹٹار دُھوپ میں ننگے سر پھر کر بھی بڑے بڑے خوش پوش لوگوں پر اپنے چاہنے والوں کی نظر میں بھاری ہی رہتے اور اُن کے مہینوں نہ نہانے کی وجہ سے اُن کے پسینے سے جو بُو پھوٹتی وہ بادۂ دوشنیہ کی بُو معلوم ہوتی۔ لیکن اس ظاہری ہیئت کذائی پر نکیرین قسم کی مخلوق جب گھبرا کے بھاگ کھڑی ہوتی تو میرؔ آجی کہتے، غالبؔ نے غلط کہا کہ:۔

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 99 (1,1)

میرآجی نے دِلّی میں جب ایک مرتبہ نیا سال آنے پر احباب کے اصرار پر نیا سوٹ پہنا اور اپنا وہ چارلی چپلن والا جُوتا بھی بدل ڈالا اور کلارک گیبل کی وضع کی مُونچھیں بھی حذف کرا دیں تو اُن سب کو بھی حیرت ہوئی جن کے اصرار پر وہ ''سُوٹڈ بُوٹڈ'' بنے تھے اور سب نے سمجھا کہ نیا سال میرآجی کے نئے لباس سے شروع ہو رہا ہے لیکن جب پوری طرح ''ٹِپ ٹوپ'' ہو کر اُنھوں نے سر پر اُسترا پھروایا اور چاند سے سر پر HAPPY NEW YEAR پینٹ کرایا اور وہ مالائیں جو قمیض کے اندر رہتی تھیں باہر کوٹ کے کالر پر پہن لیں تو اُن کے مقرّبین کو کہنا پڑا کہ کوئی لباس میرآجی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

میرآجی کے مہین ہونٹ، ستون ناک، کٹارسی آنکھیں، کُشادہ پیشانی، چڑھی کمانوں جیسی بھنویں، ریشم سے سر کے بال، کتابی چہرہ اور کُھلتا ہوا گیہواں رنگ دیکھ کر کسی کا یہ جی نہ چاہتا تھا کہ وہ جتنے متناسب الاعضاء اُتنا ہی غیر متناسب لباس پہنیں اور اس ''یک قدِ آدم'' قد کو کُرسی پر اُکڑوں بیٹھ کر لکھتے رہنے میں ضائع کریں، لیکن میرآجی جاپانیوں کی طرح خُودکُشی پر ایمان رکھتے تھے اور اپنے حساب سے اس مقدّس فریضے کی ادائیگی میں گویا ہر وقت ہر ہر طرح سے ہمہ تن مصروف نظر آتے۔

میرآجی کے جب اُردو کے ایسے شعر پڑھتے کہ: ؎

میرے رونے کا جس میں قصّہ ہے
عُمر کا بہترین حِصّہ ہے

یا

اے شمع تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح
مَیں نے تمام عمر گزاری ہے اِس طرح

تو اُن کے حلقے کے لوگوں کا جی چاہتا کہ اُن کے ساتھ رونے میں اُن کا ہاتھ بٹائیں لیکن اِس ڈر سے کہ جب یہ دیواروں سے سر ٹکرائیں گے تو انھیں سنبھالے گا کون؟ میرآجی کے ساتھی ضبط سے کام

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 100 (1,1)

لیتے اور اُنھیں صبر کی تلقین اِس لیے نہ کرتے کہ اِس طرح اُن کے مزاج کی برہمی میں اضافہ ہو جاتا۔ میر آجی جتنے خوش باطن تھے اُتنے ہی تُند مزاج، جتنے مُنکسر المزاج تھے اُتنے ہی انانیت کے قائل۔ شاعروں کا دل، محتسب کا دماغ اور فوجی چال ڈھال رکھنے کی وجہ سے وہ اکثر اوقات اپنے دوستوں کے سنبھالے نہ سنبھلتے۔ وہ بے قاعدگیوں تک میں باقاعدگی اور ایک خاص نوع کے نظم و ضبط کے قائل تھے۔ وہ ہنسی مذاق تک میں سنجیدہ رہتے اور زیادہ سنجیدہ رہنے کو بدمذاقی سمجھتے۔ میٹھا سلُونا ملا کر کھاتے اور کئی کئی لڑکیوں سے ایک ہی وقت میں عشق کرنے کے باوجود ایک ہی لڑکی ''میرا سین'' کے عشق کی مالا جپتے اور اسی طرح ساری شرابیں ملا کر ہر قماش کے لوگوں کے ساتھ پیتے، لیکن اپنے خاص حلقے میں ''بیئر'' ہی کو شراب سمجھتے اور میلے لباس اور اپنے غچلی پن کے باوجود مجموعی طور پر صاف ستھرے اور مردِ معقول نظر آتے۔۔۔۔۔ بغیر صابن سے ہاتھ دھوئے کھانا نہ کھاتے اور کھانا کھا کر اپنے کپڑوں سے ہاتھ صاف کر لیتے۔

پتلون بغیر جیبوں کی پہنتے اور شیروانی کی جیبوں کو اپنے غیر مطبوعہ مسوّدات، فلم ایکٹرسوں کی نیم برہنہ تصویروں، ٹوٹی ہوئی چُوڑیوں، استعمال شدہ موبافوں وغیرہ کے ملغوبے سے تھیلا بنائے رکھتے۔ لباس موسموں کے اعتبار سے کبھی نہ پہنتے اور سامان مطلق نہ رکھتے نہ تکیہ، نہ بستر، نہ چارپائی۔ ایک دفعہ کسی نے اُن کے کمرے میں کہیں سے نظر بچا کر چارپائی لا کر ڈال دی تو اُنھوں نے اس چارپائی کو کتابوں سے لاد دیا اور خود زمین کے فرش ہی کو عرش سمجھا کیے۔ اور جب اُن سے کہا گیا کہ چارپائی کا یہ مصرف نہیں ہوتا تو جواب ملا: ''ہوتا ہے، سُنا نہیں آپ نے ''چارپائی، برادکتابے چند۔''

چاندنی رات میں میر آجی اکثر اپنے دِلّی کے دورانِ قیام میں دِلّی کے تاریخی مقبروں میں شب بیداری میں گزارتے۔ اندھیری راتوں میں البتہ یہ اپنے اِس کرائے کے کمرے میں بغیر لباس تبدیل کیے اور جوتے اُتارے پڑے رہتے۔ جہاں کتابیں زیادہ رہتی تھیں اور یہ خود کم۔ ہوٹلوں کے کھانے اور ہسپتال میں مرنے کے قائل تھے اور یہی اُنھوں نے کر کے

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 101 (1,1)

دِکھایا۔آخری دِنوں میں جب اختر الایمان وغیرہُم نے بمبئی میں اپنے گھر پر لا کر بڑے بڑے ڈاکٹروں سے نفسیاتی علاج کرانے کی ترغیب اُنھیں دی تو اُنھوں نے صاف جواب دے دیا کہ میں ایسا علاج نہیں چاہتا جس سے میرؔ آجی مر جائے اور ثناء اللہ خاں ڈار زندہ رہے۔ چنانچہ میرؔ آجی واقعی اپنے پسند کرنے والوں کے دِلوں میں زِندہ ہیں اور حامد علی خاں جیسے ہر اعتبار سے نِک سے سُک تک دُرست اور نوک پلک سے لیس محقق میرؔ آجی کو اُن کی بے قاعدگیوں کے باوجود باقاعدہ انسان گردانتے ہیں اور ہمہ شمہ اُن کے نام کی مالا جپتے ہیں ؎

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ "اُو"

(پھر وہی بیاں اپنا)

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 102 (1,1)

اخلاق احمد دہلوی

ردّی کے بھاؤ

یوں رونے کو حضرت یعقوب سے لے کر بھگت کبیرؔ اور میر تقی میرؔ تک روئے۔۔۔لیکن جنھوں نے اپنی آنکھوں میراؔجی کو دیکھا ہے وہ یہی کہیں گے کہ ؎ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ حضرت یعقوب اپنے بیٹے کے لیے روئے، میر تقی میرؔ دوسروں کے یوسفِ ثانی صفت بیٹوں کے لیے اور بھگت کبیرؔ کبھی اِس وجہ سے کہ چلتی کو گاڑی کیوں کہا جاتا ہے اور کبھی اِس کارن کہ رنگی کو نارنگی کیوں کہتے ہیں۔ پر میراؔجی کے رونے کی نوعیت ان بزرگوں سے مختلف تھی۔۔۔وہ کبھی اپنی بیٹی کے نہ ہونے پر روتے، کبھی دوسروں کی بیٹیوں کے ہونے پر۔ اور کبھی کبھی اپنے اُس بھائی کی نادانی پر جس نے اُن کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام ردّی کے حسابوں بیچ دیا۔۔۔بھائی چاہے یوسف کے ہوں، میراؔجی کے ہوں، ''بھائیوں کی دوکان'' والوں کے ہوں یا میرے اور آپ کے۔۔۔۔ تقریباً ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔

صنفِ نازک نے زندگی بھر میراؔجی سے اِجتناب برتا کہ یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ موت جو بہ اعتبارِ صیغہ جنس لطیف ہے، میراجی تک کیسے پہنچ پائی۔ لیکن پورا ایک برس ہونے کو آیا کسی نے اُس خبرِ وحشت اثر کی تردید نہ کی جو میراؔجی کے بارے میں ۳؍نومبر ۱۹۴۹ء کے اخبارات میں شائع ہوئی۔ ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔''

میراؔجی کا وہ غیر مطبوعہ کلام جو میرے پاس سے دِلّی میں غدر ۱۹۴۷ء کی بھینٹ چڑھا اور جس کا کفارہ میں تازیست ادا نہیں کر سکتا، میرے حساب سے اس سے کہیں زیادہ قیمتی تھا، جو اُن کے بھائی نے لاہور کے کسی دوکاندار کے ہاتھ ردّی میں بیچا۔ کیونکہ جو مسوّدات میراؔجی کے بھائی کے ہاتھ پڑے وہ زیادہ تر اُن کی غیر مطبوعہ نظموں پر مشتمل تھے۔ لیکن میرے پاس اُن کی غزلیں اور

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 103 (1,1)

نثر کے ٹکڑے تھے۔کون جانے کس ''بھائی'' نے ''کس ''بھائی'' کے ہاتھ کس بھاؤ یہ خزانہ لُٹا دیا۔۔۔

میں ذاتی طور پر کبھی بھی میرؔ آجی کی نظم کا اِتنا دلدادہ نہیں رہا جتنا اُن کی نثر کا۔اور نثر میں بھی تنقید۔۔۔۔اُردو ادب میں جتنی بے لاگ تنقید میرؔ آجی کے ہاں ملتی ہے اُس کی مثال اُردو کے اور نقادوں میں کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ اِس کی دو وجوہات تھیں۔ایک ان کی غیر معمولی ذہانت اور دیانت اور دوسرے ان کا ہر موضوع پر گہرا اور ٹھوس مطالعہ۔جب غزل لکھنے پر آتے، کچھ میرؔ کا سا خیال کرتے اور اِتنا ٹُھکا ہوا شعر کہتے کہ بڑے بڑے کُہنہ مشق غزل گو انگشت بدنداں رہ جاتے۔میرؔ کو سب کی طرح میرؔ آجی نے بھی مانا ہے۔''کیفیت'' کے عالم میں کبھی کبھی ''میرؔ جی'' کی یہ غزل میرؔ آجی بہت جھوم جھوم کر گُنگُناتے:

غنچہ غنچہ، بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء کے غدر کے درمیان کی دِلّی میں ایک رات ایک مے کدے میں ایسی بحث چھڑی اور بات یہاں تک بڑھی کہ میرؔ آجی کو حَکَم بنانا پڑا۔جھگڑا یہ تھا کہ شیفتہؔ، میرؔ کے زمانے میں تھے یا غالب کے دَور میں۔میرؔ آجی نے وہ جملہ سُنایا کہ سارے مے کش قائل ہو کر رہ گئے اور فریقین میں سے کسی کی بات نیچی نہ ہوئی۔میرؔ آجی نے حکم لگایا کہ شیفتہؔ، میرؔ کے زمانے میں بھی تھے اور غالبؔ کے دَور میں بھی، اور سند میں یہ شعر پڑھا:۔

شیفتہؔ کے تمھی اُستاد نہیں ہو غالبؔ
سُنتے ہیں کہ اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

اور پھر اِس بحر میں وہ معرکۃ الآرا غزل کہی جس کی صحیح داد لکھنؤ کے رفیع احمد خاں مرحوم ہی دے سکتے تھے۔معلوم نہیں اب وہ غزل کس ''بھائی'' نے کیا کی؟

دِلی میں میرؔ آجی کے ہم مشربوں میں ایک صاحب تھے اسلام الدین۔۔۔اسلام الدین صاحب میرؔ آجی سے کچھ اِس نوع کا جارحانہ خلوص رکھتے تھے کہ میرؔ آجی اسلام الدین صاحب کو

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 104 (1,1)

''بھائی'' کہنے لگے تھے جو ریڈیو کے مشہور ادا کار محمد حسین کے لاڈ میں نام لینے کی وجہ سے کچھ لوگوں میں صرف ''پائی'' ہو کر رہ گئے تھے۔۔۔''بھائی'' یا ''پائی'' کہتے تھے کہ میرؔاجی یہ کیوں کہتے ہیں کہ اُن کے بھائی نے اُن کے کلام کو ردّی سمجھا جب کہ یہ خود اپنے کلام کو جان بوجھ کر پبلشروں کے ہاتھ ردّی کے داموں فروخت کر آتے ہیں۔ بھائی اسلام الدین چاہتے تھے کہ پبلشروں میں میرؔاجی کے مسوّدات کی فروخت اُن کی معرفت طے پائے۔لیکن میرؔاجی یہ کام براہِ راست کر گزرتے تھے۔ بھائی اسلام الدین میرؔاجی کی نجی زندگی کو بھی سنوارنے کے درپے رہتے۔ بھائی کو زعم تھا کہ چونکہ اُنھوں نے دیہات سدھار کے کام میں عمر بتائی ہے، اِس لیے میرؔاجی کو بھی ٹھیک کیا جاسکتا ہے۔ ورنہ کچھ تعجب نہیں کہ اب کے جب یہ لاہور جائیں تو ان کے بھائی خود انھیں ردّی کی قیمت میں بیچ ڈالیں۔لیکن میرؔاجی کا عذر یہ تھا کہ میں چونکہ ''دیہات'' نہیں ہوں، اِس لیے بھائی کو میری نجی زندگی سدھارنے کا کوئی حق نہیں۔ بھائی اسلام الدین کے اِس عزم نے ایک دن یہاں تک رنگ دِکھایا کہ میرؔاجی ایک صبح خون میں رنگے ہوئے نظر آئے۔ شبہ کرنے والے آج تک یہی شبہ کرتے ہیں کہ یہ ''بھائی'' کی ''دیہات سدھار'' کی کوشش تھی، لیکن اِس واقعہ کی تحقیق نہ ہوسکی۔اور تحقیق میں سب سے زیادہ حارج غالبؔ کا یہ شعر تھا جس کا برعکس عکس اُسی صبح میرؔاجی کی مضروب پیشانی پر دیکھا گیا۔شعر یہ تھا: ؎

قطرہ قطرہ اِک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا
خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

اِس شعر میں میرؔاجی کے ہاتھ کا اُلٹا ''اوم'' کا نشان بھی تھا جس سے شک ہوتا تھا کہ یہ سارا کارنامہ ''خود کردہ'' ہے۔لیکن میرؔاجی کہتے تھے کہ یہ خط میرا نہیں۔ایس۔ایس۔ایس ٹھاکر اور ایم۔اے لطیف بی۔اے کا گمان تھا کہ یہ خودکُشی کی کوشش ہے۔ مرنے سے پہلے یہ شعر لکھ کر اپنے ماتھے پر چسپاں کیا ہوگا۔جس کا اُلٹا ہم دیکھ رہے ہیں، وغیرہ۔ واقعہ چاہے کچھ بھی ہو لیکن نہ بھائی یا ''پائی'' کا خلوص اور نہ اُن کے دِلّی کے تمام دوستوں کے مشورے سے میرؔاجی کو اپنا کلام خود

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 105 (1,1)

ردّی کے مولوں بیچنے سے باز رکھ سکے اور نہ بعض پبلشر میرآجی کے فطری لاأبالی پن سے فائدہ اُٹھانے سے چُوکے۔

ن۔م راشد کے ایران جانے کے بعد جب میرآجی نے شدت کے ساتھ اپنے تئیں دِلّی میں تنہا محسوس کیا اور شادی اور خودکشی کے لیے بچوں کی طرح مچلنا شروع کیا تو میرآجی کو ان دونوں ہلاکت آفرینیوں سے محفوظ رکھنے میں ''بھائی'' ہی پیش پیش تھے۔ بھائی اسلام الدین کہتے تھے: ''خودکشی چاہے یہ کرلیں لیکن شادی میں اِنھیں ہرگز نہیں کرنے دُوں گا۔ آخر راشد صاحب کو بھی مُنہ دِکھانا ہے۔ وہ کہیں گے نہیں کہ میرے پیچھے یہاں کے لوگوں نے جیتے جی میرآجی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

میرآجی نہ اِس طرح کا خلوص کسی کے ساتھ برتتے تھے کہ بھائی معلوم ہونے لگیں اور نہ یہ گوارا کرتے تھے کہ اُن کے ساتھ دوست ''بھائیوں'' کا سا سلوک روا رکھیں۔ لیکن اب جبکہ وہ ہم میں نہیں ہیں، کیا کہ ممکن نہیں کہ میرآجی کے سب دوست، قدردان اور بھائی چاہے وہ بمبئی میں ہوں، دِلّی میں ہوں، لاہور میں یا سمرقند و بخارا میں، ان بے اعتنائیوں کا حتّی المقدور ازالہ کریں جو زندگی بھر اُن کے ساتھ روا رکھی گئیں۔ سب سے پہلا فرض اِس سلسلے میں اراکین حلقۂ اربابِ ذوق کا ہے جس کی بنیاد آج سے تقریباً بارہ برس پہلے میرآجی نے لاہور میں رکھی، کہ میرآجی کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کو ردّی کی ذِلّت سے نکالیں۔ دس فروری ۱۹۴۸ء کو میں لاہور پہنچا اور تادمِ تحریر لاہور میں اِس کوشش میں ہوں کہ کس طرح اُس ردّی کا کچھ کھوج لگ سکے جس کے لیے میرآجی اکثر روئے ہیں۔ اور میری یہ کوشش بالکل رائیگاں نہیں گئی۔ آخر ایک پُرزہ مزنگ کے ایک دوکاندار کے ہاں سے مجھے مل ہی گیا۔ مزنگ لاہور کے اُس مقدّس محلّے کا نام ہے جہاں میرآجی رہتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کاغذ کا پُرزہ اس ڈھائی تین برس کی محنت کی کچھ کم قیمت نہیں ہے۔ دوستوں اور ''بھائیوں'' کی ترغیب کے لیے میں اس کاغذ کے ٹکڑے کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اِس کاغذ کا اُوپر کا ایک کونا پھٹ گیا ہے جس کی وجہ سے دیوناگری رسم الخط میں ''اوم'' کی علامت صرف آدھی پڑھی جاسکتی ہے اور پہلی سطر کے شروع کے تقریباً دو تین لفظ بھی اُڑ گئے ہیں۔ نثر کا یہ ٹکڑا یہاں سے صاف پڑھا جاتا ہے:

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 106 (1,1)

''چپکے سے جا کر تیرے پہنے ہوئے کپڑے جو تُو نے ابھی ابھی اُتارے ہوں چرا لاؤں اور اپنے گھر کی خلوت میں اُنھیں دیکھ دیکھ کر، اُنھیں اپنے سینے سے لپٹا لپٹا کر اُن سے اپنے گالوں کو سہلا کر تسکین حاصل کروں۔ اُن میں رچی ہوئی ترے جسم کی خوشبو مجھے لاکھوں شرابوں سے کہیں بڑھ کر مست کر سکتی ہے اور ترے جسم کی ساخت سے جو سلوٹیں ان میں پیدا ہو جاتی ہیں اُن کے مقابل سمندر کی لہریں، گھٹاؤں کی گدراہٹ کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ خوب صورت لڑکی! میرے خیالات ایک مرکز پر جمع ہو کر دن بدن دل کی بے قراری زیادہ کیے دیتے ہیں۔ وہی سادہ آرزوئیں جو ازل سے انسان کے خون میں ڈال دی گئی ہیں تہذیب و تمدن کے اثرات کے ماتحت ذرا سے اختلاف کے ساتھ میرے دل میں بھی تیرے لیے ہیں۔ اور ایسی ہی آرزوئیں تیرے دل میں بھی ہوں گی کہ تُو بھی جوان ہے اور میں دل پسند۔۔۔۔ میری نازنین! اپنے اور میرے دونوں جسموں کو ملا کر اس ابدی راستے پر خراماں ہو جو اِس قدر پریشان نظری کے باوجود ذہن و روحِ انسانی کا واحد مقصد ہے۔ اگر بیرونی بندھن نہیں توڑ سکتی تو اندرونی رُکاوٹیں ہی دُور کر دے کہ باقی کام میرا ہے۔۔''

اس کی پُشت پر انگریزی کی چھ سات سطریں رقم ہیں جن کا ترجمہ کچھ اِس طرح سے ہو سکتا ہے:

''مرد نت نئی دیویوں کی پُوجا کرتے ہیں اور عورتیں جُھوٹے دیوتاؤں کے پیچھے لپکتی ہیں۔۔۔ اور دیوتاؤں کے انبار اور بھی ہیں۔''

دیو ناگری رسم الخط میں ''اوم'' کی علامت اِس انگریزی عبارت پر بھی ہے۔ اس کے نیچے پنسل سے غالبؔ کے ایک شعر کی تقطیع کی ہے۔ شعر یہ ہے:

تُو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالبؔ
مفتعلن ، مفتعلن ، مفتعلن ، فَع
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

اِس کے علاوہ کاغذ کے اِس ٹکڑے پر پینسل سے کچھ الفاظ ایسے لکھے ہوئے ملتے

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 107 (1,1)

ہیں جنھیں پڑھنا دشوار ہے۔ کیونکہ انھیں پنسل کی ٹوٹی ہوئی نوک سے خوب گھس کر کاٹ دیا گیا ہے۔ صرف ایک طرف اِتنا اب بھی پڑھا جا سکتا ہے:

''یہ نصر اللہ خان عزیز ہے'' اور ''سنگریزوں کی طرح''

اِس تقریباً ایک فُٹ لمبے اور چھ انچ چوڑے ملگجے کاغذ پر میرؔ آجی کے ہاتھ لگنے یا ردّی میں بِکنے سے پہلے شاید اِتنا مسلا ہوا نہ ہو۔ کہیں میرؔ آجی کے دستخط نہیں ہیں۔ حالانکہ میرے علم میں جا ہے وہ شراب اور آنسوؤں میں غرق ہی کیوں نہ ہوتے کبھی اپنی تحریر کی اِس وضع داری میں فرق نہ آنے دیتے۔

کاغذ تو کاغذ، اُنھوں نے ایک دفعہ میرے سامنے آموں تک پر ''اوم'' لکھا اور دستخط کیے۔

ایک مرتبہ جب ایک خاص کیفیت میں میرؔ آجی شراب اور آموں کی نذر چڑھانے غالبؔ کے مزار پر گئے تو کہا: ''آپ کا مزار اب تک بغیر چھت کے پڑا ہے اور ''دل لی'' کے ''چندا ماموں'' جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُنھوں نے آپ کا مزار درست کرانے کے لیے ستائیس ہزار (۲۷۰۰۰) روپے چندہ جمع کیا۔ اسی قبیل کے بہت سے چندوں کی بدولت بہترین چھت کے نیچے ''خانقاہانہ'' عیاشیوں میں مصروف ہیں۔ ایس۔ ایس۔ ایس ٹھاکر کا خیال ہے کہ ۱۷ کا عدد منحوس ہوتا ہے۔ کیونکہ اِس کا حاصل جمع آٹھ ہے۔ اگر ''تھری ایس'' ٹھاکر کے جذبات کا احترام ملحوظِ خاطر نہ ہوتا تو میں یہ سترہ ہزار کی رقم چندا ماموں سے چھین کر آپ کے مزار کی اتنی وسیع چھت تعمیر کراتا جس کے نیچے میں بھی سو سکتا۔ کیوں کہ میں بھی آپ کی طرح ایک بنگالن ''میرا سین'' کا پجاری ہوں۔ آپ نے کہیں اپنی بنگالن محبوبہ کا بالمشافہ ذکر نہیں کیا۔ لیکن میرے لیے آپ کے اِس شعر میں کافی اشارہ موجود ہے کہ:

کلکتے کا جو نام لیا تُو نے ہم نشیں
اِک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے۔ اور پھر بنگال کے جادو سے تو نہ آپ بچ سکے اور نہ میں۔

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 108 (1,1)

ویسے مجھے آپ سے یہ شکایت ہے کہ آپ نے میرے بہت سے مضمون چرا کر اپنے اشعار میں باندھے ہیں۔ اور میں یہ بھید کسی پر اس لیے نہیں کھولتا کہ آپ اور میں دونوں بنگال کے حُسن اور شراب کی سرمستی کا شکار ہیں۔ لیجیے آم کھائیے۔

آم کے آگے پیش جائے خاک
پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک

نہ چلا جب کسی طرح مقدور
بادۂ ناب بن گیا انگور

اگر آپ چاہیں تو شراب بھی حاضر ہے۔ انگور کی بیٹی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ انگور تک کی ماں بیٹی ہوئی لیکن میں اِس نعمت سے محروم ہی رہا۔ اجنبیوں کی بیٹیوں سے فیض نہ پہنچا تو اپنی ہی کوئی بیٹی ہوتی۔۔۔'' اور پھر میرآجی اپنی بیٹی کے نہ ہونے پر بے طرح روئے۔ دیر تک اِس غم میں روتے رہے اور انگور کی بیٹی سے التفات برتتے رہے۔ یہاں تک کہ صرف آم باقی بچے۔ اور میرآجی نے ہر آم پر ''اوم'' لکھ کر اپنے دستخط کیے اور مرزا صاحب کے سرہانے رکھ کر چلے آئے۔

اِس سے پہلے کہ میرآجی کے لیے بھی کوئی ''دل لی'' والے ''چندہ ماموں'' پیدا ہوں ہمارا فرض ہے کہ اُن کی کوئی ایسی ٹھوس یادگار قائم کر جائیں جو اُن کے چالیس سال کے گریۂ پیہم کی کسی نہ کسی حد تک تلافی کر سکے۔۔۔ کم از کم اُنھیں ردّی کی اس لعنت سے تو نکالیں جس میں ''بھائی'' اسلام الدین کے کہنے کے مطابق خود میرآجی نے اور بقول میرآجی اُن کے بھائی نے اُنھیں پہنچایا۔۔۔ ورنہ

حمزہ کا قصّہ ہُوا عشق کا چرچا نہ ہوا

(نقوش نمبر ۱۵، ۱۶، ۱۹۵۰ء)

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 109 (1,1)

انتظار حسین

شخص اور شاعر

''ذکرِ میر'' میں آیا ہے کہ ایک درویش میر احسان اللہ خاں تھے۔ کوئی اُن کے گھر جا کر پکارتا تو وہ کُنڈی کھول کر باہر آتے، کہتے کہ:

''احسان اللہ گھر پر نہیں ہے اور پھر اندر جا کر دروازہ بند کر لیتے۔''

اور ''الف لیلیٰ'' میں خلیفۂ بغداد کی داستان ملتی ہے کہ راتوں کو بھیس بدل کر شہر میں گشت کرتے تھے اور رعایا کا حال معلوم کرتے پھرتے تھے۔ گھر پر ہوتے ہوئے گھر پر نہ ہونا اور بھیس بدل کر شہر میں گشت کرنا مجھے تو ذات اور شخصیت کی حکایت معلوم ہوتا ہے۔ عام آدمی تو شاید یہ روگ نہیں پالتا لیکن ادیب بے چارہ شامت کا مارا اپنی ٹوٹی پھوٹی شخصیت کے تلے اپنی ذات کا بوجھ بھی اُٹھائے پھرتا ہے۔ مگر میراجی کا المیہ ایک اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اُن کے چند احباب بھی تھے جنھیں اُن سے جذباتی لگاؤ تھا اور اب اور بڑھ گیا ہے۔ ''میں اور میراجی'' قسم کے عُنوانات رکھنے والے مضامین ہم سب نے پڑھ رکھے ہیں اور میراجی کی قیمت پر یاروں کا پرچار ہوتے خوب دیکھا ہے۔ ان مضامین کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ آدمی کتنا مجبور ہے اور وہ بھی اپنے ہاتھوں۔

میں نہ میراجی کے حلقۂ احباب سے تعلق رکھتا ہوں نہ اُن کا ہم عصر ہوں۔ وہ اور نسل کے آدمی ہیں اور میں اور نسل کا آدمی ہوں۔ پس مجھے نہ اُن سے ذاتی لگاؤ ہے نہ ایسی ہمدردی ہے لیکن بچپن سے اِتنا ضرور سُنتا آیا ہوں کہ ایک مردِ درویش تھے جن کا جسم رات کو ٹکڑے ٹکڑے ہو جایا کرتا تھا مگر صبح ہونے پر وہ جُڑ بھی جایا کرتا تھا۔ میراجی پر لکھی گئی تحریروں میں شخصیت کے بکھرے ہوئے پہلو بکھرے ہوئے ہی رہے۔ اُن میں ترتیب اور ربط تو تب ہی نظر آتا، جب شخصیت کی اوپری سطح سے گزر کر ذات کی گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی۔

میراجی گرمیوں میں اوورکوٹ پہنتے تھے۔ میراجی کے ناخنوں میں میل پھنسا رہتا تھا۔

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 110 (1,1)

میراجی ہاتھ میں تین پنی کے گولے رکھتے تھے۔ میرآجی نے میرآسے عشق کیا۔ میرآجی شراب پیتے تھے۔۔۔۔۔ یہ سب واقعات ہیں۔ یہ تمام تجربے کن کیفیات سے گزر کر شاعر کے لیے واردات بنتے ہیں، ذات کی گہرائی میں کس کس جذبے اور کس کس خیال سے مل کر نیا جنم لیتے ہیں، اصل بات تو جاننے کی وہ ہے۔ فیض صاحب نے میرآجی کے تنقیدی مضامین کو اُن کی شاعرانہ شخصیت کی نفی ٹھہرایا ہے۔ آخر فیضؔ صاحب بھی تو اسی نسل سے ہیں جو ذات کو شخصیت سے عبارت کرتی تھی اور شخصیت کو نرالا پن سمجھتی تھی اور اس کا عکس تحریر میں تلاش کرتی تھی۔ اس تصوّر کا کرشمہ تھا کہ پچھلے دور میں افسانے کے کردار زمین سے بالشت بھر اُونچے اُٹھے ہوتے تھے اور افسانہ نگار اور شاعر پنجوں کے بل چلتے تھے اور کردار بُننے کی کوشش کرتے تھے۔

میرآجی کے شخصیت نگاروں نے اُن کے شخصی واقعات کو خوب مزے لے لے کر لکھا ہے۔ اُن کی پیش کی ہوئی شخصیت کو ذات سمجھا گیا اور اُن کی شاعری میں اس کا عکس تلاش کیا جانے لگا۔ اُن کی نگارشات کے کسی حصّے سے اس تصوّر کی نفی ہوتی نظر آئی تو اسے میرآجی کی شاعرانہ شخصیت کی نفی قرار دیا گیا۔ میرآجی کے جن تنقیدی مضامین کو فیضؔ صاحب نے اُن کی شاعرانہ شخصیت کی نفی ٹھہرایا ہے وہ اصل میں افسانوی میرآجی کی نفی ہیں۔

بات یہ ہے کہ ایک تو ایسے شاعر ہوتے ہیں جو اپنے باطن سے غرض رکھتے ہیں، شعر کہتے ہیں اور اس سے مطلق دلچسپی نہیں رکھتے کہ دوسرے کیا سوچتے اور کیا کہتے ہیں، مگر بعض لکھنے والے اِس قماش کے ہوتے ہیں جنھیں تخلیقی مصروفیت میں اکیلا رہنا گوارا نہیں ہوتا۔ اُنھیں یہ چٹیک لگی رہتی ہے کہ جس طرزِ احساس کو اُنھوں نے اپنا لیا ہے اُسے دوسروں تک بھی پہنچا دیں، تاکہ تخلیق کا کٹھن اور لمبا رستہ سنگت میں طے ہو۔ یہ تمنّا اُن سے شعر و افسانے کے سوا بھی مختلف کام کرواتی ہے۔ میرآجی شاید اِسی قماش کے شاعر تھے کہ اُنھیں شعر کہنے کے سوا بھی فکریں رہیں۔ ایک ادبی انجمن میں شامل ہو کر اُسے تحریک بنانے کی کوشش کی۔ ''ادبی دُنیا'' سے مُنسلک ہوئے۔ پھر ''خیال'' نکالا، کبھی غیر زبانوں سے شعر کے ترجمے کیے، کبھی اپنے ہم عصروں کی نظموں کی تفسیریں کیں۔ کبھی شاعروں پر

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 111 (1,1)

مضامین لکھے۔ میرؔ آجی کو پراگندہ طبع سمجھنے والوں کو شاید ان سرگرمیوں میں بھی پراگندگی نظر آئے۔ سب سے زیادہ پراگندگی تو اُنھیں اِس بات میں نظر آنی چاہیے کہ ایک مضمون بیسویں صدی کے کسی یورپین شاعر پر ہے تو دُوسرا قدیم ہند کے کسی شاعر کے بارے میں۔

کبھی وہ بات فرانس کے ادب کی کرتے ہیں اور کبھی کوریا اور جاپان میں نکل جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ادب میں روایت سے بغاوت کا عجب ڈھنگ ہوتا ہے۔ کوئی نیا خیال اچانک آلیتا ہے اور ساتھ ہی کوئی بہت پرانی بات یاد آجاتی ہے۔ اظہار کے نئے طریقے دِلوں کو کھینچتے ہیں اور اسی کے ساتھ روایت کی کسی گم شدہ کڑی سے رِشتہ اُستوار کرنے کی حسرت بھی پیدا ہو جاتی ہے مگر میرؔ آجی کے دور کا انداز نرالا تھا۔ قدیم کا احساس تو سِرے سے غائب تھا اور جدیدیت ایک افواہ کی صورت میں یاروں تک پہنچی تھی۔ میرؔ آجی یہ کوشش کرتے نظر آتے ہیں کہ جو نیا خیال افواہ کی صورت ادیبوں کو اُڑ کر لگا ہے وہ اُن کے طرزِ احساس کا حصہ بن جائے اور یہ کہ اُردو زبان و ادب کی جو کڑیاں گم ہیں اُنھیں تلاش کیا جائے اور کڑیاں مضبوط کی جائیں تاکہ نیا خیال ہمیں بہانہ بنا کر نہ لے جائے، بلکہ ہماری زمین میں پیوست ہو جائے۔ گویا وہ فکر و احساس کی دو طرزوں کے سنجوگ کے لیے کوشاں تھے۔

اِس طرح سے دیکھیے تو میرؔ آجی کی روایت سے بغاوت ایک محدود روایت کو توڑ کر ایک وسیع تر روایت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ اِس لحاظ سے وہ ایک طرف روایت پرست اور دوسری طرف اپنی نسل کے کیا سیاسی اور کیا غیر سیاسی دونوں طرح کے ادیبوں سے مختلف ہیں۔ روایت سے بغاوت اُن کے یہاں بدلے ہوئے طرزِ احساس کو سمجھنے اور اپنانے کی کوشش ہے۔ اِس اعتبار سے اُن کے وہ کوتک بھی سمجھ میں آسکتے ہیں جو وہ اپنی ذات کے ساتھ کر رہے تھے۔ کہیں اُنھوں نے یہ تو نہیں ٹھانی تھی کہ روایت کے سائے میں پلی ہوئی شخصیت ہی کو توڑ پھوڑ دیا جائے اور اپنے اندر نئے انسان کو جنم دیا جائے اور یہاں سے مجھے گمان ہوتا ہے کہ میرؔ آجی صرف خلق خدا کی بھلائی کے لیے شاعروں پر تعارفی مضامین نہیں لکھ رہے تھے، وہ کچھ اپنا

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 112 (1,1)

بھلا بھی کرنا چاہتے تھے۔اب مجھے پھر خلیفہ ہارون الرّشید یاد آ گئے۔رنگ رنگ کے شاعروں کو ترجمہ کرنا، اُن کی شخصیتوں کو کُریدنا، اُن کی ذہنی اپچ کا سُراغ لگا لینا۔بھیس بدل کر رات کو بغداد میں گشت کرتے پھرنے والی بات ہے۔یوں بغداد والوں کی خبر گیری کے ساتھ خلیفہ ہارون الرّشید اپنے تجربات میں تنوع اور اپنی ذات میں وسعت بھی تو پیدا کرتے تھے۔

میرا جی ان مضامین میں ایک تو شاعری اور ذات کا تعلق سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ساتھ ساتھ اپنی ذات کی گم شدہ کڑیوں کی تلاش بھی کرتے نظر آتے ہیں۔

لارنسؔ، باڈیلیئر اور پوؔ کی شخصیتوں کا جس طرح اُنھوں نے تجزیہ کیا اُس سے تو یہ صاف پتا چلتا ہے کہ میرا جی اُن کے واسطے سے اپنے آپ کو بھی کرید کرید کر دیکھ رہے ہیں اور سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔پھر اُنھوں نے ایسے شاعروں کی شخصیتوں کو بھی ٹٹولا ہے جن سے اُن کی شخصیت کا بظاہر کوئی ربط نظر نہیں آتا۔شاید وہ یہ بساط بھر جان لینا چاہتے ہیں کہ شاعر کس کس طور سے جیتے ہیں۔اُن کی ذاتیں کس کس طرح بنتی بگڑتی ہیں، کیا کیا روپ دھارتی ہیں اور تخلیقی نفس پر کن کن صورتوں سے اثر انداز ہوتی ہیں۔

خود شناسی کا یہ عمل اپنی ذات کی گم شدہ کڑیوں کی تلاش کی حیثیت بھی رکھتا ہے اور اپنی ذات کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے بکھیر دینے کا معاملہ بھی ہے۔ذات کی نئی تعمیر کے لیے شاید یہ تخریب تمام لازم بھی ہے۔میرا جی فسانۂ عجائب کے جان عالم کی طرح ایک قالب سے دوسرے قالب میں جاتے ہیں، مگر اس مقصد کے ساتھ کہ اپنے قالب کو نئے سِرے سے تشکیل دے سکیں۔اِس عمل کو میرؔ صاحب شعور سے جنون کرنا کہتے ہیں۔ڈاکٹر ضیاء الدین کے متعلق مشہور کرتے ہیں کہ وہ شام کو چہل قدمی کر کے گھر کو واپس آئے تو اپنی چھڑی کو اپنے بستر میں لٹا دیا اور خود کونے میں چھڑی کی جگہ لگ کر کھڑے ہو گئے۔شاید یہ ریاضی داں والی یہ معروضیت اپنے آپ سے دور ہو کر اپنے آپ کو مشاہدہ کرنے کی یہ صلاحیت میرا جی بھی اپنے میں پیدا کرنے کے لیے کوشاں تھے۔اپنی شخصیت میں مقیم انسان کے معاشرہ میں اس کوشش کا نتیجہ بالعموم یہ ہوتا ہے کہ آدمی ڈاکٹر

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 113 (1,1)

ضیاءالدین ہوتو اُس سے بہت سے لطیفے منسوب ہو جاتے ہیں اور میرآجی ہوتو اُس کے خاکے لکھے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر ضیاء الدین کی چھڑی کی بات چل نکلی ہے تو اب مجھے کافکا کی چھڑی یاد آرہی ہے۔اس شخص پر بھی اعصابی مریض ہونے کی تہمت ہے۔اُس نے کہا تھا کہ:

''بالزاک ایک چھڑی لے کر چلتا ہے جس پر یہ مقولہ کُھدا ہوا تھا''میں ہر رکاوٹ کے پرخچے اُڑا دیتا ہوں،اور میرا مسلک یہ ہے کہ ہر رکاوٹ میرے پرخچے اُڑا دیتی ہے۔''

کافکا کا یہ رویہ اُس صوفی کے رویے سے چنداں مختلف نہیں جس کے اعضاء روز رات کو بکھر جاتے تھے۔میرآجی کے ہاتھ میں جو پنّی کے تین گولے رہتے تھے مجھے اندیشہ ہے کہ اُن پر بھی تو اسی قسم کی عبارت لکھی ہوئی نہیں تھی، کیونکہ میرآجی کو بھی اپنے پرخچے اُڑوانے کا بہت شوق تھا۔ جانے کیا کیا روگ اپنی جان کو لگا رکھے تھے۔ایک بے ہنگم سا عشق تھا۔اس میں اپنے آپ کو ضائع کیا۔کچھ جنسی آسودگیوں کو خوب پالا، پرورش کیا اور اپنے آپ کو خراب کیا، بال بڑھائے، پنّی کے گولے بنا کر ہاتھ میں رکھے اور بے ڈھنگی چال اختیار کی۔شاید وہ اپنی ذات کے ساتھ بھی تجربے کر رہے تھے۔اِس عمل میں ایک چھوٹا سا حادثہ اُن کے ہم عصروں اور ہم نشینوں کے ساتھ بھی گزر گیا۔وہ یہ کہ اُنھوں نے اِس صوفی کے اعضاء الگ الگ پڑے ہوئے دیکھ لیے مگر یہ نہ دیکھ سکے کہ یہ اعضاء کس طرح جُڑتے ہیں اور جو نئی شخصیت بنتی ہے وہ کیا ہے۔

ویسے صوفی اپنے مریدوں سے اور شاعر اپنے شاگردوں سے اور بادشاہ اپنے وزیروں سے یہ فریب کرتے رہے ہیں کہ اُنھیں یوں ساتھ رکھتے ہیں مگر اصل موقع پر اُنھی چھٹی دے دیتے ہی۔یوں سمجھیے کہ اُنھیں سو داؤں سکھا دیتے ہیں مگر ایک سو ایک ویں داؤں کی ہوا نہیں دیتے۔اس ایک سو ایک ویں داؤں کو نہ بتا کر وہ اپنے آپ کو اُن سے چُھپا لے جاتے ہیں اور اِس طرح اُن میں اپنا تصوّر چھوڑ جاتے ہیں جیسے ریڈؔ نے ورڈز ورتھ کے تذکرے میں افسانوی شخصیت کہا ہے۔

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 114 (1,1)

میرؔ آجی کے پُرزے اُڑے اور اپنے پرایوں نے تماشا دیکھا مگر اس سے بھی اہم تماشا یہ ہے کہ یہ پرزے آپس میں پھر جڑتے ہیں اور ان سے شاعر میرؔ آجی جنم لیتا ہے۔ پتّی کے گولوں سے لے کر تنقیدی مضامین تک ساری سرگرمیاں کسی نہ کسی راستے اُن کی شاعرانہ شخصیت سے وصل کرتی نظر آتی ہیں۔ اُن کے ہم عصر روایت سے بغاوت کر رہے تھے۔ یہ اکہری بغاوت تھی۔

میرؔ آجی روایت سے بھی لڑ رہے تھے۔ اپنے آپ سے بھی لڑ رہے تھے۔ یہ محاذ دو ہیں مگر جنگ ایک ہے۔ روایت جتنی باہر ہوتی ہے، اُس سے زیادہ اندر ہوتی ہے۔ وہ تو آدمی کے اندر سمائی ہوتی ہے۔ ''کشف المحجوب'' میں ایک جگہ یوں کہا گیا ہے کہ:

''اپنے آپ کو دیکھنے میں تیری ہلاکت ہے۔''

میرؔ آجی بے شک ہلاک ہو جائیں مگر وہ اپنے آپ کو دیکھنے سے باز نہیں رہ سکتے۔ اپنے آپ کو دیکھنے کے لیے وہ آریائی اصل تک جانا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف وہ حال میں اپنے آپ کو دریافت کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ اپنے ذہنی اور روحانی رشتہ داروں میں اُنھوں نے مہارانی میرؔ ابائی اور جیمز جینز اور آئن سٹائن کے ایک سانس میں نام لیے ہیں۔ اس طرح اُن کا ذہن ''جیتا جاگتا بندر ابن'' بھی بنا ہوا تھا اور نئی فکر سے بھی اس کا رشتہ مل رہا تھا۔

آئن سٹائن کا نام لیتے ہوئے اُنھوں نے بریکٹ میں لکھا ہے کہ:

''جس کے نظریۂ اضافیت کو میں نہیں سمجھ سکتا۔''

اور فرانسیسی ادب کے پاکستانی شاوروں کو شک ہے کہ میرؔ آجی فرانسیسی شاعری کو بھی نہیں سمجھ پائے تھے۔ مگر چونکہ میرؔ آجی کسی کالج میں پڑھانے پر لگے ہوئے نہیں تھے اِس لیے اس میں ایسا مضائقہ نہیں۔ عقلی سطح پر چیزوں کو سمجھنا اور خیالات کو گرفت میں لانا ایسا مشکل نہیں ہوتا مگر جب وجدان کی سطح پر یہ کام ہو رہا ہو تو چیزیں اور خیالات اِتنے واضح نہیں رہتے۔

ہمارے ہاں سرسیّد احمد خاں کے زمانے سے نئے خیال سے اور مغربی ادب سے رِشتہ جوڑنے کی کوششیں ہو رہی تھیں مگر غیر تخلیقی طور طریقے پر۔ میرؔ آجی یہ رِشتہ تخلیقی طور پر قائم

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 115 (1,1)

کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اِس لیے ظاہر ہے کہ انگریزی ادب کو وہ اس طرح نہیں سمجھ سکتے تھے جس طرح پروفیسر کلیم الدین احمد سمجھتے تھے اور فرانسیسی شاعری اُن کی مُٹھی میں اس طرح بند نہیں ہوسکتی تھی جیسے پروفیسر محمد حسن عسکری کی مٹھی میں بند تھی۔ جس طرح پھٹے ہوئے دُودھ میں پھٹکیں تیرتی ہیں، اس طرح میرؔاجی کے زمانے کے ادب میں کچھ مارکسیت، کچھ فرائڈ، کچھ ایلیٹ، کچھ گورکی، کچھ موپساں پھٹکوں کی طرح تیرتے دِکھائی دیتے ہیں۔ میرؔاجی کی شاعری کم ازکم پھٹا ہوا دُودھ نہیں ہے۔ اُن کے طرزِ بیان تک میں نیا لہجہ اور پرانا لہجہ شیر وشکر ہیں۔

تنقیدی مضامین کی بھی نثر کی کیفیت یہ ہے کہ اسے مردہ علمی زبان بھی نہیں کہا جاسکتا اور وہ کوثر میں دُھلی ہوئی اُردو بھی نہیں ہے۔ اس میں ہندی لہجہ کی تجدید کی گئی ہے اور ساتھ ہی یوں لگتا ہے کہ فقرے کچھ انگریزی نثر کی وضع کے ہیں۔ یوں اِس نثر کا ایک نیا سا ذائقہ ہوگیا ہے۔ یوں ذائقہ بدلنے کے لیے بعض لکھنے والوں نے تھوڑے ہندی الفاظ حفظ کرلیے ہیں اور بعض انگریزی تنقید کی اصطلاحوں کے اُردو مترادفات کی فکر میں غلطاں رہتے ہیں۔

میرؔاجی کے طرزِ بیان کی یہ نئی رنگت خالی ادب و زبان کے مطالعے کا فیض نہیں ہو سکتی۔ خالی ادب و زبان کا مطالعہ تو بس اتنا ہی فیض پہنچا سکتا ہے کہ سیمابؔ اکبرآبادی اقبالؔ کی زبان کی غلطیاں نکالیں اور ڈاکٹر عبدالودود اور اُن کے پاکستانی شاگرد غالبؔ پر افسوس کریں کہ وہ اُردو اور فارسی نہیں جانتا تھا۔ خالی ادب و زبان کا مطالعہ طرزِ بیان میں تو کیا تبدیلی لائے گا وہ تو بدلے ہوئے طرزِ بیان کو بھی نہیں سمجھنے دیتا۔

میرؔاجی کے شعر و نثر میں جو نیا طرزِ بیان نظر آتا ہے وہ اصل میں اُس خانہ جنگی کا ثمر ہے جو شاعر کے اندر برپا تھی۔ روایت کے سائے میں پلی ہوئی شخصیت کو توڑ پھوڑ کر ایک نئی شخصیت تعمیر کرنے کی جدوجہد تحریر پر اثر انداز ہونی ہی تھی۔ اُنھوں نے گیت لکھنے کے لیے کبیرؔ جی اور مہارانی میرؔابائی سے شبد اخذ نہیں کیے تھے۔ وہ ہندی روایت میں اپنی جڑوں کو تلاش کر رہے تھے اور مغرب کی نئی شاعری سے اُنھوں نے یکمشت استعارے اور تشبیہیں مستعار نہیں لی تھیں، بلکہ اس

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 116 (1,1)

طرزِ احساس پر اُن کے دانت تھے۔ وہ نئے اور پرانے طرزِ احساس کو ملا کر ایک نئی طرح کی شاعری کرنے کی کوشش میں تھے۔

جس شخص نے اپنے آپ کو اتنے شعور کے ساتھ بدلنے کی کوشش کی ہو اُس کے یہاں مشکل پسندی شاید اُس کی ذاتی مجبوری تو نہیں ہوسکتی۔ ایلیٹ کا خیال یہ ہے کہ شاعری میں مشکل پیش آنے کے تین سبب ہوسکتے ہیں۔

> ''ایک سبب تو یہ ہوسکتا ہے کہ قاری کو پہلے سے ڈرا دیا جائے کہ دیکھو بھئی یہ شاعر بہت مشکل ہے۔ دوسرا سبب یہ ہوسکتا ہے کہ قاری شاعری کے نئے پن کو دیکھ کر بدک جائے۔ تیسرا سبب یہ ہوسکتا ہے کہ شاعر شخصی اسباب کے ہاتھوں مجبور ہو اور مشکل پسندی سے اُسے چارہ ہی نہ ہو۔''

مگر جس شاعر نے سیدھے سچے گیت اور شگفتہ رواں غزلیں لکھی ہوں اُسے تو مشکل پسندی پر مجبور نہیں سمجھا جاسکتا۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ قاری کو میرؔاجی کی شاعری سے ڈرایا بہت گیا ہے۔ اب وہ اُن کی نظموں کی طرف جاتا بھی ہے تو ڈرا ڈرا۔ اور پھر اُن کے نئے پن کو دیکھتے ہی بدک جاتا ہے لیکن اتنا بھی ڈر کیا۔ میرؔاجی کوئی ہَوّا تو نہیں ہیں۔ یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ شاعری میں مشکل پسندی اکثر شاعر کی کسی سنجیدہ تخلیقی اُمنگ کا بھی نتیجہ ہوتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میرؔاجی جس طرح اپنے اندر ایک پرانی شخصیت کو مار کر ایک نئی ذات کی تخلیق کے لیے کوشاں تھے، کچھ اسی قسم کی کوششیں وہ شاعری میں بھی کر رہے ہوں۔ کہیں یہ مشکل پسندی نئے اور زیادہ گہرے معنی کی تلاش تو نہیں۔ کہیں یہ مشکل پسندی صداقتِ احساس کی خاطر تو نہیں۔ جدید عہد میں انسان کا تجربہ سیدھا سادہ نہیں۔ مثلاً آگے لوگ مذہبی ہوا کرتے تھے یا دہریے ہو جاتے تھے، مگر اب مذہبیت اور دہریت کے درمیان بہت سے پیچ در پیچ راستے پیدا ہو گئے ہیں۔

میرؔاجی جس نئے خیال سے رشتہ جوڑنے کے لیے کوشاں تھے اُس نے آدمی کے اندر سو طرح کے خوف، شکوک، مایوسیاں اور پریشانیاں پیدا کی ہیں۔ چیزوں کے بارے میں اس کا رَدِّ عمل پیچیدہ اور متضاد قسم کا ہوتا ہے۔ یوں سمجھیے کہ بیسویں صدی کیا آئی سچ مُچ چودھویں صدی آ

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 117 (1,1)

گئی ہے اور قیامت پر جس کا ایمان نہیں رہا ہے وہ بھی کسی نہ کسی قیامت سے ڈرتا رہتا ہے۔ ایسی صورت میں تجربے کا سیدھا سچا بیان بھی پیچیدہ ہوسکتا ہے اور یہاں پھر ایلیٹ کو یاد کیجیے جو کہتے ہیں کہ:

> ''جدید تہذیب بہت سی پیچیدگی اور تنوع کو احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ تنوع اور پیچیدگی جب منجھے ہوئے شعور پر اثر انداز ہوگی تو اس سے اثرات بھی اتنے ہی پیچیدہ اور متنوع پیدا ہونے چاہئیں۔ اِس لیے اب شاعر کو زیادہ ایمائیت سے کام لینا پڑتا ہے اور ضرورت پڑے تو معنی سمونے کی خاطر زبان کی توڑ پھوڑ بھی کرنی پڑتی ہے۔''

ویسے یہ بات اِتنی مختصر نہیں ہے جتنی مختصر کر کے میں نے یہاں پیش کر دی ہے مگر یہ میرا موضوع بھی تو نہیں ہے۔ میں تو صرف اتنا اشارہ کر رہا ہوں کہ اگر نئے زمانے کے کسی لکھنے والے کے ہاں ابہام اور پیچیدگی نظر آئے تو اُسے اس راستے سے بھی سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے اور میرؔ آجی کے سلسلے میں تو یہ بات لازماً ذہن میں رکھنی چاہیے کہ وہ تو اس نئے طرزِ احساس کی خاطر زبان تو کیا اپنی ذات سے بھی برسرِ پیکار تھے۔

اپنے آپ سے لڑنا، روایت کے ماتحت بنی ہوئی شخصیت کو توڑ پھوڑ کر نئے سِرے سے اُسے تعمیر کرنا کہ وہ نئے طرزِ احساس کی حامل بن سکے ایک درد بھرا عمل ہے۔ اس سفر میں مسافر بہت رنج کھینچتے ہیں۔ یوں شعر وافسانہ نہ درد و کرب سے مخصوص ہیں نہ آسودگی اور خوشحالی کے مرہونِ منت ہیں مگر دیکھا گیا ہے کہ لکھنے والوں کی کم نصیب برادری کو وقتاً فوقتاً ایک آدھ قربانی ضرور دینی پڑتی ہے۔ شاعری بعضوں کے لیے ذریعۂ عزت ہوتی ہے، بعض کے لیے فیشن مگر کسی کسی کو وہ بارِ امانت اُٹھانا پڑتا ہے جنھیں پہاڑ بھی اُٹھانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ وہ صلیب پر چڑھتا ہے اور دردِ دل جمع کر کے دیوان کرتا ہے۔ میرؔ آجی نے لارنس کو جو خراج پیش کیا تھا وہی شاید میرؔ آجی کو بھی پیش کرنا درست ہو کہ:

> ''اگر وہ اپنے آخری ایام میں ایک ایسا ڈھانچہ بن کر رہ گیا جو ناممکن خوابوں میں کھو کر اُن کی پرورش کر رہا ہو تو یہ صورتِ حال سہنے والے کے لیے تو المناک اور دردانگیز تھی

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 118 (1,1)

لیکن ہم دور سے دیکھنے والوں کے لیے، خارجی تماشائیوں کے لیے اِس درد، اس کی اذیّت، اُس کی تیرہ بختی ایک اُجالا تھی۔ علم کا ایک نور۔ وہ اپنے تجربات کے بارِ گراں میں ہمارے لیے زندگی بسر کر گیا۔ اُس کو سراہنا ہمارے ذمّے ہے، ہمارا فرض ہے۔"

نامرادانہ زیست کرتا تھا
میرؔ کا طور یاد ہے ہم کو

(علامتوں کا زوال)

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 119 (1,1)

تابش دہلوی

میراجی میرا دوست

سنہ ۴۳ء کا ذکر ہے ایک دن آل انڈیا ریڈیو دِلّی کے براڈ کاسٹنگ ہاؤس پہنچا تو ن۔م راشد کے کمرے میں میراجی کو بیٹھے دیکھا۔ میراجی درمیانے قد کے آدمی تھے، اکہرا بدن، کتابی چہرہ، تیکھے خدوخال، سیدھی چوڑی پیشانی، گندمی رنگ، چوڑا سینہ، اُبھرواں ستواں ناک، چمک دار گہری آنکھیں، پتلے اور پیوست ہونٹ، دانت خوب صورت اور مضبوط، ہاتھ لمبے اور چوڑے شانوں تک بال، مگر ہیئت کذائی یہ کہ ایک ہاتھ میں لوہے کے گولے، دوسرے میں کاغذوں کا پلندہ، گرمیوں میں جسم پر موٹا بدرنگا گرم کوٹ، ٹانگوں میں میلی گرم پتلون اور پاؤں میں بھدّے انگریزی جوتے۔

راشدؔ نے مجھے اُن سے ملایا، نام تو پہلے ہی سُنا تھا۔ ہیئت کذائی اور خط و خال دیکھ کر دلچسپی بڑھی اور دس پندرہ منٹ میں یوں محسوس ہوا کہ برسوں کی دوستی ہے۔ میراجی اپنی محبّت اور نفرت میں بڑے کھرے تھے۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں اپنی دوستی اور نفرت کا اظہار نہایت بونگے طریقے سے کر دیتے تھے۔ بولے: ''آپ چائے پیئیں گے؟'' میں نے کہا ''پی لوں گا۔'' ''راشد! اِن کے لیے چائے منگا دو، صرف اِن کے لیے، میری چائے میرے پاس ہے۔'' اور یہ کہہ کر اُنھوں نے ایک اٹیچی سے شراب کی بوتل نکالی اور مُنہ لگا کر دو گھونٹ انڈیل گئے۔ بوتل جگہ پر رکھ دی اور اپنی کسی تازہ نظم پر راشدؔ سے گفتگو کرنے لگے۔ راشدؔ اُن کی نئی نظم کے کوئی پرانے معنی اُن کے ذہن نشین کرا رہے تھے جن کے قبول کرنے سے وہ منکر تھے۔ اِس دوران میں چائے آ گئی اور چائے پی کر ہم دونوں جدا ہو گئے اور یہ تھی میراجی سے میری پہلی ملاقات۔ اس کے بعد تقریباً ہر روز میراجی سے ملاقات ہوئی۔ وہ روز بروز زیادہ بے تکلّف اور قریب ہوتے گئے۔

رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ میراجی غیر معمولی صلاحیتوں کے آدمی ہیں۔ وہ اچھے ادیب، اچھے

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 120 (1,1)

شاعر ہونے کے علاوہ اچھے مطالعے کے آدمی ہیں۔اس زمانے میں یہی مشکل کام ہے،اُن کی نظر اُردو ادب کے ساتھ ساتھ سنسکرت، ہندی اور انگریزی ادب پر بھی تھی۔وہ ادبی بحثوں میں کبھی رُعب ڈالنے کی کوشش نہیں کرتے تھے بلکہ پہلے معقولات سے بحث کرتے اور اگر دوسرا آدمی دو چار کتابوں کے نام لے کر اُنھیں مرعوب کرنے کی کوشش کرتا تو وہ ایسے کتابوں کے حوالے دیتے کہ جواب مُسکت ہوتا۔

رفتہ رفتہ یہ ملاقاتیں دوستی میں تبدیل ہوگئیں۔میرآجی، ن م راشدؔ، اخلاق احمد دہلوی، انصارؔ ناصری، مختارؔ صدیقی، خلیل الرحمٰن اور میں دفتر کے بعد بھی ایک دوسرے کے ساتھ رہتے۔کبھی کبھی وہ کتب خانۂ علم و ادب بھی آجاتے جہاں شاہد احمد دہلوی اور اُن کے احباب پھڑ جمائے ہوتے۔ایک دوسرے کے ساتھ رہنے میں ادب سے لے کر فحاشی تک سینکڑوں مرحلے اور لطیفے بلا ناغہ گزرتے۔میرآجی اپنے حُلیے کے ساتھ مزاج کے بھی بڑے اُول جلول آدمی تھے۔کبھی تین تین فاقے ہیں اور کبھی پانچ پانچ روپے کی آئس کریم اکیلے کھا جاتے۔کبھی چھ چھ ہفتے نہیں نہاتے اور کبھی دن میں دو، دو دفعہ نہاتے۔شاعری اُن کی فطرت میں رسی بسی تھی۔وہ احساسِ حُسن کی شدت کو شاعری کا نام دیتے، خوب صورت چہرہ، اچھی بات، دلکش نغمہ، دلفریب منظر اُن کے نزدیک سب شعر تھے۔کوئی اچھا چہرہ دیکھا اور اُنھوں نے نعرہ لگایا ''شعر ہوگیا۔'' پوچھنے والوں نے پوچھا کہاں؟ اُنھوں نے اشارہ کیا ''وہ دیکھو۔'' کوئی پُرلطف بات سُنی اور اُنھوں نے کہا ''شعر ہوگیا۔'' اچھا نغمہ سُن کر وہ زاروقطار روتے، خوب صورت چہرے اُن کی تکلیف میں اضافہ کا سبب ہوتے، اچھا منظر اُنھیں غمگین کر دیتا۔غرض احساس کی یہ شدتیں اُن کے لیے سُوہانِ رُوح تھیں۔اُنھوں نے اِن سے فرار کی بہت سی راہیں نکال لی تھیں۔وہ شراب زیادہ پینے لگے تھے۔ہر وقت نئی نئی اور عجیب باتیں کر کے وہ اپنا دل بہلاتے اور توجّہ بٹاتے مگر ان سب باتوں میں کوئی بناوٹ نہیں ہوتی تھی۔ وہ سچے آدمی تھے اور اسی سچائی کو وہ ہر جگہ دیکھنا چاہتے تھے۔یہ اُن کی زیادتی تھی۔دُنیا اور دُنیا کے تعلقات میں، فطرت میں، ذہن و فکر میں اور اُن کے خدوخال میں غرض اپنے اِردگرد کی ہر چیز کو

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 121 (1,1)

وہ اپنے ذہن کی مطابقت سے دیکھنا پسند کرتے۔ فرار کی یہ راہیں اکثر اُنھیں مہنگی پڑتیں۔ وہ اکثر لوگوں کی خشونت کا شکار ہو جاتے۔ بعض اوقات وہ غم خریدتے اور اس غم کی قیمت صرف ذہنی صعوبتوں کی صورت ہی میں نہیں، روپیوں کی شکل میں بھی ادا کرنی پڑتی، جس کا نتیجہ اُن کی مالی مشکلوں میں رُونما ہوتا۔ وہ بے تکلّف دوست ہی سے نہیں، غیروں سے بھی سوال کر بیٹھتے مگر حقیر ہو کر نہیں، اپنا حق جتا کر۔ وہ دوسروں کے مال کو اپنا اور اپنے مال کو دوسروں کا مال سمجھتے اور اِس طرح وہ اپنی ذہنی اور دِلی سوگواریوں میں خوش رہنے کی کوشش کرتے۔

وہ نسوانی حُسن سے بہت متاثر ہوتے اور یہ تاثر بعض وقت یہاں تک اُن پر جادو کرتا کہ وہ دیواروں سے اپنا سر پھوڑتے اور لہولہان ہو جاتے۔ ایک صاحبہ جن کے نام کا ایک جُزو اختر تھا اُن کو بہت دردناک عذاب میں مبتلا رکھتیں۔ یہ صاحبہ مجھ سے زیادہ مانوس تھیں اِس لیے میرآجی مجھے ہمیشہ ''تابش اختر'' کہتے اور جب کوئی اپنی کتاب مجھے دیتے تو اُس پر اسی طرح کی عبارت لکھتے۔

مجھ پر اُن کی عجیب عجیب طرح کی مہربانیاں تھیں۔ ایک دفعہ ایک صاحبہ نے مجھے اصرار کر کے سینما کا ٹکٹ دیا اور کہا کہ میں ''جولیس سیزر اور قلوپطرا'' فلم ضرور دیکھ آؤں۔ میں نے یہ ٹکٹ لے لیا۔ اُس روز بُدھ تھا۔ میرا جی نے یہ واقعہ دیکھ لیا۔ اس کے بعد میرآجی ہر بدھ کو مجھے کسی جواں سال عورت سے سینما کے ٹکٹ کے پیسے لا کر دیتے۔ شرط جوان عورت کی تھی اور یہ سلسلہ کوئی ایک سال تک جاری رہا۔ ان جوان عورتوں سے اُن کے پیسے مانگنے کی ادا بھی عجیب ہوتی۔ کبھی وہ کہتے ''آپ کسی بھوکے کو ایک وقت کا کھانا کھلائیں گی''، کبھی شراب کا واسطہ دے کر، کبھی کوئی شرط باندھ کر یا لطیفہ سُنا کر وہ پیسے اینٹھتے اور مجھے لا کر دے دیتے۔

اُن کے مزاج کی ناہمواریاں بڑی دلچسپ ہوتیں۔ وہ دِلّی کے ایک محلّے قطب روڈ کے آس پاس رہتے تھے۔ ایک دفعہ رات کے دو بجے میرے گھر پہنچے جو دریا گنج میں اُن کے گھر سے کوئی سات آٹھ میل تھا۔ مجھے سوتے سے اُٹھایا، میں نے کہا ''خیریت؟'' بولے: ''پان کھانے کو

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 122 (1,1)

جی چاہا تھا، میں نے کہا کہ تابشؔ کے گھر چل کے کھایا جائے۔ بس سیدھا چلا آرہا ہوں۔"

وہ ریڈیو کے افسروں سے بہت ناخوش رہتے اور جتنا بڑا افسر ہوتا اُس سے اُن کی ناخوشی بھی اُتنی زیادہ ہوتی۔ ایک دفعہ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل اے ایس بخاری نے E.M. FOSTER کو جو دِلّی آئے ہوئے تھے، دعوت دی اور اُنھیں ایک مشاعرے کا نمونہ دکھانے کا منصوبہ بنایا۔ شاعروں میں چراغ حسن حسرتؔ، ڈاکٹر تاثیرؔ، فیض احمد فیضؔ، ن۔م راشدؔ، مولانا حامد علی خان، میرؔاجی، مختارؔ صدیقی، خلیل الرحمٰن، ضیا جالندھری اور میں بھی شریک تھے۔ ہمارے علاوہ اور بھی ادیب تھے۔ کھانے کے بعد شاعری کا دَور شروع ہوا اور اس کھانے اور مشاعرے کے درمیان میرؔاجی نے جو جو باتیں کیں اور جو جو لطیفے اُن سے سرزد ہوئے اُن کا بیان مشکل ہے۔ وہ نہایت برافروختہ تھے۔ وہ ہمیں لوگوں کے اصرار سے وہاں گئے تھے اور اگر ہم لوگ اُنھیں گھونٹ گھونٹ کر نہ رکھتے تو نہ معلوم کیا حشر ہوتا اور دوسرے دن نہ جانے کتنوں کی نوکری جاتی۔

اُن کے ذہن کی صعوبت عجیب عجیب روپ دھارتی تھی۔ ایک دفعہ قاری زاہر قاسمی کو ایک کمرے میں بند کر کے اُنھوں نے سورۂ رحمٰن سُنی اور پھر روتے روتے اور سر پھوڑتے پھوڑتے اُن کا جو حال ہوا اُس کا اندازہ اُن خراشوں اور چوٹوں سے کیا جا سکتا تھا جو چھ سات دن تک اُن کے سر میں اور چہرے پر رہیں۔ یہی حال جے جے ونتی راگ سُن کر ہوتا۔۔۔ وہ جے جے ونتی سے اِس طرح گھبراتے تھے جیسے گائے قصائی سے۔

حلقہ اربابِ ذوق کا دوسرا نام میرؔاجی ہے۔ قیوم نظرؔ دِلّی آئے اور حلقے کی شاخ قائم کی۔ میں سیکرٹری مقرر ہوا۔ عربک کالج میں اس کے باقاعدہ اجلاس ہونے لگے اور حلقہ کی بدولت بزرگوں اور نوجوانوں میں ادبی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ بزرگوں میں چراغ حسن حسرتؔ، ڈاکٹر تاثیرؔ، مولانا حامدؔ علی خان، حمید احمد خان، موجودہ وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی تھے اور نوجوانوں میں ہم سب ہی تھے۔ میرؔاجی بڑی سرگرمی سے پروگرام بناتے اور لوگوں کو ایک اتوار ہی سے دوسرے اتوار کی یاد دِہانی کراتے پھرتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ قیوم نظرؔ، یوسف ظفرؔ یا کوئی ادیب دِلّی

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 123 (1,1)

جاتا تو حلقے کی گہما گہمی اور بڑھ جاتی۔ میرا جی چائے پانی کا انتظام کرتے اور پیسے مہمانوں سے دلواتے۔ الطاف گوہر سے بھی وہیں ملاقات ہوئی تھی۔

میرا جی اپنی جگہ ایک انجمن میں ہزار انجمن تھے۔ اُن کی رنگا رنگ طبیعت اِس دُنیا کو کب ساز گار آسکتی تھی۔ وہ اُن بدنصیب لوگوں میں سے ہیں جنھیں دُنیا نے کبھی نہیں سمجھا۔ وہ شعور اور احساس کا جہنم تھے۔ چند آنسو اِس جہنم کو کیسے ٹھنڈا کر سکتے تھے۔ اُن کی بالیدہ روح دُنیا کے فشار میں گھٹتی رہی۔ اُن کا ذہن خیالات کا سمندر تھا، مگر طوفانی۔ اُن کی زندگی کی ناؤ اسی طوفانی سمندر کے ہچکولوں میں پرخچے پرخچے ہوگئی۔ اُن کی ایک نظم ''سمندر کا بلاوا'' بھی تو ہے۔ وہ دِلّی سے بمبئی اور بمبئی سے اللہ میاں کے یہاں چلے گئے۔ اب اُن کے احباب ہیں اور اُن کی یادوں کی مجاوری۔

خدا مجنوں کو بخشے مر گیا اور ہم کو مرنا ہے

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 124 (1,1)

میرا جی

جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

اے کاش! تم ایک دفعہ تو مجھ سے خفا ہوتے، مگر تم تو تھے۔۔۔۔۔بس کیا کہوں؟ اگر تم زندہ ہوتے تو کبھی ایک لائن بھی نہ لکھتی تم پر۔۔۔۔۔بیکار میں نہ جانے تم اپنی اُلٹی کھوپڑی میں کیا سمجھ بیٹھتے اور جو تمھاری تصویر اِس وقت میرے سامنے رکھی ہے، لو تم پھر مسکرائے۔ یہ تو میری عادت ہے تصویریں جمع کرنے کی۔ اِتنے ڈھیر سے دِنوں کے بعد سر سے اس کتاب میں سے اُچھل کر گر پڑی یہ تصویر۔۔۔۔بالکل اِس طرح۔

جیسے ہم سب سرسر کرتے ایک دفعہ ہی اس موٹی سی کتاب میں سے پھسل پڑے۔ اب کتاب تو بند ہو چکی ہے۔ اور ہم سب اس کے باہر پاکستان میں آنکھ کھولے سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ ہِل بھی نہیں سکتے۔ سُنا ہے کہ یہاں کی آب و ہوا میں اِس قدر غنودگی ہے اور یہ اتنا رنگ لیے ہوئے ہے کہ ہم بھی لوہے کے ٹکڑے بن بن کر آخر کار زنگ آلود ہو ہی گئے۔ سوچتے سوچتے پھر نیند آجاتی ہے۔ اِتنی ہمت نہیں کہ اُٹھ سکیں، چل پھر سکیں۔ آندھیوں کے انتظار میں لوہے کہ ٹکڑے حلقوں کی شکل میں بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ نہ جانے کتنی لمبی زنجیر ہے جس کی لمبائی ختم بھی ہوگی یا۔۔۔۔سوچو تو بھی لاکھ آندھیاں چلیں، کون ان کے ٹکڑے کرتا پھرے گا۔ کون ان کا زنگ اُتار کر چمکاتا پھرے گا۔ اور ہماری یہ حالتیں۔۔۔سر اٹھا کر کتاب کی اس اونچائی کو دیکھا اور گر پڑے۔ بہت ہی ذرا جذباتی ہوئے تو دو ایک نظمیں زنجیر کے آخری حصے تک پہنچا دیں۔ کسی نے کچھ قصیدے کہہ ڈالے۔ افسانوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ ایک جیسی کہانیاں۔ مرطوب ہوا میں لیٹے لیٹے جب کبھی لے دے کے چاند نظر آیا تو تھوڑا سا رومینٹک ہو

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 125 (1,1)

لیے۔ اِردگرد کے حلقوں میں بھی تھوڑی سی حرکت ہوئی اور پھر سو گئے۔ اس نیند کی بے خودی نہ پوچھو۔ ٹھنڈے میٹھے سہانے سپنے۔ ریشمی جھولے، پھلوں سے بھری قابیں، معطّر ہوائیں اور خوشبو میں بسے نزدیک نزدیک جسم ۔۔۔۔۔ کتنا قُرب ۔۔۔ ہاں یاد آیا ۔۔۔ اور تم اس وقت میرے کتنے قریب ہو۔۔ میں آج تمھیں کتنے غور سے دیکھ سکتی ہوں ۔ اِس وقت میں کتنی تنہا ہوں۔ زندگی بھر ترستے رہے کہ میں تم سے ڈھنگ سے بات ہی کر لیتی۔ مگر تم جانتے ہو کہ مرنے کے بعد بڑے بڑے فائدے ہیں۔ جنت و دوزخ کا ذکر اس وقت میں کرنا نہیں چاہتی۔ وہ تو اگر ہمیں تمھیں کبھی تنہائی نصیب ہوئی تو وہاں کے حالات تم خود ہی اُگل پڑو گے۔ سُنو تم مطمئن تو اب بھی نظر نہیں آتے۔ اسی طرح مضطرب ہو۔ اِس دُنیا سے وہ دُنیا ہی اچھی ہے کیا؟ ۔۔ آرام سے تو سوتے تو رہتے ہو گے؟ کیا ان راہوں میں بھی جگہ جگہ کھڑی میرائیں تمھیں ٹھوکروں سے جگا پاتی ہیں، یقین تو نہیں آتا۔ خیر چھوڑو۔ ہمیں بھی کوئی نہیں پوچھتا آج کل ۔۔ مرنے کے بعد اِس قدر لفٹ ملتی ہے۔ توبہ ابھی کئی مہینوں سے تم پر اِس قدر لوگوں کو پیار آ رہا ہے کہ میں تو پڑھتے پڑھتے سخت جل گئی ۔۔ تمھاری مسکراہٹ میں اب بھی طنز ہے۔

تم زندگی بھر عورت کے قرب کے لیے ترستے رہے۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ جو اوٹ پٹانگ نظمیں کہہ ڈالیں اُس کے جسم پر ۔۔۔ ذہنی بھوکے ۔۔ لوگ کہتے ہیں کہ تم بہت ذہین تھے۔ بہت اونچے شاعر تھے ۔۔ ہو گے ۔۔ سچی بات تو یہ ہے اپن کے تو کچھ پلّے نہیں پڑا۔ جو ستارے سے اندھیرے دماغ میں زبیدہ آغا کی پینٹنگ دیکھ کر چمکتے ہیں وہی تمھاری نظمیں پڑھ پڑھ کر چمکے ہوں گے۔ یاد نہیں اُس وقت کی حالت ۔۔ یہ ظاہر اس چیز سے ہوتا ہے کہ کوئی بھی تمھاری نظم کا عُنوان ''اُس کا جسم'' شکل کچھ بھی تو یاد نہیں۔ ایک دفعہ تم نے میری ایک نظم کا مذاق اُڑایا تھا۔ وہ بھی اِتنے مہذب پیرائے میں کہ دل کو ذرا بھی نہ لگی تمھاری تنقید ۔۔ معافی مانگی۔ کچھ دن گردن جھکائے اور پھر لفافہ سا سینہ تان کر باریک ہونٹ بھینچ لیے۔ نرم رقاصہ جیسی میری انگلیوں کو مروڑتے ہوئے تم نے میری نظم مجھے دکھائی۔ ایک مصرع تم نے اپنی موٹی آواز میں دبوچ

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 126 (1,1)

کر باریک ہونٹوں سے زبردستی آہستہ آہستہ جب میرے تصوّر کو آزاد کیا تو سچ مُچ عین اُس وقت میں نے بھی آزادی کا سانس لیا تھا۔ اور بیچارا شعر تو ادھ مُوا ہو چکا تھا۔ دل میں میں نے سوچا تھا، کیسی عجیب طرح سے پڑھتا ہے یہ شخص۔ تم نے مجھے ترغیب دی کہ ردیف قافیہ کا پیچھا چھوڑ کر تو دیکھو۔ لفظوں کے تسلسل کے لیے مشین کے بخیے کی طرح موتی گراتی چلی جاؤ گی۔ اور آغا شاعر کی بیٹی کی حیثیت سے میں نے بحث کی تھی۔ میرا دل ہی جانتا تھا کہ کیسی مجھے الجھن ہوتی تھی جب کبھی غزل کہنی پڑ جاتی۔ کاغذ کے کونوں پر لفظوں کے ڈھیر لگا دیتی مگر کوئی فِٹ ہی نہ ہوتا تھا کمبخت۔ آخر جھک مار کر نظم کا سہارا ڈھونڈ لیتی۔ بھلا خاندان کی آن کیسے لٹا دیتی آزاد نظم لکھ کر، اور بڑے ٹھسے سے کہے جاتی۔ جی ہاں آپ لوگ بندشوں سے بھاگتے ہیں۔

تم اکثر پوچھتے، بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈ کر، کوئی نئی نظم لکھی؟ تمھاری آنکھیں مسکراتیں۔ اور میں اپنی کمزوری چھپاتے ہوئے آسان سا لقمہ توڑ کر تمھیں تھما دیتی۔ ہائے اللہ فرصت ہی نہیں ملتی کیا کروں؟ میرا وقت ہو گیا ہے میں جا رہی ہوں۔ تم چھوٹی سی میز پر جہاں تم بیٹھا کرتے تھے اپنی پانوں کی ڈبیہ زور سے پٹختے۔ میں جاتے ہوئے بھی ایک بار پھر دیکھ لیتی۔ اُردو ٹائپ کی ہوئی لمبی لمبی آزاد نظموں کے کتنے سکرپٹ (Script) تم کھول کر میرے سامنے رکھ دیتے۔ یہ کل میں نے نئی کہی ہیں اور میں ڈھٹائی سے ہار نہ مانتے ہوئے جلدی سے ریکارڈوں کا ڈبہ اور لاگ بک اُٹھا کر اسٹوڈیو میں چلی جاتی۔ کمرے کی مدھم لائٹ میں سوچتی رہتی کہ یہ شخص اِتنی جلدی کیسے لکھتا ہے؟ ایک روز کا گیپ دے کر کئی کئی نظمیں لکھ لاتا ہے۔ خدا جانے اندھیری راتوں میں دیسی گھروں کی نالیوں کے کناروں پر پاؤں پھیلائے تم کتنی نظمیں لکھ دیتے۔ اگر تمھارے ندیم، تمھارے ہم نوا تمھیں اپنے بازوؤں میں اُٹھائے اکثر اسٹوڈیو یا ڈیوٹی روم میں نہ سلا جاتے۔ تم نے کیا لکھا، کیا کہا، کچھ باہوش رہے انھیں تم نے قلم بند کر لیا۔ باقی صبح تک کڑوی کسیلی قے میں تم بہا دیتے۔ اکثر صبح کی ڈیوٹی پر جب میں جاتی تو تمھیں ڈیوٹی روم میں آنکھیں ملتے ہوئے پاتی۔ اور تم پر خاصا رحم آتا کہ جیسے تم یتیم ہو۔ جب تم اُداس نظروں سے اپنے دوست کو دیکھتے جو دِلی میں تمھارے ساتھ

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 127 (1,1)

رہتا تھا، جو ایکٹنگ میں خاصا مشہور تھا۔ واقعی ایکٹر تھا جو مجھے بہت پسند تھا۔ سنہری سنہری گھنے بال، نہ جانے تمھیں دیکھ کر مجھے آسکر وائلڈ کا الزیڈ ڈگلس کیوں یاد آتا تھا۔ جیسے تم بھی شباب پسند ہو، مگر تمھارے چہرے پر رات بھر کی تلخی تمھارے شباب کی اُداسی دن بھر تہ جمائے رہتی جس کا تم ہر نئی شام کو کڑوی کسیلی دوا سے گلا گھونٹتے رہتے۔ آج بھی وہی تخیل تمھارے چہرے پر پھیلی ہوئی دیکھ رہی ہوں۔ میں اور تم اس وقت بالکل اکیلے ہیں۔ میرے سامنے میز پر کونے میں قطب مینار رکھی ہے۔ ننھی مُنی سی۔ قطب مینار کا ذکر اِس لیے کر رہی ہوں کہ جب میں دِلی میں تھی تو ہمیشہ اودی گھٹاؤں میں سوئی ہوئی اِس مینار کو چھوڑ کر اونچے سرو کے درخت دیکھا کرتی تھی۔ اِس بے چاری کا خیال بھی نہ آتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے آم کے پیڑوں کی قطاروں میں آنکھ مچولی میں بھی کھیلی لیکن کبھی جو آنکھ اُٹھا کر برسوں سے کھڑی اِس مینار کو دیکھا ہو باہر کے لوگوں سے اگر اِس کو چھٹکارا نصیب ہوتا تب کہیں اس کی برسوں سے رسی بسی ابابیلیں برسات کا موسم دیکھنے اتفاق سے باہر نکل آتیں مگر تم پر سچ پوچھو اب چار سال کے عرصے میں کس قدر پیار آتا ہے۔ ایک برتنوں کی دُکان میں مینار جھانکتی ہوئی میں نے دیکھی۔ آنکھیں چار ہوئیں اور محبت اُمڈ پڑی۔ اُس بوڑھے دُکاندار میں میری آنکھوں کی چمک سے فائدہ اُٹھایا۔ تمھاری تصویر کی طرح جو میرے ڈرائنگ روم میں لگی ہے، اس سرخ پتھر کی ننھی مُنی قطب مینار کو بھی اپنے ہاتھوں سے اسی طرح صاف کرتی ہوں۔ کیوں کہ دونوں اصلی چیزیں میرے پاس نہیں ہیں۔ یہ ایک روز تم نے اپنی تصویر سے باہر نکل کر مجھ سے پوچھا تو تھا۔ ابھی ابھی میں نے دیکھا شیشے کی میز پر رکھی ہوئی یہ قطب مینار اتنی اونچی اُٹھتی چلی گئی۔ سرو کے درخت وہی کاہی رنگ کا لباس پہنے ہوئے ہواؤں میں خاموش کھڑے ہیں۔ سرخ بجری کی روِشوں کے چاروں طرف ہری ہری گھاس جس کی تازگی میری آنکھوں میں سچ مُچ ٹھنڈک پہنچا رہی ہے، آم کے جھکے جھکے پیڑوں کی قطاریں جدھر جدھر مڑتی چلی جا رہی ہیں اور لمبی لمبی سڑکوں میں مل جاتی ہیں، پھر وہ سناٹا ہواؤں کی گود میں سرخ کاسنی پھولوں کے ڈھیر اُڑاتا ہوا۔ مجھے اِس مینار کے سامنے ایک سرخ عمارت کے سامنے لے آیا۔ یہ عمارت اس

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 128 (1,1)

وقت کتنی ننھی مُنی تین دائروں میں میرے سامنے تبدیل ہوگئی۔ دودھ کے پیالوں میں روشنی کے بلب مجھے سیڑھیوں تک لے جارہے ہیں۔ سیڑھیوں تک پہنچتے پہنچتے میرے قدم خود بخود مجھے بھاگنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ یہ وہی تو ہے میرا پیارا ریڈیو اسٹیشن۔ وہ سب میرے پیارے پیارے دوست جو اس کتاب کی اونچائی کے اُس طرف ہیں، کیا پتہ مجھے یاد بھی کرتے ہوں گے یا نہیں۔۔ کیا خبر مرنے کے بعد سب کو پیار آئے۔ جیسے آج کل سب کو تم سویٹ لگ رہے ہو۔

میں نے ایک آنکھ بند کر کے ابھی تم کو دیکھا کہ تم اسی طرح مسکرا رہے تھے۔ پتلے پتلے ہونٹوں میں کوئی بھی جنبش نہیں۔ چہرہ اسی طرح ساکت جیسے سینے سے ہزاروں طوفان آئے اور چہرے کو بھگوتے ہوئے چلے گئے۔ کٹورا سی آنکھیں گھورتی ہوئی جیسے تم نے پہلے دن سے گھورنا شروع کیا تھا اور ابھی تک گھور رہے ہو۔ لمبے لمبے بال، مونچھوں اور داڑھی میں پھیلی ہوئی نگاہیں، پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ پُتلیاں تک ٹھہر گئی تھیں۔ پتلے ہونٹ ایک دوسرے سے اس طرح چمٹ گئے تھے جیسے جبڑا تکلیف برداشت نہ کرتے ہوئے سارے دانتوں سمیت حلق کا راستہ پکڑ لے گا۔ ستواں ناک کے نتھنے شاید دو تین دفعہ ہی پھڑ پھڑائے تو مجھے لگا کہ تم میں زندگی کے آثار ابھی باقی ہیں۔ گلے کی مالائیں ایک دوسرے سے چمٹی شیروانی کے کھلے گلے میں سانس کی رفتار کے ساتھ سر اُٹھائیں اور پھر آہستہ آہستہ زرد سینے پر لَوٹ جائیں۔ تمھارا دل بہت ہی محبّت بھرا تھا۔ اس کی دھڑکن سے میں نے فوراً پہچان لیا۔ عجیب وغریب ماڈل کو دیکھ کر میں سنبھلی بھی نہ تھی کہ وِشوا نے بتلایا کہ تم ایک لڑکی میرا کو چاہتے تھے۔

اُس روز تمھاری مالائیں زرد سینے کی آغوش میں ڈوبے دل کی رفتار سے گلے ملتے ملتے مجھے تھکی تھکی لگیں۔ اور میں نے سوچا کاش میرا تمھارا چہرہ نہ دیکھتی۔ کس قدر خشک اُجاڑ و ویران چمن اِس میں آباد تھے۔ بنگال کی حسینہ کیا جانے اس خاموش ساکت دریا کی گہرائی کو۔ اسے تو طوفانی تلاطم میں ڈوبی گھٹائیں، آبشاروں میں ڈوبے گیت چاہئیں تھے اور بہار ہی بہار۔ مگر تم تو اپنے اندر سب کچھ جذب کیے بیٹھے رہے۔ اس دھڑکن کو کاش وہ دیکھ سکتی جو زرد سینے پر سر رکھے

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 129 (1,1)

مالائیں بھی اب برداشت نہ کرسکتی تھیں۔تم مجھے گھورتے رہے۔میں نے بُرا بھی مانا مگر وہ تو تمھاری عادت تھی۔تم ہر عورت میں میرا کو ڈھونڈتے اور مجھے تم پر کبھی کبھی رحم بھی آجاتا۔

بیچارے میرا جی کو اس لڑکی نے ڈانٹ دیا تھا۔اُس دن کے بعد وہ ان راہوں کو چھوڑ کر کہیں چلی گئی،اور یہ اسی راستے پر اُس کا انتظار کرتے رہے۔اور اب تک کر رہے ہیں۔وِشوامتر عادل نے نوفٹے ہونے کے باوجود ایک سال کے معصوم بچے کا چہرہ لیے ہوئے اسی معصوم سی مسکراہٹ میں مجھے ایک روز بتلایا تھا۔کتنا اچھا تھا وہ مجھے ابھی تک یاد آتا ہے۔اِتنا معصوم کہ بڑھیا سے بڑھیا سوٹ پہننے کے باوجود زیب قریشی کی تین چار وزنی کتابوں سے پٹ کر بھی خفا نہ ہوا۔اِسی طرح مسکراتا رہا۔اُس کے پٹنے کے بعد میں دونوں ''میراؤں'' کا مقابلہ کر رہی تھی۔ٹیبل لیمپ کی روشنی میں وِشوامتر میرے سامنے پٹا۔کتابیں میرے سامنے بکھری پڑی تھیں۔کچھ ورق علیحدہ ہو کر زیب کے جوتوں کے پاس پڑے تھے۔اور کچھ دروازے کے قریب میرا جی کے جوتوں کے نیچے پڑے سسک رہے تھے۔میں ٹھاٹ سے بیچ کی کرسی میں ڈٹی بیٹھی رہی۔زیب کسی فلم کی سائیڈ ہیروئن لگ رہی تھی۔غصہ سے کھلے گریبان سے اُس کا گلابی سینہ وہ مالائیں مانگ رہا تھا جو میرا جی نے اپنے گلے میں ڈال رکھی تھیں۔اور میرا اُن کے سینے پر تڑپ رہی تھی۔وشوامتر کے چہرے پر بچوں کی سی مسکراہٹ اور پھیلتی چلی گئی۔اپنی پیشانی پر بکھرے بال ہٹاتے ہوئے اُس نے ہونٹوں کا سگریٹ ایش ٹرے میں مروڑ کر رکھ دیا۔جس کے دُھویں میں وہ میرا کو آنکھ بند کیے بلا کر لایا تھا۔ساڑھی پہنے پتلی دُبلی۔دو چوٹیاں لمبی لمبی کمر سے نیچے لہرا رہی تھیں۔سیندور کی بندی اُس نے چمپئی چہرے پر ڈرتے ڈرتے لگائی تھی۔ساون کی گھٹاؤں میں ڈوبے نینوں میں میرا جی کے آنسوؤں کی چمک بھرنی چاہی تھی۔اور میں میرا کو اپنے سامنے کھڑا ہوا پوری طرح دیکھ بھی نہ پائی تھی کہ میرا جی کی پھٹی پھٹی نگاہوں اور بھاری بھاری قدموں سے وہ دُنیا سے ڈرنے والی بزدل لڑکی ایک دم زیب کی چیخ سُنتے ہی بھاگ گئی۔پھر ایک دو تین دھڑادھڑ وشوا کتابوں سے پٹتا رہا۔وجہ یہ تھی کہ زیب وشوامتر کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک چکی تھی اور وہ ڈیوٹی روم

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 130 (1,1)

میں میرے پاس بیٹھا ہوا میراجی کے بارے میں اپنی معلومات ظاہر کر رہا تھا۔ وہ بات یوں ہوئی کہ میں نے پوچھ لیا۔ یہ عجیب کارٹون سے حضرت ہیں۔ جب آتے ہیں تو ہر شخص کیسی محبت سے ان سے ملتا ہے۔ ن۔م۔ راشد صاحب اور نظامی صاحب تو گویا ان کے بہت گہرے دوست ہیں۔ پھر وہ سارے ڈرامہ آرٹسٹ میراجی میراجی کرتے عاجز ہیں۔ یہ کون سی ہستی ہیں۔ خدا کے لیے بتاؤ۔ یہ لمبے بال، مونچھیں، یہ لمبی لمبی مالائیں، یہ سب ہیئت کیا ہے۔ کیا یہ سب فراڈ ہے۔ اور وشوامتر عادل سے چائے منگا کر ایک کپ مجھے دیا۔ اُن کا جغرافیہ ابھی پوری طرح بتایا بھی نہ تھا کہ لنچ کے لیے زیب ڈھونڈتی ڈیوٹی روم پہنچی۔ میں چونکہ نئی نئی داخل مکتب ہوئی تھی سوائے دو تین ہستیوں کے کسی کو نہ جانتی تھی۔ ابھی میراجی میں کچھ کچھ کشش پیدا ہوئی تھی جو راوی پٹ گیا۔ میں خود شرمندہ تھی۔ ایک معصوم سی لڑکی میرے ذہن میں آئی تھی۔ میراجی پر رحم آیا ہی تھا کہ وشوامتر کی میرا نے سب کچھ بھلا دیا۔ پھر سامنے کھڑے میراجی مجھے اور عادل کو گھورتے رہے۔ جیسے ہم مجرم ہوں۔ میں پہلی دفعہ خود ہی میراجی سے بولی، بیٹھیے۔ وہ حیران ہوئے جیسے یقین نہ آیا ہو کہ میں اس سے بات کی ہے۔ پھیلے ہونٹ کچھ اور پھیلے تو دولائوں میں تبدیل ہو گئے۔ میں اُن کی ٹھٹھری نظروں کی تاب نہ لا سکی۔ کتنی چمک تھی ان میں۔ جیسے اندھیرے غار میں کوئی شکار کے لیے ٹکٹکی باندھے بیٹھا ہو۔ مجھے اُن کا گھورتے رہنا بہت بُرا لگا۔ جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ اور الفاظ نہیں جڑ رہے ہوں۔ عجیب تذبذب تھا۔ میلی سی براؤن شیروانی، کالر چکٹا ہوا کہیں بھی تو تازگی نہ تھی۔ دو آنکھیں تھیں کہ پھٹی ہوئی تھیں۔ دماغ میں تلاطم تھا۔ الفاظ کھوئے چلے جا رہے تھے۔ اسٹوڈیوز سے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ مورے مندر نہیں آئے۔۔ استاد فیاض خاں جے جے ونتی کا خیال گا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ تم نے مجھے گھورتے گھورتے اپنی آنکھیں بند کر لیں جیسے تھک گئے ہو۔ پلکوں کے سائے میں آنسو گرتے دیکھتی رہی۔ سخت پریشان کہ الٰہی کیا ماجرا ہے۔ تم کیوں رو دیے۔ کمرے میں گھوم کر وشوامتر کی کرسی دیکھی تو نہ وشوامتر تھا نہ زیب، صرف تم رو رہے تھے۔ یہاں تک کہ تم مندر کی آواز نہ سُن پائے تو پلکوں ہی پلکوں میں ہلکی سی حرکت ہوئی۔ آدھی

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 131 (1,1)

آنکھ کھولے تم کرسی پر چند سیکنڈ لیٹے رہے۔ سیئے لفافے کے اُتار چڑھاؤ سے مالائیں ملتی رہیں۔ اتنے میں ن۔م راشد صاحب آ گئے، عینک کے پیچھے سے مخصوص مسکراہٹ لیے ہوئے جیسے وہ سب کچھ کھڑے سُن رہے تھے دریچے کے قریب سے۔ میں سخت پریشان تھی کہ تم روئے کیوں؟ کیا وشوا متر کی باتیں سُن رہے تھے؟ شاید بُرا مانے تھے کہ وہ تمھارا راز کیوں بتا رہا تھا۔ مگر یہ سب غلط ثابت ہوا۔ راشد صاحب نے میری شکل دیکھتے ہی ہنسنا شروع کر دیا ''سناؤ سحاب کی حال اے؟'' وہ اپنے پنجابی انداز میں بولے۔ تم فوراً اُٹھ کر جانے لگے تو اُنھوں نے کمر میں گھونسا مارا۔ میرا جی! ریکارڈ تے ختم ہو گیا۔ ہُن کی جانا۔ ایس کُڑی نوں وی حیران کر دِتا۔ سحاب! ان کے سامنے جے جے ونتی کبھی نہ بجانا۔ یہ ساری رات روتے رہیں گے۔ ابھی تو تم بیٹھی تھیں یہ اپنے کمرے میں جا کر رات بھر رو سکتے ہیں۔'' مجھے وشوامتر کی ساری باتیں پھر سے یاد آنے لگیں۔ کیا مرد بھی اِتنا چاہتا ہے، کسی کو کیا پتہ؟ اندر سے کوئی جواب نہ مل سکا۔ ''میرا'' تم کتنی خوش قسمت ہو۔ تمھیں معلوم ہو جائے تو اِس دھرتی پہ پاؤں نہ رکھ سکو۔ میرا جے جے ونتی میں خود اُداس ہو گی۔ سب کو چھوڑ کر میں وہ ریکارڈ اندر لے گئی۔ اور ایک بار نہیں تین چار بار بجایا۔ کیا بتاؤں جی چاہا تمھیں کھینچ کر لے آؤں تا کہ تم خوب رو لو جی بھر کے۔ اسٹوڈیو کی مدھم لائٹ میں موٹے موٹے نرم مخمل کے پردوں سے ڈھکی دیواروں سے جب یہ اُداس راگ پھوٹتا تو جیسے سارے کمرے میں میرا کے شریر میں میری روح گھبرا رہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ کہوں اچھا ہوا تمھیں وہ نہیں ملی۔ تبھی تو تم میں زندگی کی رمق باقی ہے۔ ورنہ مشین کا پرزہ بن جاتے۔ زنجیر کا حلقہ بن جاتے۔ اسی طرح زنگ چڑھتا تم پر بھی۔ اب کم سے کم ایک کرب گلے لگائے ہوئے تو اِس دُنیا سے گئے ہو۔ تم نے سوچا تو بہت تھا کہ میرا تمھیں اِس دُنیا میں ضرور ملے گی چاہے وہ کسی روپ میں آئے۔ تم ہر عورت کو گھورتے رہے، گھورتے رہے۔ رات بھی دیسی ٹھرّے سے پیاسا حلق تر کرتے رہے۔ میرا کا جسم اُبھر آتا۔ تم اس کے ہر ہر سانس کا اُتار چڑھاؤ جو آنکھوں میں سارا دن چھپائے رہتے، چپکے چپکے اپنے ہم نواؤں، ہم جنسوں کے سامنے ننگا کر کے ڈال دیتے۔ تم بھی جھوم اُٹھتے اور وہ بھی قہقہے لگاتے۔ واہ میرا جی کیا جینیئس پیدا کیا اللہ میاں! پھر

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 132 (1,1)

تمھیں گودیوں میں اُٹھائے یتیم خانے میں ڈال جاتے۔ اکثر صبح کو ڈیوٹی روم کے پاس ویٹنگ روم میں تم آنکھیں ملتے نظر آتے۔ دس بجے جب میں ڈیوٹی سے واپس کمروں سے گزرتی تو تم بھی مجھے نئی نئی نظمیں سنانے کے بہانے بلاتے۔ دیکھو یہ کل رات نئی نظم لکھی۔ یہ ابھی پوری نہیں ہوئی۔ بات بتاؤں کہنا نہیں کسی سے۔ یہ جو اویتا ہے نا یہ اُس پر لکھی ہے۔ یہ جو اپرنا ہے تھوڑی سی یہ اس میں نظر آتی ہے۔ یہ ''وہ'' ہیں۔ وہ صیغۂ راز تھی۔ جن کی آنکھیں بہت خوب صورت تھیں۔ آنکھیں جتنی معصوم ہیں اُتنی وہ خود نہ تھی۔ اُنھیں ہمیشہ لڑائی کے پارٹ دیے جاتے۔ وہ خوب تو تڑاخ سے جواب دینے میں ماہر تھیں۔ سُنا تھا کہ تم کو وہ اتنی پسند آئیں کہ تم نے اپنے بہت عزیز دوست کے ذریعے پیغام بھی بھیجا۔ سب نے سنا اور خاموش رہے۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ تمھاری بیوی بنی تو کرائے کی پتلون تو تمھیں پہننے کو مل جائے گی۔ ایک ادھ مرے ہوئے گورے کی ٹائی بھی وہ خرید کر تمھیں بندھوائے گی اور رات خدا جانے نالیوں کے کنارے تم نظمیں لکھ سکو گے یا ''وہ'' تمھیں کسی باغ میں بٹھا کر نہ چلی جائے۔ ایک فائدہ تھا ہر روز کسی نئی گاڑی میں تمھیں مفت لفٹ ملتی۔ خاصے معقول تو بن جاتے تم۔۔۔ تم نے نہ جانے کیا کیا سوچا ہوگا۔ سنا تھا جب اُنھوں نے یہ مژدہ سنا تو ایک انگلی اپنے ہونٹ پر رکھی جو خاصی دیر کانپتی رہی۔ وہ تل جو سیاہ آنکھ کے نیچے زرد رُخسار پر چمکا کرتا تھا جو تمھیں بہت پسند تھا وہ سچ مانو لرز گیا۔ کچھ دیر تو وہ آنکھیں پھاڑے اس دُنیا میں نہ رہی۔ جب واپس آئی تو معلوم ہوا کہ ڈرامہ میں لڑائی کے پارٹ کے ریہرسل کرتی نظر آتی۔ وہ الفاظ تو تم نے بھی سُنے تھے۔ تم نے کئی روز دیسی بھی نہ پی، کھانا بھی نہ کھایا۔ جے جے ونتی کا ریکارڈ سُنے بغیر روتے رہے۔ تمھارے کیا، میرے ذہن میں اب تک گونج رہے ہیں وہ الفاظ۔ مُوا شاعر بنا پھرتا ہے۔ تبھی ریہرسل میں مجھے پان دیتا اور جب دیکھو گھورتا رہتا۔ کہاں گیا وہ ''میرا'' کا عشق؟ تبھی اُس نے منہ نہ لگایا۔ شکل تو دیکھو۔ داڑھی بڑھائے مُوا جوگی۔ لو اور سُنو بہن! میری قسمت میں یہی لکھا ہے کیا؟ سب نے ہی سُنا۔ کچھ ہنس دیے، کچھ اُداس، کچھ حیران، مجھے تو جیسے معلوم تھا کہ ایسا سوچنا بے کار ہے۔ کوئی جوڑ ہی نہیں تھا تمھارا اور اُن کا، سوائے پان کھانے کی عادت کے۔ اگر نکاح

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 133 (1,1)

برقرار رہتا تو شوق پورا کر لیتے۔ سچ مچ تم کو رنج پہنچا۔ لوگ ''میرا'' کو ہی سمجھ رہے تھے جو مذاق مذاق میں تم نے ''اُنھیں'' بھی جگہ دلائی۔ اس لفافے سے سینے کے اندر سے قدرت اور بھی مسکرائی، مسکراتی رہی۔ اب کے بھی وہ جیت گئی۔ تم ہار کر اتنے تھک گئے تھے کہ کسی نے کہا آٹھ روز تک تم نے کچھ بھی نہ کھایا۔ شراب پیتے رہے رات بھر۔ خوب نظمیں لکھیں تم نے دھڑا دھڑ۔ عورت سے تم خفا ہو گئے۔ میں سب کچھ دیکھتی رہی، سُنتی رہی۔ تم مجھ سے کبھی کبھی بحث ضرور کرتے۔ میں بڑی صفائی سے عورت کی طرف سے لڑتی۔ گو میں خود شرم سار تھی۔ اپنی ہم جنسوں کو دیکھتی اور ریشمی پردے ڈالتی چلی جاتی۔ تم جب پندرہ بیس دن کے چھٹی کے بعد واپس آئے تو لوگ میرا جی کو نہ پہچان سکے۔ تمھیں احساس ہو گیا تھا، سب ظاہر داری کو پسند کرتے ہیں۔ وہ دن گئے جب راکھ میں جٹی زلفیں گلے میں پڑی مالاؤں میں سُندریاں لپٹ جاتی تھیں۔ بھگوان کے پاس جانے کا راستہ ڈھونڈ لیتی تھیں۔ تم کو جب میں نے دیکھا تم رتناولی ڈرامے کی رہرسل کرا رہے تھے۔ جو تم نے لکھا تھا منظوم ڈرامہ اور تم نے رتناولی کے لیے اُنہی کو چُنا۔ سب مسکراتے۔

تم کو کیا بروگ تھا؟ لمبے لمبے بال، داڑھی، سب غائب۔ کینچلی تو تم نے لاکھ بدل ڈالی پر تمھارے پچکے ہوئے رخسار، پتلی سی گردن، سارے چہرے پر صرف آنکھیں ایسی تھیں جو وہی پرانی دیکھی دیکھی سی۔ جنھیں دیکھ کر لوگ میرا جی کہہ اُٹھتے تھے۔ مگر یہ روپ بھی سب بے کار ثابت ہوا۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی تمھارے پان اسی طرح مسکرا مسکرا کر کھاتی رہیں۔ ہر رات تم اس لرزتے تل کا ذکر ضرور کر لیتے۔ جے جے ونتی سُن کر ساری ساری رات روتے بھی رہتے۔ مجھے ہر نئی نظم ضرور کار میں بیٹھے بیٹھے سننے کے بعد بھی میں نے کئی بار محسوس کی۔ اس وقت تم ہی جانتے ہو۔ چار سال سے اسی کمرے میں جس میں تمھارا فوٹو ٹانگ رکھا ہے۔ مجھے تم پر اب خاصا رحم آتا ہے۔ تم نے کیا کیا نہ دیکھا اس کمرے میں۔ اس کے باہر اس کراچی شہر میں ایک ریڈیو اسٹیشن اب بھی ہے۔ ''وہ'' اب بھی پارٹ کرتی ہے۔ اُن کے لہجے میں اب اور بھی تلخی درشتی پیدا ہو گئی ہے۔ میں نے مدت سے نہیں دیکھا۔ سنا ہے اب وہ بہت سے بچوں کی اماں ہیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تم

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 134 (1,1)

بچوں کے ابا نہیں۔لوگ کہتے ہیں،تم بمبئی میں تھے تو۔۔۔کیا کیا نہ ہوا تمھارے ساتھ۔کئی کئی روز تم بھوکے رہے۔کئی راتیں تم نے گلیوں،سڑکوں پر ٹہل کر گزادیں۔حلق پیاس سے چیختا رہا اور جن لوگوں کو تم پر آج کل پیار آرہا ہے کئی صفحے کالے کر ڈالے تم پر۔وہ رات بھر تمھیں دیسی شراب بھی نہ پلا سکے۔ایک وقت کھانا بھی نہ کھلا سکے۔اب کہتے ہیں زمانے نے ایک ذہین شاعر ختم کر دیا۔تم تو اسی طرح کراہ رہے ہو۔کبھی تو اپنی نئی نظم چھپ کر سُنا کرو۔تم کیسے ہو؟ آؤ میں تمھاری روح کو ایک بار گلے لگالوں۔تمھاری روح کتنی اُداس،کتنی سوگوار اور پیاری ہے۔تمھاری بھوک تمھارے چہرے کو اپنی گندگی میں لتھیڑتی رہی۔کسی نے اسے اُتار پھینکنے کی ضرورت نہ سمجھی۔آج میں نے محسوس کیا جیسے تمھاری روح میرے کتنے قریب ہے،کتنی مقدّس،کتنی حسین و معصوم۔ایک بار میرے قریب آؤ۔ دیکھو میری روح کتنی اُداس ہے۔میں تمھاری تصویر اُٹھا کر یہ لو پھینک دیتی ہوں۔سخت منحوس ہے۔تم خود کتنے اچھے تھے۔ناحق یہ خول عمر بھر چڑھائے رہے۔جھوٹے لفظوں کا کفن پہنے پھرتے رہے۔تم کتنے بدل گئے ہو؟ ذرا بھی نرمی،خودداری تم میں نہیں رہی۔دُور کھڑے ہو۔وہ تو خبطی تم سدا کے ہی ہو ورنہ۔۔۔آج قدرت تم سے شرمندہ نہ ہوتی۔گئے نہ دُودھ کی نہروں کے پاس ٹہلنے کو۔ حوریں میووں کی قابیں لیے تمھارے حضور میں ہیں۔شرابِ طہور سے لبریز مینائیں لیے۔اب لکھو نا نظمیں اُن کے حُسن پر! قدرت کی ثناء خوانی نہیں کرتے،اب کیا ہوا جو یہ کشکول لیے پھر دھرتی پر اُتر آئے۔جاؤ چلے جاؤ۔اب تو میرا پیچھا چھوڑ دو کہ میرا ذہن تھک چکا ہے۔یہ تم نے میری آٹو گراف بک پر جو شعر لکھا تھا،یہ میرے سامنے کھلی پڑی ہے۔آٹو گراف آج میں اِس کا مطلب سمجھ سکی ہوں۔۔۔۔۔''قدرت بڑی حسین اداکارہ ہے۔''

پتّہ پتّہ بُوٹا بُوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

(میرا کوئی ماضی نہیں)

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 135 (1,1)

سعادت حسن منٹو

تین گولے

حسن بلڈنگز کے فلیٹ نمبر ایک میں تین گولے میرے سامنے میز پر پڑے تھے۔ میں غور سے اُن کی طرف دیکھ رہا تھا اور میرا جی کی باتیں سُن رہا تھا۔ اِس شخص کو پہلی بار میں نے یہیں دیکھا۔ غالباً سن چالیس تھا۔ بمبئے چھوڑ کر مجھے دہلی آئے کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ فلیٹ نمبر ایک والوں کا دوست تھا یا ایسے ہی چلا آیا تھا لیکن مجھے اِتنا یاد ہے کہ اُس نے یہ کہا تھا کہ اس کو ریڈیو سٹیشن سے پتا چلا کہ میں نکلسن روڈ پر سعادت حسن بلڈنگز میں رہتا ہوں۔

اِس ملاقات سے قبل میرے اور اُس کے درمیان معمولی سی خط وکتاب ہو چکی تھی۔ میں بمبئی میں تھا جب اُس نے ''ادبی دُنیا'' کے لیے مجھ سے ایک افسانہ طلب کیا تھا۔ میں نے اُس کی خواہش کے مطابق افسانہ بھیج دیا، لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ اِس کا معاوضہ مجھے ضرور ملنا چاہیے۔ اس کے جواب میں اُس نے ایک خط لکھا کہ میں افسانہ واپس بھیج رہا ہوں، اِس لیے کہ ''ادبی دُنیا'' کے مالک مفت خور قسم کے آدمی ہیں۔ افسانے کا نام ''موسم کی شرارت'' تھا۔ اس پر اُس نے اعتراض کیا تھا کہ اِس شرارت کا موضوع سے کوئی تعلق نہیں، اِس لیے اسے تبدیل کر دیا جائے۔ میں نے اس کے جواب میں اُس کو لکھا کہ ''موسم کی شرارت'' ہی اِس افسانے کا موضوع ہے، مجھے حیرت ہے کہ یہ تمھیں کیوں نظر نہ آئی۔'' میرا جی کا دوسرا خط آیا، جس میں اُس نے اپنی غلطی تسلیم کر لی اور اپنی حیرت کا اظہار کیا کہ موسم کی شرارت وہ ''موسم کی شرارت میں کیوں نہ دیکھ سکا۔

میرا جی کی لکھائی بہت صاف اور واضح تھی۔ موٹے خط کے نب سے نکلے ہوئے بڑے صحیح نشست کے حروف، تکون کی سی آسانی سے بنے ہوئے ہر جوڑ نمایاں، میں اس سے بہت متاثر

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 136 (1,1)

ہوا تھا لیکن عجیب بات یہ ہے کہ مجھے اس میں مولانا حامد علی خان مدیر ''ہمایوں'' کی خطاطی کی جھلک نظر آئی۔ یہ ہلکی سی مگر کافی مرئی مماثلت ومشابہت اپنے اندر کیا گہرائی رکھتی ہے۔ اس کے متعلق میں اب بھی غور کرتا ہوں تو مجھے ایسا کوئی شوشہ یا نقطہ سجھائی نہیں دیتا، جس پر میں کسی مفروضے کی بنیادیں کھڑی کرسکوں۔

حسن بلڈنگز کے فلیٹ نمبر ایک میں تین گولے میرے سامنے میز پر پڑے تھے اور میرا جی لم تڑنگے اور گول مٹول شعر کہنے والا شاعر مجھ سے بڑے صحیح قد وقامت اور بڑی صحیح نوک پلک کی باتیں کر رہا تھا، جو میرے افسانوں کے متعلق تھیں۔ وہ تعریف کر رہا تھا نہ تنقیص۔ ایک مختصر سا تبصرہ تھا۔ ایک سرسری سی تنقید تھی۔ مگر اس سے پتا چلتا تھا کہ میرا جی کے دماغ میں مکڑی کے جالے نہیں۔ اُس کی بات میں اُلجھاؤ نہیں تھا اور یہ چیز میرے لیے باعث حیرت تھی، اِس لیے کہ اُس کی اکثر نظمیں ابہام اور اُلجھاؤ کی وجہ سے ہمیشہ میری فہم سے بالاتر رہی تھیں، لیکن شکل وصورت اور وضع قطع کے اعتبار سے وہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا اُس کا بے قافیہ مبہم کلام۔ اُس کو دیکھ کر اُس کی شاعری میرے لیے اور بھی پیچیدہ ہوگئی۔

ن۔م۔ راشد بے قافیہ شاعری کا امام مانا جاتا ہے۔ اس کو دیکھنے کا اتفاق بھی دہلی ہی میں ہوا تھا۔ اُس کا کلام میری سمجھ میں آجاتا تھا اور اُس کو ایک نظر دیکھنے سے اُس کی شکل وصورت بھی میری سمجھ میں آگئی۔ چنانچہ ایک بار میں نے ریڈیو اسٹیشن کے برآمدے میں پڑی ہوئی بغیر مڈگارڈوں کی سائیکل دیکھ کر اُس سے ازراہِ مذاق کہا تھا ''لو۔ یہ تم ہو اور تمھاری شاعری'' لیکن میرا جی کو دیکھ کر میرے ذہن میں سوائے اس کی مبہم نظموں کے اور کوئی شکل نہیں بنتی تھی۔

میرے سامنے میز پر تین گولے پڑے تھے۔ تین آہنی گولے۔ سگریٹ کی پنّیوں میں لپٹے ہوئے۔ دو بڑے ایک چھوٹا۔ میں نے میرا جی کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور ان کے اُوپر اُس کا بڑا بھورے بالوں سے اٹا ہوا سر۔۔۔۔۔۔ یہ بھی تین گولے تھے۔ دو چھوٹے چھوٹے، ایک بڑا۔ میں نے یہ مماثلت محسوس کی تو اس کا ردِ عمل میرے ہونٹوں پر

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 137 (1,1)

مسکراہٹ میں نمودار ہوا۔ میرا جی دوسروں کا ردِّ عمل تاڑنے میں بڑا ہوشیار تھا۔ اُس نے فوراً اپنی شروع کی ہوئی بات ادھوری چھوڑ کر مجھ سے پوچھا ''کیوں بھیا! کس بات پر مسکرائے؟''

میں نے میز پر پڑے ہوئے ان تین گولوں کی طرف اِشارہ کیا۔ اب میرا جی کی باری تھی۔ اُس کے پتلے پتلے ہونٹ مہین مہین بھوری مونچھوں کے نیچے گول گول انداز میں مسکرائے۔

اُس کے گلے میں موٹے موٹے گول منکوں کی مالا تھی، جس کا صرف بالائی حصہ قمیض کے کھلے ہوئے کالر سے نظر آتا تھا۔ میں نے سوچا، اِس انسان نے اپنی کیا ہیئت کذائی بنا رکھی ہے۔ لمبے لمبے غلیظ بال جو گردن سے نیچے لٹکتے تھے۔ فرنچ کٹ سی داڑھی، میل سے بھرے ہوئے ناخن۔ سردیوں کے دن تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مہینوں سے اس کے بدن نے پانی کی شکل نہیں دیکھی۔

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب شاعر، ادیب، ایڈیٹر عام طور پر لانڈری میں ننگے بیٹھ کر ڈبل ریٹ پر اپنے کپڑے دُھلوایا کرتے تھے اور بڑی میلی کچیلی زندگی بسر کرتے تھے۔ میں نے سوچا شاید میرا جی بھی اسی قسم کا شاعر اور ایڈیٹر ہے، لیکن اس کی غلاظت، اُس کے لمبے لمبے بال، اُس کی فرنچ کٹ داڑھی، گلے کی مالا اور وہ تین آہنی گولے۔۔۔۔ معاشی حالات کے مظہر معلوم نہیں ہوتے تھے۔ اُن میں ایک درویشانہ پن تھا۔ ایک قسم کی رہبانیت تھی۔۔۔۔ جب میں نے رہبانیت کے متعلق سوچا تو میرا دماغ روس کے دیوانے راہب راسپوٹین کی طرف چلا گیا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ وہ بہت غلاظت پسند تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ غلاظت کا اُس کو کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ اُس کے ناخنوں میں بھی ہر وقت میل بھرا رہتا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد اُس کی اُنگلیاں لتھڑی ہوتی تھیں۔ جب اُسے ان کی صفائی مطلوب ہوتی تو وہ پاس بیٹھی شہزادیوں اور رئیس زادیوں کی طرف بڑھا دیتا، جو اُن کی تمام آلودگی اپنی زبان سے چاٹ لیتی تھیں۔

کیا میرا جی اِس قسم کا درویش اور راہب تھا۔۔۔۔ یہ سوال اس وقت اور بعد میں بھی کئی بار میرے دماغ میں پیدا ہوا۔۔۔ میں امرتسر میں سائیں گھوڑے شاہ کو دیکھ چکا تھا جو الف

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 138 (1,1)

ننگا رہتا تھا اور کبھی نہاتا نہیں تھا۔ اِسی طرح کے اور بھی کئی سائیں اور درویش میری نظر سے گزر چکے تھے جو غلاظت کے پُتلے تھے۔ مگر اُن سے مجھے گھن آتی تھی۔ میراجی کی غلاظت سے مجھے نفرت کبھی نہیں ہوئی، اُلجھن البتہ بہت ہوتی تھی۔

گھوڑے شاہ کی قبیل کے سائیں عام طور پر بقدرِ توفیق مغلّظات بکتے ہیں۔ مگر میراجی کے مُنہ سے میں نے کبھی کوئی غلیظ کلمہ نہ سُنا، اِس قسم کے سائیں بظاہر مجرّد، مگر در پردہ ہر قسم کے جنسی فعل کے مرتکب ہوتے ہیں۔ میراجی بھی مجرد تھا۔ مگر اُس نے اپنی جنسی تسکین کے لیے صرف اپنے دل و دماغ کو اپنا شریکِ کار بنالیا تھا۔ اِس لحاظ سے گو اس میں اور گھوڑے شاہ کی قبیل کے سائیوں میں ایک گونہ مماثلت تھی مگر وہ اُن سے بہت مختلف تھا۔ وہ تین گولے تھے۔۔۔۔ جن کو لڑھکانے کے لیے اُس کو کسی خارجی مدد کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ہاتھ کی ذرا سی حرکت اور تخیل کی ہلکی سی جُنبش سے وہ ان تین اجسام کو اونچی سے اونچی بلندی اور نیچی سے نیچی گہرائی کی سیر کرا سکتا تھا اور یہ گُر اُس کو اِنھی تین گولوں نے بتایا جو غالباً اس کو کہیں پڑے ہوئے ملے تھے۔ ان خارجی اشاروں ہی نے اُس پر ایک ازلی و ابدی حقیقت کو منکشف کیا تھا۔ حسن، عشق اور موت۔۔۔۔ اِس تثلیث کے تمام اقلیدسی زاویے صرف ان گولوں کی بدولت اُس کی سمجھ میں آئے تھے، لیکن حُسن اور عشق کے انجام کو چونکہ اُس نے شکست خوردہ عینک سے دیکھا تھا، جس کے شیشوں میں بال پڑے تھے، اس لیے اس کو جس شکل میں اُس نے دیکھا تھا صحیح نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے سارے وجود میں ایک ناقابلِ بیان ابہام کا زہر پھیل گیا تھا، جو ایک نقطے سے شروع ہو کر ایک دائرے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس طور کہ ہر نقطہ اس کا نقطۂ آغاز ہے اور وہی نقطۂ انجام۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کا ابہام نوکیلا نہیں تھا۔ اس کا رُخ موت کی طرف تھا نہ زندگی کی طرف۔ رجائیت کی سمت نہ قنوطیت کی جانب۔ اُس نے آغاز اور انجام کو اپنی مُٹھی میں اِس زور سے بھینچ رکھا تھا کہ ان دونوں کا لہو نچڑ نچڑ کر اس میں سے ٹپکتا رہتا تھا، لیکن سادیت پسندوں کی طرح وہ اس سے مسرور نظر نہیں آتا تھا۔ یہاں پھر اس کے جذبات گول ہو جاتے تھے۔ ان تین آہنی گولوں کی طرح جن کو میں نے

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 139 (1,1)

پہلی مرتبہ حسن بلڈنگز کے فلیٹ نمبر ایک میں دیکھا تھا۔

اُس کے ایک شعر کا مصرع ہے: ؎

نگری نگری پھرا مسافر، گھر کا رستہ بُھول گیا

مسافر کو رستہ بھولنا ہی تھا، اِس لیے کہ اُس نے چلتے وقت نقطۂ آغاز پر کوئی نشان نہیں بنایا تھا۔ اپنے بنائے ہوئے دائرے کے خط کے ساتھ ساتھ گھومتا وہ یقیناً کئی بار اِدھر اُدھر سے گزرا، مگر اُسے یاد نہ رہا کہ اُس نے اپنا یہ طویل سفر کہاں سے شروع کیا تھا اور میں تو سمجھتا ہوں کہ میراؔجی یہ بھول گیا تھا کہ وہ مسافر ہے سفر ہے یا راستہ، یہ تثلیث بھی اُس کے دل و دماغ کے خلیوں میں دائرے کی شکل اختیار کر گئی تھی۔

اُس نے ایک لڑکی میرا سے محبت کی اور وہ ثناء اللہ سے میراجی بن گیا۔ اسی میرا کے نام کی رِعایت سے اُس نے میرا بائی کے کلام کو پسند کرنا شروع کر دیا۔ جب اپنی اس محبوبہ کا جسم میسّر نہ آیا تو کوزہ گر کی طرح چاک گھما کر اپنے تخیّل کی مٹی سے شروع شروع میں اسی شکل و صورت کے جسم تیار کرنے شروع کر دیے، لیکن بعد میں آہستہ آہستہ اس جسم کی ساخت کے تمام ممزیات، اُس کی تمام نمایاں خصوصیتیں تیز رفتار چاک پر گھوم گھوم کر نئی ہیئت اختیار کرتی گئیں اور ایک وقت ایسا آیا کہ میراجی کے ہاتھ، اُس کے تخیّل کی نرم نرم مٹی اور چاک، متواتر گردش سے بالکل گول ہو گئے۔ کوئی بھی ٹانگ میرا کی ٹانگ ہو سکتی تھی، کوئی بھی چیتھڑا میرا کا پیرہن بن سکتا تھا، کوئی بھی رہ گزر میرا کی رہ گزر میں تبدیل ہو سکتی تھی اور انتہا یہ ہوئی کہ تخیّل کی نرم نرم مٹی کی سوندھی سوندھی باس سڑاند بن گئی اور وہ شکل دینے سے پہلے ہی اس کو چاک سے اُتارنے لگا۔

پہلے میرا بلند بام محلوں میں رہتی تھی۔ میراجی ایسا بھٹکا کہ راستہ بھول کر اُس نے نیچے اُترنا شروع کر دیا۔ اُس کو اِس گراوٹ کا مطلقاً احساس نہ تھا، اِس لیے کہ اُترائی میں ہر قدم پر میرا کا تخیّل اُس کے ساتھ تھا جو اُس کے جوتے کے تلووں کی طرح گھستا گیا۔ پہلے میرا عام محبوباؤں کی طرح بڑی خوب صورت تھی، لیکن یہ خوب صورتی ہر نسوانی پوشاک میں ملبوس دیکھ دیکھ کر کچھ اِس

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 140 (1,1)

طور پر اُس کے دل و دماغ میں مسخ ہوگئی تھی کہ اُس کے صحیح تصوّر کی المناک جدائی کا بھی میراجی کا احساس نہ تھا۔ اگر احساس ہوتا تو اتنے بڑے المیے کے جلوس کے چند غیر مبہم نشانات اُس کے کلام میں یقیناً موجود ہوتے جو میرا سے محبت کرتے ہی اُس کے دل و دماغ میں نکلنا شروع ہوگیا تھا۔

حُسن، عشق اور موت۔ یہ تکون پچک کر میراجی کے وجود میں گول ہوگئی تھی۔ صرف یہی نہیں دُنیا کی ہر مثلث اُس کے دل و دماغ میں مدوّر ہوگئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے ارکانِ ثلاثہ کچھ اِس طرح آپس میں گڈ مڈ ہو گئے تھے۔ ان کی ترتیب ۔۔۔۔ درہم برہم ہوگئی تھی۔ کبھی موت پہلے، حُسن آخرت اور عشق درمیان میں، کبھی عشق پہلے، موت اُس کے بعد اور حُسن آخر میں اور یہ چکر نامحسوس طور پر چلتا رہتا تھا۔

کسی بھی عورت سے عشق کیا جائے تگڑا ایک ہی قسم کا بنتا ہے۔ حُسن، عشق اور موت۔ عاشق، معشوق اور وصل۔ میرا سے شناء اللہ کا وصال جیسا کہ جاننے والوں کو معلوم ہے، نہ ہوا نہ ہوسکا۔ اس نہ ہونے یا نہ ہوسکنے کا ردِّ عمل میراجی تھا۔ اُس نے اِس معاشقے میں شکست کھا کر اِس تثلیث کے ٹکڑوں کو اِس طرح جوڑا تھا کہ ان میں ایک سالمیّت تو آ گئی تھی مگر اصلیت مسخ ہوگئی تھی۔ وہ تین نوکیں جن کا رُخ خطِ مُستقیم میں ایک دوسرے کی طرف ہوتا ہے، دب گئی تھیں۔ وصال اب محبوب کے لیے لازم نہیں تھا کہ محبوب موجود ہو۔ وہ خود ہی عاشق تھا خود ہی معشوق اور خود ہی وصال۔

مجھے معلوم نہیں اُس نے لوہے کے یہ گولے کہاں سے لیے تھے۔ خود حاصل کیے تھے یا کہیں پڑے ہوئے مل گئے تھے۔ مجھے یاد ہے، ایک مرتبہ ان کے متعلق میں نے بمبئی میں اُس سے اِستفسار کیا تھا، تو اُس نے سرسری طور پر اِتنا کہا تھا ''میں نے یہ خود پیدا نہیں کیے۔ اپنے آپ پیدا ہو گئے ہیں۔''

پھر اُس نے اُس گولے کی طرف اِشارہ کیا جو سب سے بڑا تھا۔ ''یہ پہلے وجود میں آیا تھا۔ اس کے بعد یہ دوسرا جو اس سے چھوٹا ہے۔ اس کے پیچھے یہ کوچک۔''

میں نے مسکرا کر اُس سے کہا تھا ''بڑے تو باوا آدم علیہ السّلام ہوئے۔ خدا ان کو وہ

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 141 (1,1)

جنت نصیب کرے جس سے وہ نکالے گئے تھے۔ دوسرے کو ہم اماں حوا کہہ لیتے ہیں اور تیسرے کو اُن کی اولاد۔"

میری اِس بات پر میر اجی خوب کھل کر ہنسا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو مجھے ان تین گولوں پر ساری دُنیا گھومتی نظر آتی ہے۔ تثلیث کیا تخلیق آدم کا دوسرا نام نہیں؟ وہ تمام مثلثیں جو ہماری زندگی کی تقدیس میں موجود ہیں، کیا اُن میں اِنسان کی تخلیقی قوتوں کا نشان نہیں ہے۔"

خدا، بیٹا اور رُوح القدس، عیسائیت کے اقانیم۔ ترشول مہادیو کا سہ شاخہ بھالا۔ تین دیوتا برہما، وشنو، ترلوک۔ آسمان زمین اور پاتال۔ خشکی تری اور ہوا۔ تین بنیادی رنگ، سرخ، نیلا اور زرد۔ پھر ہمارے رسوم اور مذہبی احکام، یہ تیجے سوئم اور تیلنڈیاں۔ وضو میں تین مرتبہ ہاتھ مُنہ دھونے کی شرط، تین طلاقیں اور سہ گونہ معانقے اور جوئے میں نرد بازی کے تین پانسوں کے تین نقطے یعنی تین کانے۔ موسیقی کے تیئے۔ حیاتِ انسانی کے ملبے کو اگر کھود کر دیکھا جائے تو میرا خیال ہے، ایسی کئی تثلیثیں مل جائیں گی، اِس لیے کہ اس کے توالد و تناسل کے افعال کا محور بھی اعضائے ثلاثہ ہے۔

اقلیدس میں مثلث بہت اہم حیثیت رکھتی ہے۔ دوسری اشکال کے مقابلے میں یہ ایسی کٹر اور بے لوچ شکل ہے جسے آپ کسی اور شکل میں تبدیل نہیں کر سکتے، لیکن میر اجی نے اپنے دل و دماغ اور جسم میں اس تکون کو جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، کچھ اِس طرح دبایا کہ اُس کے رُکن اپنی جگہوں سے ہٹ گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آس پاس کی دوسری چیزیں بھی اِس تکون کے ساتھ مسخ ہو گئیں اور میر اجی کی شاعری ظہور میں آئی۔

پہلی ملاقات ہی میں میری اُس کی بے تکلّفی ہو گئی تھی۔ اُس نے مجھے دہلی میں بتایا تھا کہ اُس کی جنسی اجابت عام طور پر ریڈیو سٹیشن کے اسٹوڈیوز میں ہوتی ہے۔ جب یہ کمرے خالی ہوتے تھے تو وہ بڑے اطمینان سے اپنی حاجت رفع کر لیا کرتا تھا۔ اُس کی یہ جنسی ضلالت ہی جہاں تک میں سمجھتا ہوں اُس کی مبہم منظومات کا باعث ہے۔ ورنہ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں عام

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 142 (1,1)

گفتگو میں وہ بڑا واضح دماغ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جو کچھ اُس پر بیتی ہے اشعار میں بیان ہو جائے۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ جو مصیبت اُس پر ٹوٹی تھی، اُس کو اُس نے بڑے بے ڈھنگے طریقے سے جوڑ کر اپنی نگاہوں کے سامنے رکھا تھا۔ اُس کو اِس کا علم تھا۔ اِس ضمن میں وہ اپنی بے چارگی اچھی طرح محسوس کرتا تھا، لیکن عام آدمیوں کی طرح اُس نے اپنی اِس کمزوری کو اپنا خاص رنگ بنانے کی کوشش کی اور آہستہ آہستہ اس میراکو بھی اپنی گمراہی کی سُولی پر چڑھا دیا۔

بحیثیت شاعر کے اُس کی حیثیت وہی ہے جو گلے سڑے پتّوں کی ہوتی ہے، جنھیں کھاد کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اُس کا کلام بڑی عمدہ کھاد ہے جس کی افادیت ایک نہ ایک دن ضرور ظاہر ہو کے رہے گی۔ اُس کی شاعری ایک گمراہ انسان کا کلام ہے جو انسانیت کی عمیق ترین پستیوں سے متعلق ہونے کے باوجود دوسرے انسانوں کے لیے اونچی فضاؤں میں مرغِ بادنما کا کام دے سکتا ہے۔ اُس کا کام ایک ''جگ ساپزل'' ہے جس کے ٹکڑے بڑے اطمینان اور سکون سے جوڑ کر دیکھنے چاہئیں۔

بحیثیت انسان کے وہ بڑا دلچسپ تھا۔ پرلے درجے کا مخلص جس کو اپنی اس قریب قریب نایاب صفت کا مطلقاً احساس نہیں تھا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ اشخاص جو اپنی خواہشاتِ جسمانی کا فیصلہ اپنے ہاتھوں کو سونپ دیتے ہیں، عام طور پر اِسی قسم کے مخلص ہوتے ہیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خود کو صریحاً دھوکا دیتے ہیں مگر اِس فریب دہی میں جو خلوص ہوتا ہے، وہ ظاہر ہے۔

میراجی نے شاعری کی بڑے خلوص کے ساتھ، شراب پی بڑے خلوص کے ساتھ، بھنگ پی بڑے خلوص کے ساتھ، لوگوں سے دوستی کی اور اُسے نبھایا۔ اپنی زندگی کی ایک عظیم ترین خواہش کو جُل دینے کے بعد وہ کسی اور سے دھوکا فریب کرنے کا اہل ہی نہیں رہا تھا۔ اِس اہلیت کے اخراج کے بعد وہ اِس قدر بے ضرر ہو گیا تھا کہ بے مصرف سا معلوم ہوتا تھا۔ ایک بھٹکا ہوا مسافر جو نگری نگری پھر رہا ہے، منزلیں قدم قدم پر اپنی آغوش اُس کے لیے وا کرتی ہیں مگر وہ اُن کی طرف دیکھے بغیر آگے نکلتا جا رہا ہے۔۔۔ کسی ایسی جگہ، جس کی کوئی سمت ہے نہ رقبہ۔۔۔

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 143 (1,1)

ایک ایسی تکون کی جانب جس کے ارکان اپنی جگہ سے ہٹ کر تین دائروں کی شکل میں اُس کے گرد گھوم رہے ہیں۔

میں نے میر اجی سے اُس کے کلام کے متعلق دو تین جملوں سے زیادہ کبھی گفتگو نہیں کی۔ میں اسے بکواس کہا کرتا تھا اور وہ اسے تسلیم کرتا تھا۔ ان تین گولوں اور موٹے موٹے دانوں کی مالا کو میں اُس کا فراڈ کہتا تھا۔ اسے بھی وہ تسلیم کرتا تھا۔ حالانکہ ہم دونوں جانتے تھے کہ یہ چیزیں فراڈ نہیں ہیں۔

ایک دفعہ اُس کے ہاتھ میں تین کی بجائے دو گولے دیکھ کر مجھے بہت تعجّب ہوا۔ میں نے جب اِس کا اظہار کیا تو میر اجی نے کہا ''برخوردار کا انتقال ہو گیا ہے مگر اپنے وقت پر ایک اور پیدا ہو جائے گا!''

جب تک میں بمبئی میں رہا، یہ دوسرا برخوردار پیدا نہ ہوا۔ یا تو اماں حوا عقیم ہو گئی تھیں یا باوا آدم مردم خیز نہیں رہے تھے۔ یہ رہی سہی خارجی تثلیث بھی ٹوٹ گئی تھی اور یہ بُری فال تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میر اجی کو اِس کا احساس تھا چنانچہ جیسا کہ سُننے میں آیا ہے اُس نے اُس کے باقی دو اقنوم بھی اپنے ہاتھ سے علیحدہ کر دیے تھے۔

مجھے نہیں معلوم میر اجی گھومتا گھامتا کب بمبئی پہنچا۔ میں اُن دِنوں فلمستان میں تھا، جب وہ مجھ سے ملنے کے لیے آیا۔ بہت خستہ حالت میں تھا۔ ہاتھ میں تین گولے بدستور موجود تھے۔ بوسیدہ سی کاپی بھی تھی، جس میں غالباً میر ابائی کا کلام اُس نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ایک عجیب شکل کی بوتل تھی جس کی گردن مُڑی ہوئی تھی۔ اس میں میر اجی نے شراب ڈال رکھی تھی۔ بوقتِ طلب وہ اس کا کاک کھولتا اور ایک گھونٹ چڑھا لیتا تھا۔

داڑھی غائب تھی، سر کے بال بہت ہلکے تھے۔ مگر بدن کی غلاظت بدستور موجود۔ چپل کا ایک پیر درست حالت میں تھا۔ دوسرا مرمّت طلب تھا۔ یہ کمی اُس نے پاؤں پر رسّی باندھ کر دُور کر رکھی تھی۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ اُن دِنوں غالباً ''آٹھ دِن'' کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 144 (1,1)

اس کی کہانی میری تھی جس کے لیے دو ایک گانوں کی ضرورت تھی۔ میں نے اِس خیال سے کہ مِیراجی کو کچھ روپے مل جائیں اُس سے یہ گانے لکھنے کے لیے کہا۔ جو اُس نے وہیں بیٹھے بیٹھے لکھ دیے۔ مگر کھڑے کھڑے قسم کے، نہایت واہیات جو یکسر غیر فلمی تھے۔۔۔۔۔۔ میں نے جب اُس کو اپنا فیصلہ سُنایا تو وہ خاموش رہا۔ واپس جاتے ہوئے اُس نے مجھ سے سات روپے طلب کیے کہ اُسے ایک اڈھالینا تھا۔

اس کے بعد بہت دیر تک اُس کو ہر روز ساڑھے سات روپے دینا میرا فرض ہوگیا۔ میں خود بوتل کا رسیا تھا۔ یہ منہ نہ لگے تو جی پر کیا گزرتی ہے، اس کا مجھے بخوبی علم تھا۔ اِس لیے میں اس رقم کا انتظام کر رکھتا۔ سات روپے میں رَم کا اَدّھا آتا تھا، باقی آٹھ آنے اُس کے آنے جانے کے لیے ہوتے تھے۔

بارشوں کا موسم آیا تو اُسے بڑی دِقّت محسوس ہوئی۔ بمبئی میں اِتنی شدید بارش ہوتی ہے کہ آدمی کی ہڈیاں تک بھیگ جاتی ہیں۔ اُس کے پاس فالتو کپڑے نہیں تھے۔ اِس لیے یہ موسم اُس کے لیے اور بھی زیادہ تکلیف دِہ تھا۔ اتفاق سے میرے پاس ایک برساتی تھی، جو میرا ایک ہٹّا کٹّا فوجی دوست صرف اِس لیے میرے گھر بُھول گیا تھا کہ وہ بہت وزنی تھی اور اُس کے کندھے شل کر دیتی تھی۔ میں نے اس کا ذکر مِیراجی سے کیا اور اس کے وزن سے بھی اُس کو آگاہ کر دیا۔ مِیرا جی نے کہا ''کوئی پروا نہیں، میرے کندھے اس کا بوجھ برداشت کر لیں گے۔'' چنانچہ وہ برساتی میں نے اُس کے حوالے کر دی جو ساری برسات اُس کے کندھوں پر رہی۔

مرحوم کو سمندر سے بہت دلچسپی تھی۔ میرا ایک دُور کا رشتہ دار اشرف ہے۔ وہ اُن دِنوں پائلٹ تھا۔ جوہو میں سمندر کے کنارے رہتا تھا۔ یہ میراجی کا دوست تھا۔ معلوم نہیں ان کی دوستی کی بناء کیا تھی۔ کیونکہ اشرف کو شعر و شاعری سے دُور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ بہر حال مِیراجی اُس کے ہاں رہتا تھا اور دن کو اُس کے حساب میں پیتا تھا۔

اشرف جب اپنے جھونپڑے میں نہیں ہوتا تھا، تو میراجی ساحل کی نرم نرم اور گیلی گیلی

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 145 (1,1)

ریت پر وہ برساتی بچھا کر لیٹ جاتا اور مبہم فکرِ شعر کیا کرتا تھا۔

اُن دِنوں ہر اِتوار کو جوہو جانا اور دن بھر پینا میرا معمول سا ہو گیا تھا۔ دو تین دوست اکٹھے ہو کر صبح نکل جاتے اور سارا دن ساحل پر گزارتے۔ میرا جی وہیں مل جاتا۔ اوٹ پٹانگ قسم کے مشاغل رہتے۔ ہم نے اس دوران میں شاید ہی کبھی ادب کے بارے میں گفتگو کی ہو۔ مردوں اور عورتوں کے تین چوتھائی ننگے جسم دیکھتے تھے۔ دہی بڑے اور چاٹ کھاتے تھے۔ ناریل کے پانی کے ساتھ شراب ملا کر پیتے تھے اور میرا جی کو وہیں چھوڑ کر واپس گھر چلے آتے تھے۔

اشرف کچھ عرصے کے بعد میرا جی کا بوجھ محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ خود پیتا تھا مگر اپنی مقررہ حد سے آگے نہیں بڑھتا تھا، لیکن میرا جی کے متعلق اُسے شکایت تھی کہ وہ اپنی حد سے گزر کر ایک اور حد قائم کر لیتا ہے، جس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ بے ہوش پڑا ہے مگر اور مانگے جا رہا ہے۔ اپنی اِس طلب کا دائرہ بنا لیتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ یہ کہاں سے شروع ہوئی تھی اور اسے کہاں ختم ہونا تھا۔

مجھے اُس کی شراب نوشی کے اِس پہلو کا علم نہیں تھا، لیکن ایک دن اس کا تجربہ بھی ہو گیا جس کو یاد کر کے میرا دل آج بھی افسردہ ہو جاتا ہے۔

سخت بارش ہو رہی تھی جس کے باعث برقی گاڑیوں کی نقل و حرکت کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا تھا۔ ''خشک دِن'' ہونے کی وجہ سے شہر میں شراب کی دُکانیں بند تھیں۔ مضافات میں صرف باندرہ ہی ایک ایسی جگہ تھی، جہاں سے مقررہ داموں پہ یہ چیز مل سکتی تھی۔ میرا جی میرے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ میرا پرانا لنگوٹیا حسن عباس جو دہلی سے میرے ساتھ چند دن گزارنے کے لیے آیا تھا۔ ہم تینوں باندرہ اُتر گئے اور ڈیڑھ بوتل رم خرید لی۔ واپس اسٹیشن پر آئے تو راجہ مہدی علی خان مل گیا۔ میری بیوی لاہور گئی ہوئی تھی، اِس لیے پروگرام یہ بنا کہ میرا جی اور راجہ رات میرے ہاں ہی رہیں گے۔

ایک بجے تک رم کے دَور چلتے رہے۔ بڑی بوتل ختم ہو گئی۔ راجہ کے لیے دو پیگ کافی

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 146 (1,1)

تھے۔ اُن کو ختم کر کے وہ ایک کونے میں بیٹھ گیا اور فلمی گیت لکھنے کی پریکٹس کرتا رہا۔ میں، حسن عباس اور میراجی پیتے اور فضول فضول باتیں کرتے رہے جن کا سر تھا نہ پیر۔ کرفیو کے باعث بازار سُنسان تھا۔ میں نے کہا اب سونا چاہیے۔ عباس اور راجہ نے میرے اِس فیصلے پر صاد کیا۔ میرا جی نہ مانا۔ ادّھے کی موجودگی اُس کے علم میں تھی، اِس لیے وہ اور پینا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں کیوں، میں اور عباس ضد میں آ گئے اور وہ ادّھا کھولنے سے انکار کر دیا۔ میراجی نے پہلے منتیں کیں، پھر حکم دینے لگا۔ میں اور عباس دونوں انتہا درجے کے سفلے ہو گئے۔ ہم نے اُس سے ایسی باتیں کیں کی اُن کی یاد سے مجھے ندامت محسوس ہوتی ہے۔ لڑجھگڑ کر ہم دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

میں صبح خیز ہوں۔ سب سے پہلے اُٹھا اور ساتھ والے کمرے میں گیا۔ میں نے رات کو راجہ سے کہہ دیا تھا کہ وہ میراجی کے لیے اسٹریچر بچھا دے اور خود صوفے پر سو جائے۔ راجہ اسٹریچر میں لبالب بھرا تھا۔ مگر صوفے پر میراجی موجود نہیں تھا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی۔ غسل خانے اور باورچی خانے میں دیکھا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ میں نے سوچا شاید وہ ناراضی کی حالت میں چلا گیا ہے۔ چنانچہ واقعات معلوم کرنے کے لیے میں نے راجہ کو جگایا۔ اُس نے بتایا کہ میراجی موجود تھا۔ اُس نے خود اُسے صوفے پر لٹایا تھا۔ ہم یہ گفتگو کر ہی رہے تھے کہ میراجی کی آواز آئی ''میں یہاں موجود ہوں۔''

وہ فرش پر راجہ مہدی علی خان کے اسٹریچر کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ اسٹریچر اُٹھا کر اُس کو باہر نکالا گیا۔ رات کی بات ہم سب کے دل و دماغ میں عود کر آئی، لیکن کسی نے اُس پر تبصرہ نہ کیا۔ میراجی نے مجھ سے آٹھ آنے لیے اور بھاری بھرکم برساتی اُٹھا کر چلا گیا۔ مجھے اُس پر بہت ترس آیا اور اپنے پر بہت غصہ۔ چنانچہ میں نے دل ہی دل میں خود کو بہت لعنت ملامت کی کہ میں رات کو ایک نکّی سی بات پر اُس کو دُکھ پہنچانے کا باعث بنا۔

اس کے بعد بھی میراجی مجھ سے ملتا رہا۔ فلم انڈسٹری کے حالات منقلب ہو جانے کے باعث میرا ہاتھ تنگ ہو گیا تھا۔ اب میں ہر روز میراجی کی شراب کا خرچ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اُس سے کبھی اِس کا ذکر نہیں کیا لیکن اُس کو علم ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایک دن مجھے اُس سے معلوم ہوا کہ اُس نے شراب چھوڑنے کے قصد سے بھنگ کھانی شروع کر دی ہے۔

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 147 (1,1)

بھنگ سے مجھے سخت نفرت ہے۔ایک دو بار استعمال کرنے سے میں اس کے ذلت آفریں نشے اور اس کے ردِّ عمل کا تجربہ کر چکا ہوں۔میں نے میراجی سے جب اس کے بارے میں گفتگو کی تو اُس نے کہا ''نہیں۔۔۔میرا خیال ہے یہ نشہ بھی کوئی بُرا نہیں۔اس کا اپنا رنگ ہے، اپنی کیفیت ہے،اپنا مزاج ہے۔

اُس نے بھنگ کے نشے کی خصوصیات پر ایک لیکچر سا شروع کر دیا۔۔۔۔افسوس ہے کہ مجھے پوری طرح یاد نہیں کہ اُس نے کیا کہا تھا۔اُس وقت میں اپنے دفتر میں تھا اور ''آٹھ دن'' کے ایک مشکل باب کی منظر نویسی میں مشغول تھا اور میرا دماغ ایک وقت میں صرف ایک کام کرنے کا عادی ہے۔وہ باتیں کرتا رہا اور میں منظر سوچنے میں مشغول رہا۔

بھنگ پینے کے بعد دماغ پر کیا گزرتی ہے، مجھے اس کے متعلق صرف اتنا ہی علم تھا کہ گرد و پیش کی چیزیں یا تو بہت چھوٹی ہو جاتی ہیں یا بہت بڑی۔آدمی حد سے زیادہ ذکی الحس ہو جاتا ہے۔کانوں میں ایسا شور مچتا ہے، جیسے ان میں لوہے کے کارخانے کُھل گئے ہیں۔دریا پانی کی ہلکی سی لکیر بن جاتے ہیں اور پانی کی ہلکی سی لکیریں بہت بڑے دریا۔آدمی ہنسنا شروع کر دے تو ہنستا ہی چلا جاتا ہے، روئے تو روتے نہیں تھکتا۔

میراجی نے اس نشے کی جو کیفیت بیان کی وہ میرا خیال ہے اس سے بہت مختلف تھی۔ اُس نے مجھے اس کے مختلف مدارج بتائے تھے۔اُس وقت جبکہ وہ بھنگ کھائے ہوئے تھا، غالباً لہروں کی بات کر رہا تھا۔''لو وہ کچھ گڑبڑ سی ہوئی۔۔۔کوئی چیز اِدھر سے اُدھر کی چیزوں سے مل ملا کر اوپر کو اُٹھی۔۔نیچے آ گئی۔۔۔پھر گڑبڑ سی ہوئی۔اور۔۔۔آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔۔۔۔ دماغ کی نالیوں میں رینگنے لگی، سرسراہٹ محسوس ہو رہی ہے۔۔۔۔بڑی نرم نرم۔پہلے نون تھا۔۔۔پورے اعلان کے ساتھ۔۔۔۔۔اب یہ غُنّے میں تبدیل ہو رہا ہے۔۔۔دھیرے دھیرے ہولے ہولے۔۔۔جیسے بلی گدگدے پنجوں پر چل رہی ہے۔۔۔اوہ۔۔۔زور سے میاؤں ہوئی۔۔۔لہر ٹوٹ گئی۔۔۔غائب ہو گئی۔''اور وہ چونک پڑتا ہے۔

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 148 (1,1)

تھوڑے وقفے کے بعد پھر یہی کیفیت نئے سرے سے محسوس کرتا ''لو اب پھر نون کے اعلان کی تیاریاں ہونے لگیں۔ گڑبڑ شروع ہوگئی ہے۔۔۔ آس پاس کی چیزیں یہ اعلان سننے کے لیے جمع ہو رہی ہیں۔ کانا پھوسیاں بھی ہو رہی ہیں۔۔۔ ہوگیا۔۔۔ اعلان ہوگیا۔۔۔ نون اُوپر کو اُٹھا۔۔۔ آہستہ آہستہ نیچے آیا۔ پھر وہی گڑبڑ۔۔۔ وہی کانا پھوسیاں۔۔۔ آس پاس کی چیزوں کے ہجوم میں نون نے انگڑائی لی اور رینگنے لگا۔۔۔ غُنہ کھنچ کر لمبا ہوتا جا رہا ہے۔۔۔ کوئی اُسے کُوٹ رہا ہے، رُوئی کے ہتھوڑوں سے۔۔۔ ضربیں سنائی نہیں دیتیں، لیکن اُن کا ننھا مُنّا، پَر سے بھی ہلکا لمس محسوس ہو رہا ہے۔۔۔ غوں، غوں، غوں۔۔۔ جیسے بچہ ماں کا دودھ پیتے پیتے سو رہا ہے۔۔۔ ٹھہرو، دُودھ کا بلبلہ بن گیا ہے۔۔۔ لو وہ پھٹ بھی گیا۔۔'' اور وہ پھر چونک پڑتا۔

مجھے یاد ہے، میں نے اُس سے کہا تھا کہ وہ اپنے اس تجربے، اپنی اِس کیفیت کو اشعار میں من وعن بیان کرے۔ اُس نے وعدہ کیا تھا۔ معلوم نہیں اُس نے اِدھر توجہ دی یا بُھول گیا۔

کُرید کُرید کر میں کسی سے کچھ پوچھا نہیں کرتا۔ سرسری گفتگوؤں کے دوران میں میرا جی سے مختلف موضوعوں پر تبادلۂ خیالات ہوتا تھا، لیکن اُس کی ذاتیات کبھی معرضِ گفتگو میں نہیں آئی تھی۔ ایک مرتبہ معلوم نہیں کس سلسلے میں اُس کی اجابتِ جنسی کے خاص ذریعے کا ذکر آ گیا۔ اُس نے مجھے بتایا: ''اس کے لیے اب مجھے خارجی چیزوں سے مدد لینی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر ایسی ٹانگیں جن پر میل اُتارا جا رہا ہے۔۔۔ خون میں لتھڑی ہوئی خاموشیاں۔۔۔''

یہ سُن کر میں نے محسوس کیا تھا کہ میرا جی کی ضلالت اب اِس انتہا کو پہنچ گئی ہے کہ اسے خارجی ذرائع کی امداد طلب کرنا پڑ گئی ہے۔ اچھا ہوا وہ جلدی مر گیا۔ کیونکہ اُس کی زندگی کے خرابے میں اور زیادہ خراب ہونے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ وہ اگر کچھ دیر سے مرتا تو یقیناً اُس کی موت بھی ایک دردناک ابہام بن جاتی۔

(گنجے فرشتے)

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 149 (1,1)

شاد امرتسری

میراجی

۱۹۴۱ء کی بات ہے، جب میں امرتسر میں ایف اے میں پڑھتا تھا۔گوجرانوالہ میں ہمارے ایک چچا جان کے ہاں ایک شادی کے موقعے پر چچا جان نے مجھے اکرام اللہ سے ملاتے ہوئے کہا:

''بھئی یہ تمھاری چچی کے بھائی ہیں، اکرام اللہ ڈار، ثناء اللہ ڈار کے چھوٹے بھائی۔اُن دِنوں میں میراجی کی نظمیں اکثر''ادبی دُنیا'' میں پڑھا کرتا تھا۔اکرام اللہ ڈار یعنی میراجی کے چھوٹے بھائی کامی سے میراجی کی شاعری کے متعلق باتیں ہوئیں۔۔۔۔اور میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ میراجی ثناء اللہ ڈار ہی ہیں اور میری چچی کے بھائی ہیں۔

اس شادی میں کامی بھائی کے والد منشی مہتاب دین مرحوم بھی تھے۔اُن سے مزید میراجی کی عجیب عجیب عادتوں کا بھی پتہ چلا۔یعنی یہ کہ وہ کبھی کسی شادی وغیرہ قسم کی تقریب میں نہیں جاتے۔گھر میں ایک الگ کمرے میں رہتے ہیں، جہاں کبھی کبھی اپنے بھائی کامی سے وائلن سُنتے ہیں، اور یہ کہ اُنھیں اپنی والدہ کے علاوہ اور کسی سے کوئی سروکار نہیں۔

بعد ازاں اپنے چچازاد بھائی سے کئی اور باتوں کا پتہ چلا۔جب وہ میٹرک میں پڑھتے تھے تو مزنگ میں ایک بنگالی افسر آ کر رہے۔اُن کی ایک سانولی سلونی لڑکی تھی، جس کا نام میرا سین تھا۔ثناء کو وہ لڑکی بہت بھائی، مگر ثناء صاحب نے اُس سے کبھی بات تک بھی نہ کی، اور فقط اُسے دُور سے دیکھتے رہے۔تھوڑے ہی عرصے کے بعد اُس بنگالی افسر کی کہیں اور تبدیلی ہوگئی اور وہ لڑکی بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ثناء صاحب کو داغِ مفارقت دے کر چلی گئی۔

ثناء صاحب میٹرک پاس نہ کر سکے اور اسکول جانا چھوڑ دیا، گھر میں بیٹھ کر کتابیں پڑھنا،

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 150 (1,1)

گیت پڑھنا اور شعر کہنا شروع کر دیا۔ تخلّص کے لیے میرا سین کا نام ہی کافی تھا، مگر اُنھوں نے اس میں تھوڑی سی ترمیم کر کے میرآجی بنالیا۔ میرا سین نے میرآجی کے دل و دماغ پر کچھ اِس قسم کا اثر کیا کہ پھر تمام عمر کوئی اور لڑکی اُن کے ذہن میں نہ سما سکی، اور اگر کسی نے سمانا بھی چاہا تو اُسے میرا سین کا روپ دھارنا پڑا۔

میرا سین کا یہی روپ میرآجی کی شاعری اور اُس کے فن کا محرک بنا، بلکہ بعد میں یہ روپ اُن کی ذات میں کچھ اِس طرح گھُل مل گیا کہ وہ خود بھی میرا سین بن گئے۔ اب اُنھی میرا سین کی تلاش نہ رہی تھی، بلکہ وہ جب چاہتے، اُس کے ساتھ وصل کے لمحے گزارتے۔ ان لمحوں میں وہ خود ہی روتے، اور خود ہی اپنے آنسو پونچھتے۔ بقول اُن کے:

ہاتھ آلودہ ہے، نم دار ہے، دھندلی ہے نظر
ہاتھ سے آنکھوں کے آنسو تو نہیں پونچھے تھے

نفسیات کے ماہرین معلوم نہیں، اِس بارے میں کیا کیا کہیں گے، مگر میں تو فقط اِتنا جانتا ہوں کہ وہ اِس قسم کا عشق کرنے کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ اُنھیں ہرجائی بننا پسند نہ تھا۔ وہ عشق کے معاملے میں فقط اِس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ عشق زندگی میں ایک اور فقط ایک ہی عورت سے ہوسکتا ہے۔ اور اس کے لیے لڑکی کے جسم کا ہونا بھی کوئی خاص ضروری نہیں۔ عشق بذاتِ خود گوشت پوست رکھتا ہے۔ اور جب عشق کو ہی اپنالیا تو پھر اور کسی گوشت پوست رکھنے والے کی حاجت کیا معنی؟

میرآجی کی شاعری بھی اُن کے انوکھے نظریۂ عشق کی طرح انوکھی اور نرالی ہے اور ایسا ہونا بھی ضروری تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے من میں جھانکتے تو اُنھیں عجیب عجیب قسم کی تصویریں نظر آتیں اور اُن عجیب تصویروں کے عجیب تر نقوش کو دوسروں کی آنکھوں کو سامنے لانے کے لیے اُنھیں اُسی قسم کے عجیب الفاظ اور انداز کی ضرورت پڑتی تھی۔ مگر وہ تصویریں اور وہ نقوش اس زبان اور اس انداز میں سما کر دوسروں کے لیے اتنے دُھندلے اور مسخ ہو جاتے کہ دیکھنے والے

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 151 (1,1)

آنکھیں مَل مَل کر خطوط کی خوب صورتی کو نہیں پا سکتے تھے۔ میرا جی شعر کہتے تھے اور پڑھنے والے اُنھیں بجھارتیں سمجھ کر ایک دوسرے کا مُنہ تکتے تھے۔ اِس تمام قصّے میں بنگال کا جادو کارفرما تھا۔ میرا سین آکاش کی وسعتوں میں اپنی زُلفوں کو جھٹکتی تو میرا جی کے شعر ایک انجانا سحر بن جاتے۔ جسے بعض اوقات میرا جی خود بھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں انداز کی اِس مشکل پسندی میں میرا جی کا شعوری ہاتھ نہیں بلکہ اِس اِظہار میں میرا جی کا خلوص جھلکتا ہوا دِکھائی دیتا ہے۔ تخیل کی اِس نرالی طرز کے لیے ضروری تھا کہ پیرایۂ بیان بھی نرالا ہوتا وگرنہ خیال کا اچھوتا ہونا ہی بے معنی ہے۔ سب سے بڑی خصوصیت جو میرا جی کی شاعری میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ الفاظ نہایت ہی سادہ ہیں۔ ہلکے پُھلکے گاتے ہوئے جملے اُن کی جان ہیں۔ اُن کی کوئی سی نظم پڑھیے، روانی، موسیقی، نرمی اور لچک کا احساس آپ کو ضرور ہو گا۔ مصرعے تان پلٹوں کو سنوارتے ہوئے آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ایک بہت بڑا راگی گلے کی نرم نرم حرکتوں سے خوب صورت تانیں نکالتا ہوا راگ کے مرکزی خیال کے اِرد گرد ایک ہلکا پُھلکا غبار سا پیدا کرتا چلا جا رہا ہے۔ راگ کی نوعیت کو پہچاننے کے لیے سُننے والے کو اپنی سوچ کو اُتنا ہی لطیف بنانا پڑتا ہے جتنی لطافت راگ کی دلکشی میں موجود ہے اور کہیں سُننے والے تانوں کی ظاہری خوب صورتی سے آگے نہیں بڑھتے اور راگ کے مرکزی خیال کو پانے میں ناکام رہتے ہیں۔

میرا جی کا موضوع جنس اور فقط جنس ہی سہی مگر اس بڑے اور عالمگیر موضوع میں ہزاروں لطافتیں اور باریکیاں ہیں جن کو بیان کرنے کے لیے میرا جی نے اُسی طرح کے لطیف اشارے اور کنائے استعمال کیے ہیں۔ وگرنہ موضوع کی کرختگی اور بہیمیت ناقابلِ برداشت بن جاتی۔ اِس کرختگی کو لطافتِ فن سے ہمکنار کرنے کے لیے میرا جی نے نئے نئے مسلسل استعارے اور عجیب عجیب کنائے استعمال کیے ہیں جن میں وہ بلا شبہ کامیاب ہے۔ اِس کامیابی کا راز میرا جی کی موسیقیت میں ہے۔ اُس کے فطری جذبۂ آہنگ میں ہے۔ اسی موسیقی اور آہنگ کے پس منظر

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 152 (1,1)

میں آریائی ذوق اور فلسفۂ ویدانت نرم رو سا گر ہے جس کی دِلکش اور لچکیلی لہریں میرؔ آجی کے ذہن سے آ کر نرم نرم چھیڑیں کرتی ہیں۔ اور اُس کا ذہن اِن ہلکی پھلکی چپقلشوں سے راگ کی ندی بن جاتا ہے۔ اور پھر اُس راگ کی ندی میں سے جو چیز اُبھرتی ہے اُس میں وہی دلکشی، رعنائی، نرمی اور خوب صورتی کے اجزا کا موزوں تناسب ہوتا ہے۔ اُن کی ایک نظم جس کا موضوع ایک الھڑ دوشیزہ کا حُسن ہے (مجھے نظم کا عُنوان یاد نہیں) کے دو مصرعے ملاحظہ کیجیے گا۔ یہ اُن کی اوّلین مقفّٰی نظموں میں سے ہے:

کبھی آپ ہنسے کبھی نین ہنسیں کبھی نینوں کے بیچ ہنسے کجرا
کبھی سارا سُمدر رنگ ہنسے، جب انگ ہنسے، ہنس دے کجرا

ایک نظم "بعد کی اُڑان" کے آغاز کا بند ملاحظہ ہو:

چوم ہی لے گا بڑا آیا کہیں کا کوّا
کلوا کالا کلوٹا کاجل

میں اگر مرد نہ ہوتا تو یہ کہتا تجھ سے

کسی دوشیزہ کی آنکھ میں چھلکتے ہوئے آنسو کو اِس انداز میں بیان کرنا کہ اُس کی دُکھ بھری زندگی پڑھنے والے کے سامنے آجائے، یہ میرؔ آجی کے ہی انداز کا حصہ ہے۔

میرؔ آجی کی نظموں کو غور سے پڑھنے سے ایک اور بات کا بھی پتہ چلتا ہے اور وہ ہے اُن کی نظموں کا ایک مخصوص ڈھانچہ۔ اس مخصوص ڈھانچے یعنی PATTERN کی ساخت کچھ اِس قسم کی ہے کہ ہر نظم کے چند مصرعے جو ابتدائی بند میں آتے ہیں وہ ساری نظم میں مختلف موقعوں پر تھوڑے بہت ردوبدل کے ساتھ دُہرائے جاتے ہیں اور اِس طرح سے ہر نظم طبلے کی تال کا ایک گریا چکر سا معلوم ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ بھی اُن کے فطری جذبۂ آہنگ کی پیداوار ہو۔ مثلاً اُن کی ایک نظم "طالبِ علم" کے آغاز کا بند ملاحظہ ہو:

تم کو معلوم ہے تیمور کی فوجیں جس وقت

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 153 (1,1)

اپنے دُشمن پہ چڑھا کرتی تھیں
عورتیں پیچھے رہا کرتی تھیں

پہلا بند یہاں ختم ہو جاتا ہے اور ''عورتیں پیچھے رہا کرتی تھیں'' والا مصرعہ مختلف بندوں میں معمولی سی تبدیلی کے ساتھ مناسب موقعوں پر آتا ہے اور خیال کو سمجھنے میں بالکل اُسی طرح مدد دیتا ہے جس طرح طبلے کی تال میں سَم راگ کی صحت کو جانچنے میں ممد و معاون ہوتا ہے۔ میرآجی کی شاعری کے اِس PATTERN نے میرآجی کی شاعری کو ایک واضح انفرادیت بخش دی ہے جس کی پہونچ اور پہچان بالکل اپنی ہے، اِسی طرح اُن کی نظم ''مجاور'' میں علامت کا اچھوتا پن دیکھیے گا:

بہتے آنسو کو کوئی روک نہیں سکتا
بند آنکھوں کے پپوٹوں سے وہ رِستے ہوئے
پلکوں کو بھگوتے ہوئے رُخسار کی ڈھلوان پہ آجاتے ہیں
بند تابوت سے اِک نعش نکل کر جیسے
منظرِ عام پہ آجائے گی
بند تابوت میں میری آنکھیں
اَور آنسو ہیں مری تشنہ تمناؤں کی نعشیں، پل میں
منظرِ عام پہ آجاتی ہیں
شرم کا ان کی طبیعت میں تقاضا ہی نہیں

اِس نظم میں بھی پہلا مصرع اور دوسرا مصرع نظم میں مختلف مقامات پر سَم کی طرح آتے ہیں اَور نظم کی شدتِ تاثر کا باعث بنتے ہیں۔

میرآجی کی ایک نہایت خوب صورت نظم ہے ''ترقی پسند ادب۔'' اُس میں بھی اُس کا اپنا منفرد انداز ہے۔ نظم ساری کی ساری نقل کیے دیتا ہوں ورنہ اس کا لطف نہیں آسکے گا۔

اُس کو ہاتھ لگایا ہو گا ہاتھ لگانے والے نے

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 154 (1,1)

پھول ہے رادھا، بھنورا، بھنورا، بھنورے نے، ہاں کالے نے
جمنا تٹ پر ناؤ چلائی ناؤ چلانے والے نے
سکھیاں کب تھیں لاج بچاتیں، کچھ نہ سُنی متوالے نے
کام نہ آیا بات نہ رکھی اپنے دل کے اُجالے نے

دل کا اُجالا بنسی والا میٹھی جس کی بانی ہے
بنسی دُھن کی بات نہ کہنا یہ تو پُرانی کہانی ہے
اب تو ساری دُنیا بدلی ہر صورت انجانی ہے
دل میں سب کے چھایا اندھیرا ظاہر ہی نورانی ہے
یہ بھی رُت ہے مٹ جائے گی، ہر رُت آنی جانی ہے
اِتنی بات کہ دل بے چین رہے جگ میں لافانی ہے

دل بے چین ہو اراد ھے کا کون اُسے بہلائے گا
جمنا تٹ کی بات بھی ہوتی اب تو دیکھا جائے گا
چُپکے سہے گی رنگ وہ رادھا جو بھی سر پر آئے گا
اودھو شیام پہیلی رہتن دُنیا کو سمجھائے گا
پریم کتھا کا جادو سننے والوں کے دل پر چھائے گا
یہ تو بتاؤ کون سُورما اب کے ہاتھ لگائے گا

قطع نظر اِس حقیقت کے کہ میرا جی کی شاعری شکست کی آواز ہے، اُس کی نظموں میں بعض ایسے انسانی دُکھوں کے نشانات بھی ملتے ہیں جن سے ہر کوئی دو چار ہوتا ہے۔ ویسے بھی زندگی میں اگر کوئی غم نہ ہو تو وہ زندگی ہی کیا ہے۔ دُکھ کا تصوّر ہی سُکھ کی پہچان ہے مگر میرا جی نے ان دُکھوں کو اپنے اندر سمو کر کچھ عجیب قسم کی لذّت کشی کی ہے۔ ایک نظم ''بیوپاری'' میں وہ پکار اُٹھا

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 155 (1,1)

ہے:

میں ہوں اِک بھنڈار دکھوں کا میرے پاس خزانا ہے
میں نے اوروں کے دکھ میں اپنے دکھ کو پہچانا ہے

اور پھر

دنیا کے دکھ بیچ بیچ کر میرا جیون بیتا ہے
ہار ہار کر اپنی بازی میں نے جگ کو جیتا ہے

میرآجی کے گیتوں اور اُس کی نظموں میں کوئی نمایاں فرق نہیں۔ خیال کی لطافت اَور رفعت اُن میں بھی نظموں کی سی ہے اور کیونکہ اُس کی زبان اَور انداز دونوں یکساں ہیں اِس لیے ہم گیتوں کو نظموں سے علیٰحدہ طور پر نہیں سوچ سکتے۔ البتہ اُن میں موسیقی زیادہ ہے۔ نرمی اور لچک کی افراط ہے جو ہونا بھی چاہیے۔

میرآجی کی شاعری اُس کی اپنی ذہنی اُلجھنوں کی تخلیق ہوتے ہوئے بھی ہمہ گیر تاثرات کی حامل ہے۔ یہ اُلجھنیں کسی حد تک ہر انسان کی اُلجھنیں ہیں جنھیں سُلجھاتے سُلجھاتے ہر ذی حس انسان موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ مانا کہ میرآجی نے ان گُتھیوں کو سُلجھانے کی کوشش نہیں کی مگر اِس اُلجھاؤ میں جو دل کشی اور خوب صورتی ہے اُس کی جھلک ضرور دِکھائی دیتی ہے اور خود زندگی بھر اسی حُسن اور لوچ سے تاثر حاصل کیا ہے اور وہ کر بھی یہی کچھ سکتا تھا۔ میرآجی کی نظمیں اُردو شاعری میں موضوعاتی اعتبار سے قابل قدر اضافہ ہیں۔ ان کی دلکشی اور لچکیلا پن غیر فانی ہے۔ ان کی سوچ کی منزلیں انوکھی ہیں۔ اِن میں ہلکے پُھلکے الفاظ کے اندر معانی کا موجیں مارتا ہوا ساگر ہے۔ اِس ساگر کی موجیں کبھی کبھی الفاظ کی سطح کو چیر کر سامنے آجاتی ہیں۔ ایک ایسی دُنیا میں جہاں غم میں بھی ایک لوچ ہے، ایک نرمی ہے، ایک دلکشی ہے، جہاں غم تلخ ہونے کے باوجود آسودگی بخشتا ہے۔

(ہفت روزہ "اقدام"، 9 نومبر 1952)

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 156 (1,1)

شاہد احمد دہلوی

میراجی

دِلّی اور لاہور ہمارے لیے گھر آنگن تھا۔ جب جی چاہا منہ اُٹھایا اور چل پڑے۔ کھانے وانے سے فارغ ہو کر رات کو فرنٹیئر میل میں سوار ہوئے اور سو گئے۔ آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ گاڑی لاہور پر کھڑی ہے۔ سال میں کئی کئی پھیرے لاہور کے ہو جاتے تھے۔ لاہور ادیبوں کی منڈی تھا۔ سرسیّد نے انھیں ''زندہ دلانِ پنجاب'' کہا اور واقعی یہ معلوم ہوتا تھا کہ اِس خطّے میں زندگی اُبلتی ہے اور گُنگُناتی گاتی پھرتی ہے۔ کتنا خلوص تھا یہاں کے لوگوں میں اور کتنی محبّت! ٹوٹ کر ملتے، ہاتھوں ہاتھ لیتے اور سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ ان میں تیر میر نہیں آئی تھی۔ ادیب اور شاعر نرے ادیب اور شاعر ہی تھے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ آرٹسٹ کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، اس کی تصدیق لاہور ہی میں ہوتی تھی اور سچ بھی ہے، آرٹسٹ کا مذہب تو آرٹ ہی ہوتا ہے۔ اب کی مجھے خبر نہیں، یہ کوئی ستارہ اٹھارہ سال ادھر کی باتیں ہیں۔ اب تو زمین آسمان ہی بدل گئے تو بھلا ادب و شعر کی قدریں کیوں نہ بدلی ہوں گی؟ خیر، کچھ ہوگا، یہ وقت اِس بحث میں پڑنے کا نہیں۔

ہاں تو اچھے وقت تھے، اچھے لوگ تھے۔ اُن سے مل کر جی خوش ہوتا تھا۔ ایک بار ملے، دوبارہ ملنے کی ہوس! اور سچ تو یہ ہے کہ ان میں سے بعض کے ساتھ برسوں یکجائی رہی اور جی نہیں بھرا بلکہ اُن سے بے ملے چین نہیں پڑتا تھا۔ بے غرض ملتے، جی کھول کر ملتے، اُجلی طبیعتیں تھیں۔ بعض دفعہ بڑی ناگوار باتیں بھی ہو جاتیں، مگر کیا مجال جو آنکھ پر ذرا سا مَیل آجائے۔ تم نے ہمیں کہہ لیا، ہم نے تمھیں کہہ لیا۔ اے لو دل صاف ہو گئے۔ اچھے لوگوں میں یہی ہوتا ہے۔ زمانہ سدا ایک سا نہیں رہتا، جب تک بندھن بندھا ہوا ہے، بندھا ہوا ہے۔ جب ٹوٹا ساری تیلیاں بکھر گئیں۔

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 157 (1,1)

جو دم گزر جائے غنیمت ہے۔ اب وہ دن جب بھی یاد آتے ہیں تو دل پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے۔ یہی کیا کم عذاب تھا کہ ایک دوسرے سے بچھڑ گئے اب اُن کی سناؤنی سننے کو کہاں سے پتھر کا دل لاؤں۔ بُڈھے مرے، اُنھیں تو مرنا ہی تھا۔ میر ناصر علی مرے، ناصر نذیر فراقؔ مرے، میر باقر علی داستان گو مرے، علامہ راشد الخیری مرے، مولانا عنایت اللہ مرے، کس کس کو گناؤں؟ ایک ہو تو بتاؤں۔ اُنھوں نے اچھی گزاری اور عمرِ طبعی کو پہنچ کر مرے مگر جوانوں کا مرنا قیامت ہے۔

البیلا رفیقی، ہنس مکھ چُغتائی، عجوبہ افسانہ نگار رفیق حسین، اب آخیر آخیر میں رومانی اختر اور اب پُراسرار میراجی! ہائے کیسا کڑیل جوان تھا، یہ کیسے لَوٹ گیا؟ ہو نہ ہو اُسے تو زمانے کی نظر کھا گئی۔

گر پیرِ نَو دسالہ بمیرد عجیبے نیست
ایں ماتمِ سخت است کہ گویند جواں مُرد

بمبئی سے خبر آئی ہے کہ میراجی کسی ہسپتال میں مر گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ بے کسی کی موت! ماں، باپ، بہن بھائی، دوست احباب سب کے ہوتے ہوتے سات پردیس میں بے کسی کی موت! ؎

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمین

لیکن نہیں، میں تو جذبات کی رَو میں بہہ گیا۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو تعجب ہوتا۔ جو یوں نہ ہوتا تو میراجی کی عظمت میں فرق آجاتا۔ اُس کی عظیم شخصیت کا ایسا ہی عبرت ناک انجام ہونا چاہیے تھا۔ عبرت ناک اُس کے لیے نہیں ہمارے لیے۔ زمانے کی یہی رِیت ہے۔ رونا اِس کا ہے کہ وہ عظیم شاعر، وہ عظیم نثّار، وہ عظیم حُسن کار اَب ہم میں نہیں ہے۔ اب وہ وہاں ہے جہاں ہماری آرزوئیں رہتی ہیں۔ موت نے اُسے کس قدر پیارا بنا دیا۔ ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صُحبت نہیں رہی

سن تو ٹھیک یاد نہیں! ہاں پندرہ سولہ سال ادھر کی بات ہے میں حسبِ معمول لاہور گیا۔

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 158 (1,1)

یہ وہ زمانہ تھا کہ ''نیرنگِ خیال'' گر رہا تھا اور ''ادبی دُنیا'' اُبھر رہا تھا۔ کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی خوب خوب لکھ رہے تھے۔ صلاح الدین احمد اور میراجی کی ادارت میں ''ادبی دُنیا'' اس نفاست سے نکل رہا تھا کہ دیکھنے دِکھانے کی چیز ہوتا تھا۔ میراجی کی شاعری سے مجھے کچھ دلچسپی تو نہیں تھی مگر ایک عجوبہ چیز سمجھ کر اُسے پڑھ ضرور لیتا تھا۔ اسے سمجھنے کی صلاحیت نہ تو اُس وقت تھی اور نہ اب ہے۔ اُس کے مختصر سے مختصر اور طویل سے طویل مصرعے خواہ مخواہ جاذبِ نظر ہوتے تھے۔ چھوٹے سے چھوٹا مصرعہ ایک لفظ کا اور بڑے سے بڑا مصرعہ اِتنا کہ ''ادبی دُنیا'' کے جہازی سائز کی ایک پوری سطر سے نکل کر دوسری سطر کا بھی آدھا پونا حصہ دبا لیتا تھا۔ خیر تو مطلب وطلب تو خاک سمجھ میں آتا نہ تھا۔ البتہ میراجی کی نظم میں وہی کشش ہوتی تھی جو ایک معمّے میں ہوتی ہے مگر اُن کی نثر میں بلا کی دل کشی ہوتی تھی۔ مشرق کے شاعروں اور مغرب کے شاعروں پر اُنھوں نے سلسلے وار کئی مضامین لکھے تھے اور سب کے سب ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر اِس کے علاوہ ادبی جائزے میں جس دِقّتِ نظر سے میراجی کام لیتے، بہت کم سخن فہم اس حد کو پہنچتے۔ ہاں تو میں لاہور گیا تو مال روڈ پر ''ادبی دُنیا'' کے دفتر بھی گیا۔ کمرے میں داخل ہوا تو صلاح الدین احمد نظر نہیں آئے۔ سامنے ایک عجیب وضع کا انسان بیٹھا تھا۔ زُلفیں چُھوٹی ہوئیں، گھُلی پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں، ستواں ناک، موزوں دہانہ، کتراواں مونچھیں، مُنڈی ہوئی ڈاڑھی، تھوڑی سے عزم ٹپکتا تھا۔ نظریں بنفشئ شعاعوں کی طرح آر پار ہو جانے والی، خاصی اچھی صورت شکل تھی مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ موانست کی بجائے رمیدگی کا احساس ہوا۔ گرمیوں میں گرم کوٹ! خیال آیا کہ شاید گرم چائے کی طرح گرم کوٹ بھی گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتا ہوگا، دل نے کہا کہ ہو نہ ہو میراجی ہو۔ یہ تو اس شخص کی شاعری ہی سے ظاہر تھا کہ غیر معمولی انسان ہوگا۔ پوچھا ''صلاح الدین احمد صاحب کہاں ہیں؟'' بولے ''کہیں گئے ہوئے ہیں'' پوچھا ''آپ میراجی ہیں؟'' بولے ''جی ہاں'' میں نے اپنا نام بتایا۔ تپاک سے ملے، کچھ دیر اُن سے رسمی سی باتیں ہوئیں۔ اُن کے بولنے کا انداز ایسا تھا جیسے خفا ہو رہے ہوں۔ نپے تُلے فقرے ایک خاص لہجے میں بولتے اور چُپکے ہو جاتے۔ زیادہ بات کرنے

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 159 (1,1)

کے وہ قائل نہ تھے اور نہ اُنھیں تکلّف کی گفتگو آتی تھی۔ پہلا اثر یہ ہوا کہ یہ شخص اکھل کُھرا ہے۔ دماغ چوٹا ہے۔ مختصر سی بات چیت کے بعد اجازت چاہی، باہر نکلے تو میرے ساتھی نے کہا: ''ارے میاں! یہ تو ڈاکو معلوم ہوتا ہے، اس نے ضرور کوئی خون کیا ہے، دیکھا نہیں تم نے؟ اُس کی آنکھیں کیسی تھیں؟'' میں نے کہا: یہ تو اللہ ہی کو معلوم ہے کہ وہ کیا ہے مگر آدمی اپنی وضع کا ایک ہے۔''

تھوڑے ہی عرصے بعد اُن سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ اب کے دِلّی میں ریڈیو پر وہ تقریر کرنے آئے تھے۔ مجھ سے ملنے میرے گھر آئے۔ جب گئے تو بہت کچھ پہلا اثر زائل کر گئے۔ آدمی تو بُرا نہیں ہے۔ دماغ بھی چوٹا نہیں ہے ورنہ ملنے کیوں آتا؟ پھر ایک دفعہ آئے اور بولے کہ ''ریڈیو میں ملازمت کے لیے بلایا ہے'' مجھے کچھ تعجب سا ہوا کہ یہ شخص ریڈیو میں کیا کرے گا؟ بہر حال معلوم ہوا کہ گیت لکھیں گے اور نثر کی چیزیں بھی، تنخواہ ڈیڑھ سو ملے گی۔ میں نے کہا: ''تنخواہ کم ہے، ''ادبی دُنیا'' آپ کو کیا ملتا تھا؟'' بولے: ''تیس روپے'' میں نے حیرت سے کہا: ''بس!'' کہنے لگے ''مولانا سے دوستانہ تعلقات تھے'' میں نے کہا: ''ٹھیک ہے، حسابِ دوستاں در دل۔'' معلوم ہوا کہ بیوی بچے تو ہیں نہیں کیوں کہ شادی ہی نہیں کی، اپنے خرچے بھر کو ڈیڑھ سو روپے بہت تھے۔ چنانچہ میراجی۔ ریڈیو میں نوکر ہو گئے اور اُن سے اکثر ملاقات ہونے لگی اور اُن کی نظمیں اور مضامین ''ساقی'' میں چھپنے لگے۔ ریڈیو میں اُس وقت اچھے اچھے ادیب اور شاعر جمع ہو گئے تھے۔ ن۔م راشد، کرشن چندر، منٹو، چراغ حسن حسرت، اوپندر ناتھ اشک، انصار ناصری، میراجی، اختر الایمان وغیرہ سب خوب لکھ رہے تھے۔ اور دِلّی ریڈیو کا طوطی بول رہا تھا۔ راشد صاحب کے مشورے سے میراجی نے ایک دو سوٹ بھی سلوائے تھے مگر اُنھیں کپڑے پہننے کا کبھی سلیقہ نہ آیا۔ عجیب اَولو اَولو معلوم ہوتے تھے۔ مارے باندھے سے کہیں کپڑے پہنے جاتے ہیں؟ کچھ مدت بعد میراجی پھر اپنی پرانی دھج پر آ گئے۔ نہایت موٹے اور بھدّے ٹپّو کا اچکن نما کوٹ اور اُسی کا پتلون، جاڑا، گرمی، سب میں یہی گرم لباس چلتا تھا۔

ریڈیو کے مسوّدات لکھنے میں میراجی کو کافی مہارت ہو گئی تھی اور حسبِ ضرورت بے

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 160 (1,1)

تکلّف لکھ لیتے تھے۔ گیت ریڈیو ہی میں آ کر لکھے اور اِتنے کہ اُن کا مجموعہ ''گیت ہی گیت'' کے نام سے شائع ہوا۔ نثر میں بھی صاحبِ طرز تھے۔ اندازِ فکر فلسفیانہ اور طرزِ بیان انشاء پرداز انہ تھا۔ نظمیں جب کہنے پر آتے تھے تو کئی کئی کہہ لیتے تھے مگر خدا جانے کب کہتے تھے۔ چند نظمیں خود اُن سے سمجھیں تو سمجھ میں آئیں اور بعض خود اُن کی سمجھ میں بھی نہیں آئیں۔ غزلیں بھی کہی ہیں اور بہت ستھری۔ فی البدیہہ بھی کہتے تھے۔ اشعار کے معاملے میں میرا حافظہ کمزور ہے، صرف ایک مصرعہ اُن کا چپک کر رہ گیا، وہ بھی اپنے عجب کی وجہ سے اور کچھ نہیں تو اس سے اُن کی حاضر دماغی اور قادر الکلامی ضرور ظاہر ہوتی ہے۔ ہم چند دوست چائے پینے کسی ہوٹل میں داخل ہوئے۔ ایک صاحب نے چائے پینے سے انکار کر دیا۔ یہ کہہ کر کہ اِتنی تو گرمی پڑ رہی ہے۔ دوسرے صاحب بولے: ''گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ پھر چائے والوں کے مقولوں پر بات چل نکلی۔ کسی نے کہا: ''اگر اشعار میں مقولے باندھے جائیں تو بہتر'' دوسرے بولے ''اشعار میں بھی ہیں مثلاً : ؎

ایک پیسہ ماں سے لو اتنی چائے باپ کو دو

یا ؎ یہ شخص اور اس کا بھائی پیتے ہیں روزانہ چائے

بھائی کے قافیے ''چائے'' پر سب سر دُھننے لگے۔ پھر کسی نے کہا: ''گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے'' بھی دراصل چائے والوں کا مصرعہ ہی ہوگا۔ کسی نے کہا یہ تو مصرعہ کسی طرح بن ہی نہیں سکتا۔ میراجی اب تک چُپ بیٹھے تھے، بولے: ''مصرعہ تو بن سکتا ہے۔ ؎

گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈ پہنچاتی ہے۔ ڈک''

اِس پر خوب قہقہہ پڑا۔ واقعی نہ تو کوئی لفظ بڑھا اور نہ گھٹا، ہلدی لگی نہ پھٹکڑی رنگ چوکھا آ گیا۔

میراجی مشاعروں اور مجلسوں میں نہیں جاتے تھے۔ یوں بھی وہ بہت کم آمیز تھے اور بڑے آدمیوں سے ملنا تو عار سمجھتے تھے۔ بڑے آدمیوں کے بڑے پن کے وہ کبھی قائل

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 161 (1,1)

نہیں ہوئے اور کسی سے مرعوب ہونا تو وہ جانتے ہی نہیں تھے۔ افسروں کے بارے میں وہ کہتے تھے کہ یہ دفتر میں تو افسر ہوتے ہی ہیں دفتر کے باہر بھی افسر ہی بنے رہنا چاہتے ہیں۔ دفتر کے ہوٹل تک میں اُن کی کرسیاں مخصوص ہیں۔ بخاری کی کُرسی پر بیٹھنا سوءِ ادب ہے، ادبی مجلسوں میں صدر مقام اُن کے لیے خالی رکھے جاتے ہیں۔ افسر ہر جگہ افسر ہی بنا رہتا ہے۔ آدمی کبھی نہیں بنتا۔

میراجی کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ سُنا ہے کہ لاہور کی دیال سنگھ لائبریری وہ چاٹ چکے تھے۔ دِلّی آ کر اُن کے مطالعے کا شوق غرقِ مئے ناب ہو گیا تھا۔ نثر کی کتابوں میں الف لیلہ کے عاشق تھے۔ اُردو صحیح بولتے تھے اور صحیح لکھتے تھے۔ غلطی کی بچ کبھی نہ کرتے تھے۔ عروض سے خوب واقف تھے اور جملہ اصنافِ شعر پر حاوی۔ ایک دفعہ ایک سٹیشن ڈائریکٹر نے اُن کے کسی مصرعہ پر اعتراض کیا کہ ناموزوں ہے۔ اُسے تو تقطیع کر کے بتا دیا کہ ناموزوں نہیں ہے، باہر نکل کر کئی دن تک اُسے گالیاں دیتے رہے کہ یہ اپنے آپ کو افسر تو سمجھتا ہی ہے شاعر بھی سمجھنے لگا۔ میراجی میں چاپلوسی کی عادت بالکل نہیں تھی۔ اور افسروں کا آگا تاگا لینا بھی وہ سخت معیوب سمجھتے تھے۔ افسروں میں راشد کے بہت گرویدہ اور مداح تھے یا پھر محمود نظامی کے۔ راشد نے میراجی کو بہت نبھایا۔ اُس وقت بھی جب کہ مجھ سمیت سب نے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

شراب کی لت خدا جانے میراجی کو کہاں سے لگی؟ جب لاہور میں اُنھیں تیس روپے ملتے تھے تب بھی وہ پیتے تھے اور جب دِلّی آئے اور پانچ گُنی تنخواہ ملی تو اور زیادہ پینے لگے۔ پہلے رات کو پیتے تھے، پھر دن کو بھی پینے لگے، پھر ہر وقت پینے لگے۔ سوڈا یا پانی ملانے کی ضرورت بھی نہ رہی تھی۔ یونہی بوتل سے منہ لگا کر غٹا غٹ چڑھا جاتے تھے۔ جب ریڈیو سٹیشن پر آتے تو ایک ہاتھ میں کاپیاں اور کتابیں ہوتیں اور دوسرے میں اٹاچی کیس۔ اس میں بوتل رکھی رہتی تھی۔ ذرا دیر ہوئی اور کہیں جا کر پی آئے۔ شراب نے میراجی کو تباہ کر دیا اور اُن میں وہ تمام خرابیاں آتی گئیں جو بالآخر اُن کی اخلاقی موت کا باعث بن گئیں۔ اِدھر تنخواہ ملی اور اُدھر قرض خواہوں اور شراب میں ختم۔ پھر ایک ایک سے اُدھار مانگا جا رہا ہے۔ میراجی کے قدر دانوں نے اُنھیں سنبھالنے کی

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 162 (1,1)

بہت کوشش کی مگر وہ نہیں مانے اور گرتے ہی چلے گئے۔ پھر یہ نوبت آئی کہ قرض ملنا بند ہوگیا۔ اُنھوں نے اپنے مضامین اور نظموں کی کتابیں مرتب کر کے بیچنی شروع کیں۔ اس میں مجھ سے سابقہ پڑا۔ ایک کتاب لے لی، دو لے لیں، گھر پر ہر مہینے یا دوسرے مہینے ایک مجموعہ لے کر پہنچ جاتے۔ میں انکار کرتا اور وہ اصرار۔ میں اُنھیں سمجھاتا کہ میراجی میں آپ کی کتابیں نہیں چھاپ سکتا، میرے پاس بیسیوں مسوّدے خریدے ہوئے رکھے ہیں، ان کے چھپنے کی نوبت بھی نہیں آتی، کاغذ نایاب ہے۔ مگر وہ کچھ ایسے بہانے تراشتے کہ مجھے مجبوراً اُن سے مسودہ خریدنا پڑتا۔ کبھی باپ کی بیماری کی خبر سُناتے، کبھی بھائی کی تعلیم کی مجبوری بیان کرتے، کبھی کہتے والد کی آنکھیں جاتی رہیں، آپریشن ہوگا۔ میں انکار کرتا تو اِتنے ہراساں ہوتے کہ اُن پر ترس آنے لگتا۔ کئی دفعہ اُنھیں یہ بھی سمجھایا کہ میراجی آپ اپنے مسوّدے مجھے سستے دے جاتے ہیں۔ آپ کسی اور کو دیجئے تو روپے زیادہ ملیں گے، مگر اُنھیں ضد تھی کہ نہیں میں کسی اور کو اپنی کتاب نہیں دوں گا۔ میں نے اُن سے ایک ایک کر کے آٹھ مسوّدے لیے جن میں سے صرف تین شائع ہو سکے۔ باقی دِلّی بُرد ہوئے۔ آخری قسط جب اُنھوں نے روپوں کی مجھ سے مانگی تو میں نے پوچھا اب کون سا مسوّدہ باقی رہ گیا ہے۔ کہنے لگے "باتیں"، جو "ساقی" میں لکھ رہا ہوں، یہ بھی کبھی ایک کتاب ہو جائے گی۔" بہت حیل حجت کے بعد میں نے اُنھیں اِس شرط پر روپے دیے کہ آئندہ وہ مجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگیں گے۔ مگر اس کے بعد پھر اُنھیں روپے کی ضرورت ہوئی تو میں نے صاف انکار کر دیا اور اُنھیں کچھ سخت سُست بھی کہا۔ بہت افسردہ اور نادم ہوئے، کہنے لگے "الف لیلہٰ" کا ایک نایاب نسخہ بیس جلدوں میں بِک رہا ہے۔ ایک ناقدرے کا دادا مر گیا ہے کتب خانے کی کتابیں اونے پونے بیچ رہا ہے۔ آپ ایسا کیجیے کہ وہ جلدیں اپنے پاس گروی رکھ لیجیے اور ڈیڑھ سو روپے مجھے دے دیجئے۔ میں آپ کو روپے دے کر کتابیں آئندہ چھڑا لوں گا۔" میں نے کہا: "یک نہ شُد دو شُد" بھائی میں گروی گانٹھا نہیں کرتا، تم تو مجھے معاف ہی کرو کیوں رہی سہی دوستی پر پانی پھیرتے ہو؟ میں تمھارا کتنا بڑا قدر دان ہوں۔ اب مجھے اِس پر تو مجبور نہ کرو کہ مجھے تم سے نفرت ہو جائے۔" یہ بات کچھ

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 163 (1,1)

اُن کی سمجھ میں آ گئی اور وہ خاموش چلے گئے۔ بس اُس کے بعد میراجی نے مجھ سے کچھ نہیں مانگا اور نہ کوئی مسوّدہ لے کر میرے پاس آئے۔ ویسے اُن سے جب تک وہ دِلّی میں رہے برابر ملنا جُلنا ہوتا رہا اور اکثر گھر بھی آجاتے تھے۔

کتابوں کے بارے میں اُن کی ایک خاص مت تھی۔ مثلاً میں نے کہا یہ کتاب تو بہت چھوٹی ہے، اِس کے میں دوسو روپے سے زیادہ نہیں دوں گا، تو وہ کہتے: ''دوسو بالکل ٹھیک رقم ہے، بائیس روپے دو آنے اور دو پائی اور بڑھا دیجئے تاکہ رقم ہموار ہو جائے۔ یعنی دو بائیس روپے، دو آنے، دو پائی'' اِسی طرح اُن کی سب کتابوں کی قیمتیں تجویز کی گئی تھیں۔ ۳/ ۳/ ۳۳۳۔ ۴/ ۴/ ۴۴۴۔ ۵/ ۵/ ۵۵۵ روپے اور ''اجنتے کے غار'' جو اُن کی نظموں کا دوسرا مجموعہ تھا۔ اُس کی قیمت ۶/ ۶/ ۶۶۶ روپے دی گئی تھی۔

میراجی بڑے گندے آدمی تھے۔ وہ اُن میں سے تھے جو کہتے ہیں کہ یا نہلائے دائی یا نہلائیں چار بھائی۔ اُنھیں کبھی کسی نے نہاتے نہیں دیکھا، بلکہ مُنہ دھوتے بھی نہیں دیکھا، بال کٹوانے کے بڑے چور تھے۔ وحشیوں کی طرح ہمیشہ بڑھے رہتے اور اُن میں کبھی تیل نہ ڈالتے اور اُنھیں بناتے۔ جب دِلّی آئے تھے تو مونچھیں بھی مونڈ ڈالی تھیں۔ ایک دفعہ جانے دل میں کیا سمائی کہ چارابرو کا صفایا کر کے گلے میں سادھوؤں کی سی کنٹھی بھی ڈال لی تھی۔ ہمیشہ سنجیدہ صورت بنائے رہتے تھے، اُنھیں قہقہہ مار کر ہنستے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ باتیں اکثر ہنسنے ہنسانے کی کرتے مگر خود کبھی نہ ہنستے تھے۔ بہت خوش ہوئے تو خندۂ دندان نما فرمایا۔ اُن کے نخلے پن سے بڑی گھن آتی تھی۔ مگر یہ اُن گھناؤنی چیزوں میں سے تھے جنھیں اپنے سے دُور نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی قلندرانہ اور حرکتیں مجذوبانہ۔ دو چار آدمیوں نے مل کر ایک کمرہ کہیں باڑے کی طرف لے رکھا تھا مگر رات کو اگر کہیں گھاس میں پڑ رہے تو وہیں سو گئے اور اگر پٹری لیٹ گئے تو وہیں صبح ہو گئی۔ ایک دو دن نہیں برسوں یہی حال رہا۔

شراب کے نشے میں میراجی کو رونے کی دُھن سوار ہو جاتی تھی اور وہ ایسے بے سُدھ ہو

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 164 (1,1)

جاتے کہ تن بدن کا بھی ہوش نہ رہتا۔ ایک دن ہم موری دروازے کے پُل پر سے آرہے تھے۔ جب نہر سعادت خان کے سینما کے آگے پہنچے تو دیکھا کہ ایک مجمع سڑک پر لگ رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک آدمی دھاڑیں مار مار کر رو رہا ہے اور دو ایک اُسے سڑک پر سے اُٹھا رہے ہیں۔ ہم نے سوچا کوئی حادثہ ہوگیا ہے۔ بے چارے کے سخت چوٹ آئی ہے، اسے فوراً ہسپتال بھیجنا چاہیے۔ اِتنے میں اخلاق نے گھبرا کر کہا: ''بھائی شاہد! یہ تو میراجی ہیں!'' اور میراجی سڑک پر پڑے سو رہے تھے اور بڑبڑا بھی رہے تھے۔ مگر زبان قابو میں نہیں تھی کہ بات سمجھ میں آتی۔ ایک صاحب تو اُنھیں اُٹھانے کی کوشش کر رہے تھے وہ بھی جاننے والے ہی تھے۔ ہمیں دیکھ کر اُن کی جان میں جان آئی۔ جھٹ ایک تانگہ منگا کر سب نے اُٹھا کر میراجی کو تانگے میں ڈالا مگر وہ پھسل کر نیچے آرہے۔ دوبارہ اُنھیں آگے کی سیٹ پر ڈالا اور اخلاق کو ساتھ بھیجا کہ ان کے گھر پہنچا کر آئے۔ اگلے دن اخلاق نے بتایا کہ میراجی اپنی امّاں کے لیے رو رہے تھے۔

یہ اخلاق احمد ریڈیو اناؤنسر تھے اور میراجی کے بڑے مداح، میراجی نے اپنی ایک کتاب بھی ان کے نام معنون کی ہے۔ دونوں میں بہت اخلاص تھا۔

ایک دن ان کے چند دوست انھیں گھیر گھار کر ایک نستعلیق طوائف کے کمرے پر لے گئے۔ وہاں کچھ گانا سُنا، کچھ شراب پی اور بہکنے لگے۔ زینے سے اُتر کر سڑک پر آئے تو حالت اور بھی خراب ہوگئی۔ سڑک پر لوٹنا اور چیخیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔ نظموں کا دوسرا ضخیم مجموعہ مسوّدے کی شکل میں ان کے پاس تھا اُسے اِس بُری طرح اُچھالا کہ رات کے اندھیرے میں اُس کا ایک ورق بھی کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ دوستوں نے جو اُن کی یہ حالت دیکھی تو گھبرا گئے۔ لاکھ اُنھیں چمکارا پچکارا مگر وہ اپنے اوسانوں میں نہ آئے۔ اِتنے ہی میں پولیس کے چند آدمی گشت کرتے آگئے۔ دوست بے چارے سب دم بخود ہو گئے کہ اب آوارہ گردی میں سب کے سب بند ہوتے ہیں۔ بھلا رات کے بارہ بجے اس بدنام بازار میں اور اِس حالت میں دیکھ کر کون چھوڑے گا؟ مگر اخلاق احمد کے حواس قائم رہے۔ ہمتِ مردانہ تو اُس کی بھی جواب دے چکی تھی۔ مگر جب پولیس والوں

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 165 (1,1)

نے ٹوکا تو اُس نے جرأتِ رِندانہ سے کام لے کر کہا: ''بے چارے کی ماں مرگئی ہے۔'' یہ کہہ کر میرا جی کو سمجھانے لگا کہ ''ماں باپ سدا کسی کے جیتے نہیں رہتے۔ صبر کرو صبر، چلو اُٹھو، کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔ ارے بھئی تم تو بڑے بودے نکلے۔ بچوں کی طرح رو رہے ہو، لو چلو اُٹھو اور ہاں سنتری جی کوئی تانگہ ملے تو اِدھر بھیج دینا۔'' خدا خدا کر کے آئی بلا ٹلی اور سب کی جان میں جان آئی۔ نظموں کے دوسرے مجموعے کے ساتھ اس مہینے کی تنخواہ کا بقایا بھی میرا جی اسی بازار میں اُچھال آئے۔ چلو۔

جان بچی سو لاکھوں پائے
خیر سے بُدھو گھر کو آئے

صبح اُنھیں کچھ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ رات کو اپنی جان اور دوستوں پر کیا مصیبت توڑ چکے ہیں۔

ایک دن ریڈیو سٹیشن پر میرا جی کو دیکھا کہ جگہ جگہ سے اُن کا منہ سوجا ہوا ہے اور سارے چہرے پر زخم اور نہٹّے لگے ہوئے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا ''میرا جی! کیا کہیں گر پڑے۔'' بولے: ''نہیں، مجھے مارا ہے۔'' ''آپ کو کیوں مارا؟ آپ تو لڑنا جانتے ہی نہیں۔'' کہنے لگے ''مجھے سوتے میں مارا ہے، اُس نے۔'' ''کس نے؟'' ''میرا شبہ ہے ایک آدمی پر'' اور آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ اس بے ہوش آدمی کو کس ملعون نے مارا تھا۔ میرا جی کو زیادہ جاننے والوں میں سے بعض یہ بھی کہتے تھے کہ اس نے خود نشے میں اپنے آپ کو مارا ہے۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب۔

میرا جی پُر اسراریت اور حیرت کے قائل تھے۔ اُن کی شخصیت بھی اُن کی شاعری کی طرح پُر اسرار تھی۔ وضع قطع، لباس اور باتوں سے تو وہ پُر اسرار نظر ہی آتے تھے، وہ حرکتیں بھی کچھ ایسی کرتے تھے کہ لوگ اُنھیں حیرت سے دیکھیں۔ مثلاً ایک زمانے میں مرغی کے انڈے کے برابر لوہے کا گولا ہاتھ میں ہر وقت رکھتے تھے اور کوئی پوچھتا تھا کہ یہ کیا ہے تو کچھ نہ بتاتے تھے۔ پھر ایک کے دو گولے ہو گئے۔ اور یہ خاصہ ڈیڑھ پاؤ کا بوجھ خواہ مخواہ اُٹھائے پھرتے تھے۔ اس کے بعد ان گولوں پر سگریٹ کی پنّی چڑھائی جاتی تھی۔ لکھنؤ میں جب میں نے اُنھیں آخری بار راشد

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 166 (1,1)

صاحب کے ہاں دیکھا تو گولے اُن کے پاس نہیں تھے۔

کھانے میں میٹھا اور نمکین ملا کر کھاتے تھے اور دیکھنے والے چہ میگوئیاں کرتے تھے۔ بعض جو اُنھیں جانتے تھے اُنھیں ''باؤلا'' کہتے تھے۔ منٹو اُنھیں فراڈ کہتا تھا۔

آواز بہت عمدہ اور بھاری پائی تھی۔ ریڈیو پر اکثر ڈراموں میں بولتے تھے۔ پنجاب کے رہنے والے تھے مگر اُن کی زبان یا اُن کا لہجہ چغلی نہیں کھاتا تھا۔ انگریزی کی استعداد اعلیٰ درجے کی تھی مگر جہاں تک ممکن ہوتا بولنے سے گریز کرتے۔ موسیقی سے دلچسپی تھی۔ راگ جے جے ونتی سنتے تو وجد طاری ہو جاتا اور سر پھوڑنے لگتے۔ سمجھتے خاک نہ تھے۔

مذہب سے میراجی کو کوئی واسطہ نہ تھا۔ ہندو صنمیات سے اُنھیں شغف تھا۔ اِسی کا رچا بسا تصوّر اُن کی شاعری میں بھی جھلکتا ہے۔ بس مسلمان اِس لیے تھے کہ ایک مسلمان کے ہاں پیدا ہو گئے تھے۔ جو شخص اخلاقی ضابطوں کی پابندی کرنا بھی ضروری نہ سمجھتا ہو وہ بھلا مذہبی قید و بند کو کیسے گوارا کر لیتا؟ میراجی کے تو دل اور دماغ دونوں ہی کافر تھے۔

میراجی جنسی اعتبار سے ایک گنجلک تھے۔ ابتداءً اُنھیں عورتوں سے رغبت تھی اور یہ کوئی ہندو لڑکی ''میرا'' ہی تھی جس کی ناکام محبت میں اپنا نام اُنھوں نے ''میراجی'' رکھا تھا ورنہ اصلی نام تو اُن کا ثناء اللہ تھا۔ خدا جانے استمنا بالید کا اُنھیں چسکا کہاں سے لگا کہ جیتے جی نہ چھوٹا اور اُنھیں کسی جوگا نہیں رکھا۔ وہ اسے فخریہ بیان کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ''اس کی بدولت میری سب تمنّائیں پوری ہو جاتی ہیں۔ آپ ایک ایک کا مُنہ تکتے ہیں اور دل میں حسرت لیے رہ جاتے ہیں۔ میں کسی کو دیکھتا ہوں تو اُس کا لطف بھی حاصل کر لیتا ہوں۔'' ایک دن اپنے ایک ہم مذاق سے تعارف کرایا تو یہ کہہ کر کہ ''یہ بھی دست کار ہیں۔'' اُن سے جب کہا گیا کہ یہ تو بڑی غلط چیز ہے تو جواب ملا کہ میں سائنٹفک طریقے کا دستکار ہوں۔ اور دست کاری میں اُنھیں اِتنا غلو تھا کہ قیدِ مقام سے بھی گزر چکے تھے۔ اُن کے پتلوں کی بائیں جیب تو بنی ہوئی تھی مگر جیب کا کپڑا غائب تھا۔

میراجی کی سیرت میں بیسیوں خرابیاں آ گئی تھیں لیکن طبعاً وہ ایک شریف انسان تھے،

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 167 (1,1)

دوستوں کے لیے دامے، درمے، ہر طرح کی خدمت کرنے کو تیار رہتے تھے۔ دانش وروں کے ایک خاص طبقے میں ایک صاحب نے ایک مضمون پڑھا جو پوری اُردو شاعری پر حاوی تھا۔ اس مضمون کی بہت تعریف ہوئی اچنبھے کی بات یہ تھی کہ صاحبِ مضمون یوں تو پڑھے لکھے تھے لیکن اُنھیں ادب و شعر کا کوئی خاص ذوق نہیں تھا۔ ہمارا ماتھا وہیں ٹھنکا کہ یہ مضمون ان کا نہیں ہوسکتا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ مضمون میراجی کا لکھا ہوا تھا۔ شروع شروع میں جب اُن کی شراب نہیں بڑھی تھی وہ روپے پیسے سے بھی بعض دوستوں کی مدد کرتے تھے۔ تنخواہ میں سے کچھ پس انداز کر کے اپنے والد اور چھوٹے بھائی کو بھی کچھ بھیجا کرتے تھے اور یہ چھوٹے بھائی وہی صاحب تھے جنھوں نے میراجی کی تمام نظمیں چند پیسوں میں بیچ ڈالی تھی۔ ہُوا یہ تھا کہ اُنھوں نے سارے گھر کی ردّی کسی پھیری والے کے ہاتھ دو تین آنے سیر کے حساب سے بیچی اور اس میں میراجی کی وہ دو ضخیم کاپیاں بھی تول دیں جن میں اُن کی نظمیں لکھی ہوئی تھیں۔ میراجی نے لاہور کے تمام ردّی بیچنے والے چھان ڈالے مگر وہ مجموعے نہ ملنے تھے نہ ملے۔ اس کا اُنھیں بے حد رنج پہنچا، اِتنا کہ اُنھوں نے اپنا گھر اور اپنے عزیزوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ جس گھر میں اُن کے ہُنر کی یہ توقیر ہو وہ وہاں کیسے رہ سکتے تھے اور جن کے ہاتھوں اُن کے حاصلِ عمر کا یہ حشر ہو بھلا وہ اُن سے ملنا کیسے گوارا کر سکتے تھے؟ گھر تو گھر اُنھوں نے لاہور ایسا چھوڑا کہ پھر کبھی اِدھر کا رُخ نہیں کیا۔

میراجی کو میں نے کبھی کسی سے بدزبانی کرتے نہیں دیکھا۔ وہ کسی سے مذاق تک نہیں کرتے تھے۔ اُن کا رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ کیا مجال جو کوئی اُن سے ناشائستہ بات کر لے۔ ادب آداب ہمیشہ ملحوظ رکھتے۔ اُن کی بھونڈی وضع قطع پر بے تکلف دوست پھبتیاں کستے مگر وہ صرف مسکرا کر رہ جاتے اور کبھی اُلٹ کر کوئی سخت جواب نہ دیتے۔ اس سے یہ ہوتا کہ معترض خود شرمندہ ہو جاتا۔

عجیب بات میراجی میں یہ تھی کہ اُن کی جملہ خرابیوں کے باوجود سب اُن کی عزت کرتے تھے۔ اُنھیں دیکھ کر اندر سے دل کہتا تھا کہ یہ ایک عظیم انسان ہے اور عزت و احترام کا مستحق۔ نہ جانے اس شخص میں کیا بات تھی کہ اِتنی نفرت انگیزیوں کے باوجود دل اُس کی طرف کھنچتا

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 168 (1,1)

تھا۔ایسا مقناطیسی شخصیت کاانسان میں نے کوئی اور نہیں دیکھا۔شاید اس کی وجہ یہ ہوکہ اُن کا ظاہر و باطن ایک تھا۔اُنھوں نے کبھی اپنے عیبوں کو نہیں چھپایا اور نہ کبھی اپنی خوبیوں کو سراہا۔ریا کاری اُن میں نام کو نہیں تھی۔اُن کے لیے خلوت اور جلوت دونوں ایک تھے۔اخلاقی قدریں اضافی تو ہوتی ہی ہیں۔اُن کے نزدیک مروجہ اخلاق کی کوئی حیثیت نہیں تھی بلکہ وہ انھیں بُرا سمجھتے تھے اور ان کی تحقیر کرتے تھے۔یا شاید اُنھوں نے انتقاماً ظاہر کو تج دیا تھا اور اُن کا باطن ہی ظاہر بن گیا تھا اور شاید یہی اُن کی عظیم شخصیت کا راز ہو۔

(گنجینۂ گوہر)

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 169 (1,1)

شاہد احمد دہلوی

میراجی

اللہ تعالیٰ اُس کی رُوح کو نہ شرمائے بے حد گندہ آدمی تھا میراجی۔ بہت بُو اُس کے جسم سے اُڑتی رہتی تھی۔ شاید یہ اُن لوگوں میں سے تھا جنھیں یا تو دائی نہلاتی ہے یا چار بھائی۔ مگر اس غلیظ پیکر میں کس قدر لطیف رُوح تھی! رُوح اُسے اُڑا کر اَعلیٰ عِلِّیِیْن میں پہنچانا چاہتی تھی مگر جسم اُسے اَسْفَلَ السَّافِلِیْن کی طرف کھینچے لیے جاتا تھا۔ میراجی کی ترکیب اِسی اجتماعِ ضدّین سے ہوئی تھی۔

جب میں نے اُنھیں کوئی تیس سال اُدھر "ادبی دُنیا" لاہور کے دفتر میں پہلی دفعہ دیکھا تو معاً مجھے یہ خیال ہوا کہ یہ شخص پاگل ہے۔ گرمی ایسی پڑ رہی تھی چیل انڈا چھوڑے اور میراجی تھے کہ اوورکوٹ پہنے آرام سے اپنی کُرسی پر "اُردو" میں بیٹھے ہوئے تھے، جیسے فرش پر ڈیڑھ زانو بیٹھے ہیں۔ سر پر ٹپّو کی کھرل نما ٹوپی دھری تھی۔ اس کے نیچے بے ترتیب گھنے کالے بال تھے جو بڑھ کر کاکلیں بن گئے تھے۔ سر کو جُنبش دیتے تو شانوں پر کالے ناگ لہرانے لگتے۔ رنگ گیہواں تھا۔ کُھلی پیشانی، روشن آنکھیں جن میں ربودگی گھلتی رہتی تھی، کتارا سی ناک، ترشی ہوئی مونچھیں، پتلے پتلے ہونٹ، داڑھی گھٹی ہوئی مگر کئی دن کی باسی۔ ایک ایک دو دو لفظ بولتے تھے وہ بھی کھرج میں۔

"مولانا صلاح الدّین احمد ہیں؟"

"نہیں ہیں۔"

"کہاں گئے ہیں؟"

"معلوم نہیں۔"

"میراجی ہیں؟"

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 170 (1,1)

''جی فرمائیے!''

''آپ ہی ہیں؟''

''جی ہاں۔''

اس کے بعد اُنھوں نے سوال کیا: ''آپ شاہد احمد دہلوی ہیں۔''

''جی ہاں۔''

''تشریف رکھیے۔''

''آپ نے کیسے پہچانا؟''

''تصویر دیکھی تھی،''

معلوم ہوتا تھا بات کرنی نہیں چاہتے، الفاظ اُگل رہے ہیں۔ اِس عجیب وغریب شخص کو دیکھنے کے بعد اس کے حالات معلوم کرنے کا شوق ہوا۔ بعض گندی چیزوں میں بھی کشش ہوتی ہے۔ میراجی میں بھی وہی کشش تھی جو بعض مزبلاں میں ہوتی ہے۔

میراجی کے والد برج انسپکٹر تھے غریباً سوَ گزر کرتے تھے۔ نہایت پابند شرع اور پانچوں وقت کے نمازی تھے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنی زندگی انجمن حمایتِ اسلام کی خدمت کرنے میں گزار دی۔ اُن کے تین لڑکے تھے۔

ثناءاللہ۔ثانی

انعام اللہ۔نامی

اور اکرام اللہ۔کامی

ماں باپ نے اپنی حیثیت کے مطابق پالا پوسا مگر ان میں سے ایک نے بھی اسکول کی چند جماعتوں سے آگے پڑھ کر نہیں دیا۔ تینوں لڑکوں میں بڑے ثناءاللہ ثانی تھے جو آگے چل کر ''میراجی'' کے نام سے مشہور ہوئے۔ اولیاء کے گھر کیا بھوت پیدا نہیں ہوتے؟

مزنگ کی طرف میراجی کا گھر تھا۔ اسکول سے طبیعت اُچاٹ ہو جانے کے بعد اُنھوں

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 171 (1,1)

نے چاہا تو یہ تھا کہ کہیں سے مفت کی بہت سی دولت ہاتھ لگ جائے مگر کوڑی بھی نہیں ملی۔ پیسے والوں کو دیکھ کر کلستے تھے۔ اُن کا تو کچھ بگاڑ نہ سکے ہاں اپنی سیرت بگڑتی چلی گئی۔ عنفوانِ شباب میں ایک بہت بُری عادت نے جڑ پکڑلی جس نے ان کی ساری زندگی کو نفسیاتی اُلجھنوں کا ڈھیر بنا دیا۔ اُن کا جسم اُنھیں نیچے کی طرف کھینچ رہا تھا اور رُوح اُوپر کی طرف۔ لہٰذا وہ اپنے جسم کو اپنی بُری عادت سے تسکین پہنچاتے رہے، اور رُوح کے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے کتابیں پڑھنے لگے۔ مگر کتابیں جو اُنھوں نے اپنے مطالعہ کے لیے انتخاب کیں اُن میں ہندو صنمیات کو فوقیت دی۔ اس کے بعد فرائڈ اور ہیوی لاک ایلس کی CASE HISTORIES کو مزے لے لے کر پڑھا۔ ان سے فارغ ہونے کے بعد دُنیا کے بڑے شاعروں کا کلام دیکھا، اُن کی سوانح عمریاں پڑھیں۔ ایڈگر ایلن پو اور بودلیئر اُن پر چھا گئے اور میراجی نے اپنی زندگی کو اُن کے قالبوں میں ڈھالنے کی کوشش کی مگر ادھ کچرے رہے، اور نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے۔ کوّا چلا ہنس کی چال، اپنی بھی بُھولا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ یہ سب کے سب میراجی کی شاعری پر چھا گئے۔ چنانچہ ان کی ابتدائی شاعری کو منظوم CASE HISTORIES ہی کہا جاسکتا ہے۔ جنسی بے راہ روی کی مثالوں نے میراجی کی شخصیت میں راہ پالی اور وہ خود ایک نفسیاتی نمونہ، ایک CASE بن گئے۔

اسی زمانے میں اُنھیں شراب کی لت لگی۔ وہ بہت کچھ کرنا چاہتے تھے مگر کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔ گُھٹتے رہے اور غم بھلانے کے لیے شراب پیتے رہے۔ اچھی شراب بھی کہاں نصیب ہوتی تھی؟ ٹھرّا یا بیئر۔ اس سے دماغ بھڑک اُٹھتا تو عجیب وغریب حرکتیں کرتے۔ انھی کے پڑوس میں ایک پڑھے لکھے ثقہ شاعر بھی رہتے تھے مگر یہ صاحب اس قدر بے نیاز قسم کے آدمی تھے کہ محلّے کے کسی شخص سے واقف نہیں تھے۔ صبح اپنی نوکری پر چلے جاتے اور رات کو کسی وقت آ کر پڑ رہتے۔ جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتا۔ چھڑا دم، تندور بازی اللہ راضی۔ کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ گھر آ کر کسی کتاب میں غرق ہو جاتے۔ پڑھتے پڑھتے سو جاتے اور صبح اُٹھ کر پھر گھر سے نکل جاتے۔ چھ سال اُنھیں میراجی کے پڑوس میں رہتے ہو گئے اور بیسیوں دفعہ میراجی کو دیکھا بھی مگر یہ نہ جانا کہ

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 172 (1,1)

یہی وہ میراجی ہیں جو رسالوں میں چھپا کرتے ہیں اور اُس پرچہ کے مدیر بھی ہیں جس میں خود میرا کلام شائع ہوتا ہے۔

اور ایک دن یہ ہوا کہ رات ڈھلے میراجی جھومتے جھامتے آئے اور اُن کے گھر کے سامنے والے مکان کا دروازہ اُنھوں نے پیٹ ڈالا۔ اور نہایت بے تکلّفی سے اُس ثقہ کنوارے کے گھر میں در آئے اور اندر سے کُنڈی لگالی۔

بچارے نے گھبرا کر پوچھا ''آپ؟''

جواب ملا: ''جی میرا نام میراجی ہے۔''

''فرمائیے اِس وقت کیسے آنا ہوا؟''

''میں آج بیئر کی اٹھارہ بوتلیں پی کر آیا ہوں''

یہ کہہ کر فرش پر اٹھارہ کی اٹھارہ بوتلیں اُگل دیں۔

''آپ ہی نے سامنے والے گھر کا دروازہ پیٹا تھا؟''

''ہاں۔''

''کیوں؟''

''اس میں ایک بڑی چبڑ عورت رہتی ہے۔''

اِتنے میں سارے محلے کو اُس عورت نے چیخ چیخ کر سر پر اُٹھالیا۔ محلّے والے گھبرا کر گلی میں نکل آئے۔ ''کون تھا کون تھا؟'' کون بتاتا کہ کون تھا۔

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت

اِس عجوبہ پہلی ملاقات کے بعد ثقہ کنوارے اور میراجی میں دوستی کا رشتہ قائم ہوگیا۔ اس مضمون کے بیشتر واقعات کے راوی میراجی کے یہی دوست ہیں۔

میراجی کے جسم میں عقل اور دل کی لڑائی ہوتی رہتی تھی۔ میراجی کے من میں یہ سما گئی تھی کہ عقل سے کام لینے میں ہمیشہ نقصان ہوتا ہے، لہٰذا وہ شراب پی پی کر عقل کو کُند کیا کرتے

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 173 (1,1)

تھے۔ میراجی دل کو وہی درجہ دیتے تھے جو علامہ اقبال عشق کو دیتے تھے:

بے خطر کُود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

مگر اُن کی بُری عادت نے اُن کا دل بھی داہی کر دیا تھا اور میراجی کچھ عجیب ہی سی چیز بن کر رہ گئے تھے۔ مزاج میں شاہی اور رُوح میں درویشی تھی۔ نام نہاد اُونچے درجے کے لوگوں کی سرپرستی قبول نہیں کر سکتے تھے۔ ان بڑوں کو وہ بہت چھوٹا سمجھتے تھے اور چھوٹوں کے لیے اُن کی جان بھی حاضر تھی۔ احمد شاہ بخاری پطرسؔ نے اُنھیں آل انڈیا ریڈیو میں تھپکنا چاہا تھا تو میراجی MY FOOT کہہ کر وہاں سے چلے آئے تھے۔ میراجی نے اپنے اُوپر تنگی تُرشی کر کے پانچ سو روپے جمع کیے تھے۔ جمع اِس لیے کیے تھے کہ اپنی ماں کو بھیجیں۔ مگر ایک تانگے والے کو دے دیے کیونکہ اُس اپنی شادی کے لیے روپے کی ضرورت تھی۔ میراجی روپے پیسے کے معاملے میں بہت غیر محتاط تھے۔ روپے پیسے کو اُنھوں نے کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ جب اُن کے پاس روپیہ ہوتا تو دونوں ہاتھوں سے لُٹا دیتے اور کوڑی کفن کو نہ لگا رکھتے۔ ایک دفعہ اُن کے ایک دمساز نے اُنھیں بہت رات گئے ایک اندھیرے بازار میں بے ہوش دیکھا تو تانگے والے کی مدد سے اُنھیں اُٹھا کر تانگے میں ڈالا اور اُن کے گھر اُنھیں پہنچایا۔ میراجی کی جیب میں چار سو روپے تھے۔ اُنھوں نے نکال کر اپنے پاس رکھ لیے۔ میراجی کو ہوش آنے کے بعد بھی روپے کا خیال نہیں آیا۔ بہت دِنوں کے بعد اُن صاحب نے اُن کے روپے اُنھیں واپس دیے تو اُنھیں یاد بھی نہیں تھا کہ کبھی اُن کی جیب میں چار سو روپے بھی تھے۔

میراجی کو طرح طرح کے غم رہتے تھے۔ جب وہ ''ادبی دُنیا'' میں نائب مدیر تھے تو اُنھیں تنخواہ تیس روپے ملتی تھی۔ اسی میں شراب بھی پیتے تھے اور اپنے چھوٹے موٹے خرچ بھی پورے کرتے۔ ماں باپ اور بھائیوں کے ساتھ رہتے تھے۔ اِس تنگ دستی سے افسردہ رہتے تھے۔ آدمی حساس تھے۔ بھائیوں کی تعلیم کے لیے بے قرار رہتے تھے مگر اُن کے لیے کوئی وسیلہ نہ

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 174 (1,1)

نکال سکتے تھے۔اپنی ماں پر اُنھیں بڑا ترس آتا تھا۔اُن کی ماں اُن کے باپ کی دوسری بیوی تھیں۔عمروں میں تفاوت کچھ زیادہ ہی تھی۔میرا جی سمجھتے تھے کہ ماں کی جوانی بوڑھے باپ کے ساتھ اکارت گئی۔ باپ کو وہ ظالم اور ماں کو مظلوم سمجھتے تھے۔مگر باپ کے ساتھ کوئی گستاخی اُنھوں نے کبھی نہیں کی۔،بلکہ باپ سے اُنھیں محبت ہی تھی،جبھی تو اُنھیں جب پُونے میں اپنے اندھے باپ کے مرنے کی اطلاع ملی تو اُنھوں نے مسجد میں جا کر منبر کے پاس پیشاب کیا اور کہا''تو نے میرے باپ کو مار دیا،اِس لیے میں تیرے گھر میں پیشاب کرتا ہوں۔''

شراب لاہور ہی میں بہت بڑھ گئی تھی۔بعض دفعہ تو تل ہی سے مُنہ لگا کر پی جاتے تھے۔اس اُم الخبائث نے اُن کے اخلاق کو بڑی حد تک تباہ کر دیا تھا۔مدہوش ہونے کے بعد وہ لاہور کے گلی کوچوں میں بھیک مانگتے اور کھٹے سنترے کھاتے۔دِلّی میں راتوں کو اکثر وہ بے ہوش پڑے پائے گئے۔اور کبھی کبھی یہ بھی ہوتا کہ پینے کے بعد اُنھیں رونا لگ جاتا اور دھاڑیں مار کر رونے لگتے۔راہ گیروں کے ٹھٹھ لگ جاتے تو اُن کے ساتھی کوئی بات بنا کر دفع شر کرتے۔ ایک دفعہ ایک کو کہنا پڑا کے بچارے کی ماں مر گئی ہے۔ایک دفعہ نئی چاوڑی میں اُنھوں نے رونا شروع کیا اور نظموں کے مجموعے کا پورا مسوّدہ اچھال دیا۔ساری سڑک پر اُس کے ورق پھیل گئے۔اُن کے دوست اُنھیں چُنتے پھرے، کچھ ہواؤں میں اُڑ گئے۔مگر شاباش ہے ان کے دوستوں کو اُن کی ہر کڑوی کسیلی جھیل جاتے،بلکہ اُن سے خوب اچھی طرح پٹ بھی لیتے۔کیونکہ میرا جی مدہوشی کے عالم میں''آملیٹ'' بنایا کرتے تھے۔پٹنے کو وہ''آملیٹ بنانا'' کہا کرتے تھے۔

ایک رات کو آملیٹ بنانے کے سلسلے میں خود اُن کا آملیٹ بن گیا۔ہوا یہ کہ ایک ہم پیالہ سے اُنھوں نے وقتاً فوقتاً قرض لے کر بہت بڑھا لیا۔جب اُس نے تقاضا کیا تو اُنھوں نے اس کا آملیٹ بنانا چاہا۔وہ ہوش میں تھا،یہ مدہوش تھے۔یہ واقعہ آل انڈیا ریڈیو کے ایک اسٹوڈیو کا ہے۔رات کو میرا جی پی پلا کر اسٹوڈیو ہی میں سو گئے تھے اُن کے قرض خواہ نے اُنھیں بے قابو دیکھ کر اُن کی خوب کندی کی۔بدبخت نے مُنہ ہی مُنہ پر مارا تھا۔سارہ مُنہ نیلا کانچ ہو گیا تھا اور جا

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 175 (1,1)

بجا کھر یچیں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے جب انھیں صبح دیکھا تو پوچھا ''یہ کیا ہوا؟'' اُنھوں نے بتایا کہ ''مجھے کسی نے مارا ہے۔'' کیوں مارا، کس نے مارا؟ یہ نہیں معلوم۔ اُن کے نہ پینے والے دوستوں نے بتایا کہ میراجی نے خود اپنے آپ کو مارا ہے۔ یہ بھی ایک نفسیاتی بیماری معلوم ہوتی ہے۔ مگر اصل واقعہ یہی تھا کہ اُن کے قرض خواہ دوست نے اُنھیں بے دردی سے مارا تھا۔ مگر میراجی اُس کا نام اِس لیے نہیں بتاتے تھے کہ ساری بات کُھل جاتی اور یہ بھی بتانا پڑتا کہ اسٹوڈیو میں سو رہے تھے کہ یہ سانحہ پیش آیا۔ اسٹوڈیو میں سونا جُرم تھا اور اس کی پاداش میں نوکری جاتی رہتی۔

میراجی کا پورا نام محمد ثناء اللہ ڈار تھا، مگر ایک بنگالی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو کر اُنھوں نے میرا سین کے نام پر اپنا نام میراجی رکھ لیا تھا۔ میراجی کے ایک ہم جماعت کا مکان کنارڈ کالج لاہور سے ملا ہوا تھا۔ صرف ایک دیوار بیچ میں تھی۔ میراجی اور اُن کے چند اور ہم جماعت اس گھر میں جمع ہوتے، پیتے پلاتے اور دیوار میں ایک سوراخ کر کے اُس میں سے کالج کی لڑکیوں کو تکا کرتے۔ اُنھیں لڑکیوں میں میرا سین بھی تھی۔ جس پر میراجی لٹو ہو گئے۔ اکثر یہ بھی کرتے کہ جب وہ لڑکی کالج سے اپنے گھر جاتی تو میراجی کچھ فاصلے سے اُس کے پیچھے لگے رہتے۔ یہاں تک کہ اُسے گھر تک پہنچا دیتے۔ جب تک وہ لڑکی لاہور میں رہی ان کا یہی معمول رہا۔ صرف ایک دفعہ بڑی ہمت کر کے اُنھوں نے اُس سے کہا: ''مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔'' اُس نے پلٹ کر اُن کی طرف دیکھا مگر مُنہ سے کچھ نہیں کہا۔ نہ خوش ہوئی نہ ناراض۔ خاموش اپنے گھر چلی گئی۔ بس یہ تھا میراجی کا پہلا اور آخری عشق۔

میراجی کے پاس میرا سین کی ایک تصویر خدا جانے کہاں سے آ گئی تھی۔ اسے وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ جب اُنھیں میرا سین کی یاد بہت ستاتی تو اس تصویر کو سامنے رکھ کر دیکھتے رہتے، پھر فرش پر زور زور سے اپنا سر پٹختے، یہاں تک کہ بے حال ہو جاتے۔

اِس افلاطونی عشق کے بعد میراجی نے اپنی ساری عمر میں پہلا اور آخری جنسی معاملہ

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 176 (1,1)

کیا۔ لاہور کی ہیرا منڈی میں کسی کے یہاں پہنچ گئے۔ اُس نے اُنھیں اپنی یاد دِلانے کے لیے آتشک کا تحفہ دیا۔ یہ تحفہ میراجی کے پاس آخری دم تک رہا۔ میراجی ہومیوپیتھی بھی جانتے تھے۔ اپنا علاج خود کرتے رہتے تھے اور دوائیں کھاتے رہتے تھے۔ اس واقعے کی یادگار اُن کی ایک نظم ''۱۴ مئی ۱۹۳۲ء کی رات'' ہے جو کچھ اِس طرح شروع ہوتی ہے:

جو دھن تھا پاس وہ دور ہوا
مٹی میں مِلا ، کچھ بھی نہ رہا

اور یہ واقعہ بھی ہے کہ اِس سانحے کے بعد میراجی جنسی لحاظ سے کھکھ ہو گئے تھے۔ اور اُن کی لاشعوری اُلجھنیں اور بھی زیادہ ہو گئی تھیں۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں جب جاپان کی جیت ہونے لگی تو آل انڈیا ریڈیو اسٹاف میں معتدبہ اضافہ کیا گیا۔ پطرسؔ ڈائریکٹر جنرل تھے۔ اُنھوں نے لاہور سے تقریباً سارے ہی ادیب دِلّی ریڈیو میں بلا لیے تھے۔ چراغ حسن حسرت، سعادت حسن منٹو، اوپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی اور افضل اقبال، ن۔ م راشد، محمود نظامی اور انصار ناصری پہلے ہی سے سروس میں موجود تھے۔ بعد میں اختر حسین رائے پوری بھی شامل ہو گئے تھے۔ سالک صاحب نہیں آئے تھے۔ وہ لاہور ہی سے خبروں پر پانچ منٹ کا تبصرہ نشر کرنے لگے تھے۔ تاثیر اور فیض کسی فوجی محکمے میں ملازم ہو کر دلّی آ گئے تھے۔ یوں لاہور کی ساری رونق دِلّی میں سمٹ آئی تھی۔ محمود نظامی نے کچھ دِنوں بعد ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر میراجی کو بلوا لیا تھا۔ مگر میراجی اب دیکھنے میں وہ میراجی نہیں تھے۔ وہ کاکلیں جنھیں میراسین کے بالوں کی یاد میں اُنھوں نے پرورش کیا تھا اب کٹ چکی تھیں۔ ان کاکلوں کے پیچھے اُنھوں نے دوستوں کی پھبتیوں کو ہنس ہنس کر گوارہ کیا تھا۔ محلّے کے بچے جنھیں دیکھ کر ''بُڈھی میم، بُڈھی میم'' کی رٹ لگایا کرتے تھے اور میراجی مسکرا مسکرا کر اپنی مُٹھی میں کاکلوں کو لے کر بچوں کو دکھایا کرتے تھے اب ایسی غائب ہوئی تھیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اُن کی جگہ انگریزی بالوں نے لے لی تھی۔ لنڈا بازار کے اوورکوٹ کے بدلے اب وہ اچھا

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 177 (1,1)

خاصا سُوٹ پہنے ہوئے تھے۔ مونچھیں بھی کسی قدر کم ہوگئی تھیں اور میراجی خاصے معقول مرد دِکھائی دینے لگے تھے۔

دِلّی میں کئی سال تک میراجی سے میرا ربط رہا۔ اُنھیں بہت قریب سے دیکھا مگر میں اُن سے دُور ہی رہا۔ اُن کے معمولات کی پذیرائی میرے لیے ناممکن تھی اُنھیں ہم مشرب احباب کا ساتھ دِلّی میں مل گیا تھا جو روزانہ بعد مغرب سستی شراب پیتے اور اکثر نئی چاوڑی کے چکر کاٹا کرتے۔ دن کے وقت میراجی بھلے آدمی بنے رہتے تھے۔ معقول گفتگو کرتے تھے مگر مختصر۔ کبھی کسی کی بُرائی اُن سے نہیں سُنی۔ تعریف بھی نہیں سُنی۔ جتنی سنجیدہ نظم لکھتے تھے اُتنی ہی صاف نثر لکھتے تھے۔ ''ادبی دُنیا'' میں اُنھوں نے دُنیا کے بعض بڑے شاعروں پر اچھے تنقیدی مضامین لکھے تھے۔ دِلّی آجانے کے کچھ عرصہ بعد ''ساقی'' میں مستقلاً علمی اور ادبی باتیں لکھنے لگے تھے۔ آخر آخر میں من جملہ اپنی شاعری کے مجموعوں کے اُنھیں مضامین کا ایک منتخب مجموعہ ''بازگشت کے نام سے مرتّب کر کے دیا تھا جو ساقی بُک ڈِپو کے دوسرے مسوّدات کے ساتھ دِلّی بُرد ہوگیا۔

میراجی بھی خواجہ حسن نظامی کی طرح اِس بات کے قائل تھے کہ جب تک کوئی مخصوص وضع اختیار نہ کی جائے یا کوئی نرالی دھج نہ بنائی جائے لوگ کسی کی طرف توجّہ نہیں کرتے، بلکہ آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ لاہور کا لبادہ اور کاکلوں کا وبال اب اُتر چکا تھا اور میراجی عام آدمیوں کا لباس پہننے لگے تھے، لہٰذا لوگوں نے اُنھیں دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ لاہور میں جب محلّے کے بچّے اُنھیں دیکھ کر ''بُڈھی میم'' کے نعرے نہ لگاتے تو میراجی رُک کر اپنے بال مُٹھی میں پکڑ کر دُور سے بچّوں کو دِکھاتے اور اِشارے سے اُنھیں بلاتے اور بچّے جمع ہو کر ''بُڈھی میم، بُڈھی میم'' کے نعرے لگانے لگتے۔ یہ میراجی کی کمزوری تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ لوگ اُنھیں دیکھیں۔ دِلّی آئے تو:

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

یہ کسم پُرسی اُنھیں بھلا کیسے گوارا ہوتی؟ لہٰذا اُنھوں نے نیبو کے برابر ایک لوہے کا گولہ ہاتھ میں رکھنا شروع کر دیا۔ لوگ اوبدا کر پوچھتے کہ یہ کیا ہے تو میراجی مسکرا کر رہ جاتے۔ جب نمود

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 178 (1,1)

کی ہُڑک اور بڑھی تو ایک کے بدلے دو گولے ہاتھ میں رکھنے لگے۔ پھر ان گولوں پر سگریٹ کی پنّی بھی چڑھانے لگے تھے۔ اِس کے علاوہ اُن کی جیب میں ایک سادھوؤں کی مالا اور ایک سنکھ بھی پڑا رہتا تھا۔ کبھی کبھی اُن کی نمائش بھی کیا کرتے تھے۔ منٹو میراجی کی ان چیزوں کو ''فراڈ'' کہا کرتا تھا۔

نمود حاصل کرنے کے لیے میراجی یہ بھی کرتے تھے کہ کُرسی پر جوتوں سمیت اُکڑوں بیٹھ جاتے تھے۔ دعوتوں میں سالن میں زردہ یا کھیر ملا لیا کرتے۔ یہ تماشا تو چند بار میرے گھر پر ہوا احباب نے اس کی خوب ہنسی اُڑائی۔ مگر میراجی ناراض ہونے کے بدلے خوش ہوتے تھے اور مسکراتے تھے۔ اور ایک دفعہ میراجی محمود نظامی کے ساتھ فلم کمپنیوں کے سلسلے میں بمبئی گئے تو اُس زمانے کی مشہور فلم اسٹار دیویکا رانی نے اُن دونوں کو کھانے پر بلایا۔ میراجی نے وہاں بھی حسبِ عادت یہی STUNT دِکھایا۔ جوتوں سمیت کرسی پر اُکڑوں بیٹھے اور سلُونا اور میٹھا ملا کر کھانے لگے۔ دیویکا رانی بگڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور مُنہ پُھلا کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ محمود نظامی نے میراجی سے کہا ''آپ نے یہاں بھی وہی حرکت کی؟'' میراجی نے کہا ''جی ہاں میں اپنا کشمیری ہونا نہیں بھول سکتا۔'' دیویکا رانی پھر واپس نہیں آئی۔

بہت بے آبرو ہو کر ترے کُوچے سے ہم نکلے

۱۹۴۴ء کے بعد میراجی کی وضع قطع اور معمولات میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی لیکن ان کی شاعری میں سے جنسی گندگی کا عنصر نکل گیا تھا اور اس کی جگہ ایک طرح کی رُوحانی پاکیزگی آ چلی تھی۔ اُن کے کلام کی گنجلک اشاریت بھی ختم ہو گئی تھی اور شعر بہت صاف کہنے لگے تھے۔ اُنھوں نے ''میرا جی کی نظمیں'' کے بعد اپنی نئی نظموں کا ایک ضخیم مجموعہ مرتب کر کے مجھے دیا تھا۔ اُس کی کتابت بھی ہو چکی تھی کہ دِلّی میں ہنگامہ ہو گیا اور مجموعہ نہ چھپ سکا۔ اُس زمانے کی شاعری کا انداز کچھ ایسا تھا:

گرتے پربت کو کوئی روکے تو شاید روکے
بہتے دریا کو کوئی روکے تو شاید روکے
گرتے آنسو کو کوئی روک نہیں سکتا

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 179 (1,1)

آل انڈیا ریڈیو چھوڑنے کے بعد میراجی بمبئی چلے گئے تھے۔ وہاں اُن کا اِرادہ فلم کمپنیوں میں کام کرنے کا تھا۔ اُن سے پہلے منٹو، اشک، کرشن چندر، اختر الایمان، مہندر ناتھ، بہزاد لکھنوی، راجہ مہدی علی خاں اور ریڈیو کے کئی کام کرنے والے بھی بمبئی جا چکے تھے۔ بمبئی جانے کے بعد میراجی کی شراب اور بڑھ گئی تھی اور وہ اکثر بے کار اور بیمار رہنے لگے۔ اس بُرے وقت میں مہندر ناتھ اور اختر الایمان نے اُن کا بہت ساتھ دیا۔ میراجی شراب کے لیے ایک ایک سے قرض مانگتے پھرتے تھے۔ مگر قرض لینے میں بھی اپنی یہ ادا بنا رکھی تھی کہ دس روپے سے زیادہ کسی سے طلب نہیں کرتے تھے۔ اگر کہیں سے روپے کما لیتے تو قرض ادا کر دیتے ورنہ صاف کہہ دیتے کہ میرے پاس دینے کو نہیں ہے۔ پیسہ اُن کے پاس نہیں رہتا تھا۔ اُن کے ایک قدر دان دوست جو اُنھی کے ساتھ دِلّی میں رہتے تھے مگر اُن کے معمولات میں شریک نہیں ہوتے تھے، اپنی پوری تنخواہ لا کر ان کے ہاتھ میں دے دیا کرتے تھے۔ میراجی نے اُن سے کہہ دیا کہ میں تمھاری شادی کے لیے روپیہ تمھاری تنخواہ میں سے جمع کرتا رہوں گا۔ میراجی کی رگ رگ سے واقف ہونے کے باوجود اُن صاحب نے میراجی پر بھروسہ کیا۔ اتنا نہ سمجھے کہ عاشق کے دل میں صبر اور چھلنی میں پانی بھلا کب ٹھہرتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ جب اُن کی شادی کا وقت آیا تو میراجی نے ٹکا سا جواب دے دیا کہ میرے پاس نہیں ہے۔ شادی ملتوی نہیں ہو سکتی تھی، لہٰذا اُس غریب نے قرض دام کر کے شادی کی اور لفا جفا کر کے قرض اُتارتا رہا۔ مگر دوست ہو تو ایسا ہو کہ اتنا بڑا زخم کھایا اور آنکھ پر میل تک نہ آیا۔

مرنے سے چھ مہینے پہلے میراجی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ موت قریب آ چکی ہے۔ ہوا یہ کہ ایک معقول جگہ نہایت قیمتی قالین پر اُن کا پیشاب نکل گیا۔ اس کی اِس قدر شرمندگی ہوئی کہ اُسی وقت شراب ترک کرنے کا عہد کر لیا۔ لوہے کے گولے کھڑکی میں سے باہر پھینک دیے اور سمجھنے لگے میں پاگل ہو رہا ہوں۔ اور یہ پاگل پن ہی تھا کہ اُنھوں نے یک لخت شراب چھوڑ دی اس سے اُن کی حالت اور زیادہ خراب ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے کہا ''تم شراب کم کرتے چلے جاؤ، ایک دم مت چھوڑو۔'' مگر میراجی نے اُن کا مشورہ نہیں مانا۔ شراب کو سچ مچ اپنے اُوپر حرام کر لیا۔ قلب کی حرکت میں فرق آ گیا۔ جگر اور معدے نے جواب دے دیا۔ پانی تک نہ پچتا تھا۔ اختر الایمان نے

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 180 (1,1)

اُنھیں سرکاری ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ مگر میراجی کا مرض لاعلاج ہو چکا تھا۔ سانس پورے کرتے رہے اور ہسپتال میں دم دے دیا۔

پچھلے دِنوں میں پنڈی گیا تھا تو میراجی کے عزیز دوست یوسف ظفر نے ایک عجیب واقعہ سُنایا۔ وہ اس سال حج کو گئے تھے۔ فرماتے تھے کہ مَیں مدینہ منوّرہ حضورؐ کی جالیوں سے کچھ فاصلہ پر بیٹھا مراقبے میں غرق تھا اور جو جو مجھے یاد آتا رہا میں اُس کے لیے دُعا کرتا رہا، یہاں تک کہ کوئی نام باقی نہ رہا۔ مجھ پر عجیب سرور کا عالم طاری تھا۔ قلب گداز ہو گیا تھا اور آنکھوں سے آنسو کی لڑیاں بندھی ہوئی تھیں کہ یکا یک میراجی میرے سامنے آ کھڑے ہوئے اور بولے ''مجھے بھول گئے، میرے لیے تم نے دُعا نہیں کی!'' مَیں نے اُسی وقت میراجی کے لیے بھی دُعا کی۔ وہ سامنے کھڑے رہے۔ دعا ختم کر کے جو دیکھتا ہوں تو نہ میراجی ہیں نہ کوئی اور۔ بس میں تھا اور میرے سامنے حضورؐ کی جالیاں تھیں۔ مَیں بہت حیران ہوا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ اِس قدر گندہ اور ناپاک شخص بھلا ایسی پاکیزہ اور مقدّس جگہ کیسے آ گیا؟ دِنوں میں اِس واقعے پر غور کرتا رہا۔ پھر ایک دم سے ایک دن میراجی سے اپنی پہلی ملاقات یاد آ گئی۔ یہ اُس رات کا واقعہ ہے جب وہ بیئر کی اٹھارہ بوتلیں پی کر میرے گھر میں آدھی رات کو دِرّانہ چلے آئے تھے اور اٹھارہ کی اٹھارہ بیئر کی بوتلیں اُنھوں نے میرے کمرے کے فرش پر اُگل دی تھیں۔ میں نے اُن سے ان کا نام پوچھا تھا تو اُنھوں نے اپنا نام میراجی بتایا تھا اور جب میں نے اُن سے اُن کا اصلی نام دریافت کیا تو اُنھوں نے اپنی تیوری پر بل ڈال کر کہا تھا: ''میرا اصلی نام محمد ثناء اللہ ڈار ہے۔ اس نام میں ''محمد'' کا لفظ آتا ہے۔ کسی کو حق نہیں ہے کہ اپنے گندے مُنہ سے اِس پاک لفظ کو ادا کرے۔'' کڑی سے کڑی مل گئی تھی اور میری چٹیک دُور ہو گئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ محمد ﷺ کے اِس والہانہ احترام کے صلے میں میراجی کی بخشش ہو گئی ہو گی اور حضورؐ کی اِس بے اندازہ محبت کے طفیل میرا جی کے سارے گناہ معاف ہو گئے ہوں گے۔''

اِتنا کہہ کر میراجی کے یہ پُرانے دوست آبدیدہ ہو گئے اور میں نے کہا:

خاکسارانِ جہاں را بہ حقارت منگر تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

D 1/11/2025 3:00 PM PAGE 181 (1,1)

شوکت تھانوی

میں میراجی کو نہیں جانتا

واقعی میں میراجی کو بالکل نہیں جانتا۔ اور جانتا بھی کیسے۔ وہ زندگی بھر بھوت بن کر جیئے اور مرنے کے بعد زندہ ہو رہے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ اُن کے انتقال کے بعد مجھ کو اُن کی خدمت میں کچھ کچھ نیاز حاصل ہو رہا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اور عافیت بھی اِسی میں ہے کہ ایسے لوگوں سے مرنے کے بعد ملا جائے ورنہ وہ تو ملنے والے کے لیے مستقل عذاب بن سکتے ہیں۔ میں اب میراجی کے متعلق جتنا پڑھتا آیا ہوں اتنا ہی اپنے کو خوش قسمت سمجھتا جاتا ہوں کہ میں اُن سے نہیں ملا۔ ورنہ ایک ایسے شخص سے کیونکر نباہ کر سکتا تھا جس کی زندگی کچھ عجیب کن کھجوروں کی سی تھی کہ اب بھی اُن کو تصوّر میں لاتے ہی تمام جسم میں کھجلی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ جب میں میراجی کے متعلق اپنے منتشر تصوّرات کو یکجا کرتا ہوں تو میرے سامنے ایک اونٹ کی سی شکل بن جاتی ہے، جس سے میں حیرت کے ساتھ پوچھتا ہوں ''اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔'' اُن کو اُردو سے عشق تھا، لہٰذا انگریزی فلمیں دیکھتے تھے۔ اور چونکہ وہ انگریزی فلمیں دیکھتے تھے لہٰذا ایک بنگالن کے عاشق تھے۔ شعری اصطلاح میں اِس صنعت کو شُتر گربہ کہتے ہیں۔ اور اگر شعری اصطلاح سے کام نہ لیا جائے تو اس کا نام اُونٹ، بکری آگرہ ہے۔ اُن کی شاعرانہ صلاحیت پر ایمان نہ لانا میرے مذہب میں کفر ہے۔ اور خواہ باقی تمام شاعر مجھ پر ہتک کا دعویٰ کر دیں گے مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میراجی جتنے بڑے شاعر تھے اگر اُتنا ہی چھوٹا اُن کا ماحول نہ ہوتا تو وہ اور بھی بڑے ثابت ہوتے۔ مگر شاعری کے علاوہ جب اُن کے دوسرے حالات پر غور کرتا ہوں تو بس غور کرتا ہی رہ جاتا ہوں، بلکہ اکثر تو معلوم نہیں کیوں توبہ کرنے لگتا ہوں۔

میراجی کو میں نے اُن کے بعض مقرّب دوستوں کے ذریعے اُن کے مرنے کے بعد

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 182 (1,1)

جانا۔ ان دوستوں میں بڑے بڑے معقول لوگ تھے۔ مثلاً ن۔م راشد، محمود نظامی اور اخلاق دہلوی وغیرہ۔ اخلاق بے چارے تو خیر کسی کو کبھی بُرا کہتے ہی نہیں۔ اُن کا نام اُن کی فطرت بن کر اُن پر چھا گیا ہے۔ مگر یہ ن۔م راشد اور محمود نظامی تو بڑے منہ پھٹ لوگوں میں سے ہیں۔ اپنی قسم کے پورے حلقہ اربابِ ذوق ہیں کہ منہ در منہ ایسی تنقید کرتے ہیں کہ آدمی چکرا کر رہ جائے۔ مگر ان لوگوں کو بھی میں نے اس وقت میراجی کا مداح پایا ہے جب اُن کو نہ آملیٹ بننے کا خطرہ تھا، نہ میرا جی کے ٹوٹے ہوئے دل کے کچھ اور ٹوٹنے کا۔ زندگی بھر میراجی کو اگر کسی خطرے کی وجہ سے بُرا نہ کہہ سکتے تھے تو مرنے کے بعد تو کہہ ہی سکتے تھے کہ ''خس کم جہاں پاک۔'' مگر میں نے ان کو بھی میراجی کے انتقال پر کچھ اس قسم کا جواری سا پایا جو ایک ہی داؤں پر ساری پونجی لگا کے ہار گیا ہو۔ میراجی کو وہ عجیب الخلقت کہتے تھے مگر پھر بھی پیار کرتے تھے۔ میراجی اُن کو ''آملیٹ'' بنا چکے تھے مگر وہ پھر بھی میراجی کے لیے اشک بار تھے۔ اور میراجی کے جس وجود سے اُن کو اُکتا جانا چاہیے تھا، اُسی کی کمی اُن کے لیے ایک ایسا خلا پیدا کیے ہوئے تھی جس کو کبھی پُر نہ کیا جا سکے

میں نے جب سب سے پہلی مرتبہ میراجی کی تصویر دیکھی تو مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ اور اب تک سمجھ میں نہیں آیا ہے کہ بجائے غصہ آنے کے یہ ہنسی کیوں آ گئی تھی۔ اور میں غور کرتا ہوں کہ اگر بجائے تصویر کے میں خدانخواستہ خود میراجی کو دیکھتا تو کیا اسی بدتمیزی کے ساتھ اُن کو دیکھتے ہی ہنس دیتا۔ صاحبان! کوئی تعجب نہیں کہ میں واقعی ہنس دیتا۔ بھلا غور تو کیجئے مجھ سے اُن کے گلے میں پڑی ہوئی مالائیں کیسے دیکھی جاتیں؟ اُن کے وہ لمبے لمبے بال کیسے دیکھے جاتے اور اُن کی وہ مکڑ نما شخصیت مجھ سے کیسے برداشت ہوتی۔ اور ظاہر ہے کہ پھر وہ حضرت میرا بھی آملیٹ بناتے۔ یہ آملیٹ بنانے کی ترکیب اُن کے مقربین ہی سے مجھ کو معلوم ہوئی ہے کہ میراجی جس سے ناراض ہو جاتے تھے اُس کو کسی نہ کسی طرح گھیر کر کسی محفلِ ساقی میں لے جاتے تھے اور پھر پینے کے بعد نہایت خلوص کے ساتھ اُس کی مرمت شروع کرتے تھے۔ اور رفتہ رفتہ یہ خلوص تشدد اختیار کر کے انتقام بن جاتا تھا۔ اور اُس بے چارے کی وہ دُرگت بنتی تھی کہ جسم بھر میں ضرباتِ شدید و

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 183 (1,1)

ضرباتِ خفیف کا ایک جال سا پیدا ہو جاتا تھا۔ کہیں گومڑ سے پڑے ہوئے ہیں تو کہیں نیل۔ کہیں جلد پھٹ کر خون بہہ رہا ہے تو کہیں ہڈی کی چوٹ آئی ہے۔ مختصر یہ کہ مضروب کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کسی بلوے سے جان بچا کر تو آ گیا ہے مگر جسم اُس کی سخت جانی کا گواہ ہے۔ اُس کے بعد میرا جی خود ہی اُس کی تیمارداری فرماتے تھے، اور ہومیوپیتھک طریقہ پر علاج کرتے۔

کچھ بھی سہی مگر مجھے یقین ہے کہ میرا آملیٹ اُن کے ہاتھوں ضرور بنتا۔ میں اُن کے ہاتھوں میں مداریوں والے لوہے کے گولے دیکھ کر کیونکر ضبط کر سکتا تھا۔ اُن کو اپنی مالا پر میرا میرا جپتے ہوئے اور سادھوؤں کی طرح گیان دھیان میں بیٹھا ہوا دیکھ کر کیونکر چُپ رہ سکتا تھا۔ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے ایسا عجیب الخلقت انسان گرمیوں میں جاڑے کے کپڑے پہنے ہوئے، ہاتھ میں مداریوں کے گولے لیے، گلے میں موٹے موٹے دانوں کی مالائیں ڈالے، لمبے لمبے بال اُلجھائے بیٹھا ہوا میرا بائی کے بھجن گایا کرتا اور میں اِتنا بیوقوف ہو جاتا کہ ہنستا بھی نہیں۔ یہ میرے لیے ناممکن تھا۔ اور چونکہ میں اِس قسم کے موقعوں پر ہنسی ضبط نہ کر سکتا، لہٰذا میرا آملیٹ بننا برحق تھا۔ وہ تو کہیے کہ خیریت گزری کہ میں اُن سے ملا ہی نہیں۔

وہ شخص جو ثناء اللہ بن کر پیدا ہوا اور میرا جی بن کر مرا، وہ مسلمان جو HINDU MYTHOLOGY کا دیوانہ تھا، وہ شاعر جس کو مذہبیات، جنسیات اور نفسیات کے مطالعہ کا جنون تھا، وہ کنوارہ جو میراسین پر مر کر زندہ رہا اور پھر دلّی میں بادلی بیگم اور بلّی خانم کے عشق کا دم بھرتا رہا، مگر کسی کا شرمندۂ احسان نہ ہوا، وہ شرابی جس کو خود شراب پیئے جا رہی تھی، وہ وجدانی جو تخلیہ میں قرآن پاک سُن کر روتا اور دمِ تحریر بغیر دیوناگری میں ''اوم'' لکھے ہوئے کچھ نہ لکھ سکتا۔ ذرا غور تو کیجیے ایسا آدمی سمجھ میں کیونکر آ سکتا تھا۔ اِس قسم کی شخصیتیں سمجھنے سمجھانے کے لیے ہوتی ہی کب ہیں۔ ان پر غور کیجیے تو عقل کا زیاں غور نہ کیجیے تو ذہنی فالج کا خطرہ۔

مجھ کو میرا جی کی طرف کھینچنے میں اخلاق کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ وہی اخلاق جن کے نام میرا جی نے اپنے گیتوں کا مجموعہ ''گیت ہی گیت'' منسوب کرتے ہوئے کہا ہے: ''اخلاق احمد

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 184 (1,1)

کے نام جسے اِن گیتوں کے ماخذ معلوم ہیں۔'' شروع شروع میں اخلاق کثرت سے میراجی کا ذکر خواہ مخواہ کیا کرتے تھے کہ بعض اوقات میں اُلجھ جایا کرتا تھا۔ اور کبھی کبھی میراجی چاہتا تھا کہ اِن حضرت کو بھی میراجی کے پاس کیوں نہ پہنچا دیا جائے۔ پھر میں نے دیکھا کہ مجھ کو بعض اوقات اخلاق احمد میں اُس کی روح بولتی نظر آنے لگی اور میں اخلاق احمد سے ڈرنے لگا۔۔ یہاں تک کہ جب ایک مرتبہ اخلاق مجھ کو اپنے گھر لے گئے جو آبادی سے دُور اِچھرے کے اس مقام پر تھا جہاں اِس ترقی یافتہ دُنیا کے تمام آثار ختم ہو جاتے ہیں۔ انسانوں میں سے صرف اخلاق وہاں پہنچ سکے ہیں۔ وہ بھی اپنی انسانیت اسی طرف چھوڑ کر، جنگل بیابان، گہرے گہرے کھڈ، بھیانک خندق، خوفناک کھائیاں، جھاڑ جھنکار اور ان سب میں گھرا ہوا صرف ایک اکلوتا گھر۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ اب یہاں لا کر اخلاق ایک دم لمبے لمبے بال لگا لیں گے، مالائیں پہن لیں گے، لوہے کے گولے ہاتھ میں لے لیں گے اور یہ کہہ کر مجھے دم بخود کر دیں گے کہ میں ہی دراصل میراجی ہوں۔ انتقاماً مر گیا ہوں مگر اخلاقاً زندہ ہوں۔ اور اگر میں نے بھاگنے کی کوشش کی تو میرا آملیٹ بنا ڈالیں گے۔ مگر میرا یہ اندیشہ اُس دن غلط نکلا۔ پھر بھی اخلاق کی طرف سے بہت دن تک پوری طرح اطمینان نہیں ہوا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ اخلاق کی اس مسلسل تبلیغ نے مجھ کو میراجی کی طرف واقعی متوجہ کر دیا۔ میں نے اُن کا لٹریچر پڑھا اور ہر چند کہ اپنی ذاتی کور ذوقی کی وجہ سے مجھ کو آزاد قسم کی شاعری سے نہایت گنوار قسم کی اُلجھن ہوتی ہے۔ اور میری اِس اُلجھن پر ن۔ م راشد کو مجھ پر اِس طرح ترس آتا ہے جیسے کسی یتیم پر کسی مردِ مومن کو آنا چاہیے، مگر اس یتیم العقلی کے باوجود مجھ کو میراجی کے کلام میں ایک لذّت سی محسوس ہونے لگی اور اب میں اور بھی زیادہ ڈرا کہ کہیں میرا انجام یہ تو نہ ہوگا کہ میں ترقی پسند بن کر مروں اور بلینک ورس بن کر جیوں۔ مگر تجربہ سے ثابت یہ ہوا کہ میراجی اپنی خصوصیات میں ڈوبنے کے بعد اب دوسرے شاعروں کے لیے سدِّ سکندر بھی بنے ہوئے ہیں۔ اب میں اُن کی شاعرانہ عظمت کا دل سے معترف ہوں۔ اُن کے وجدان کی گہرائیوں کو بھی پا چکا ہوں اخلاق سے اُن کے تذکرے اب خود چھیڑ چھیڑ کر سُنتا ہوں۔ اُن کے گیت بھی گُنگُنا لیتا ہوں۔ جے جے ونتی

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 185 (1,1)

میں نہ سہی میاں کی ٹوڈی میں سہی۔ اور رفتہ رفتہ میراجی سے اِس قدر قریب آچکا ہوں کہ اکثر سوچا کرتا ہوں کہ میراجی اگر زندہ رہتے تو کیا مضائقہ تھا۔ مگر پھر میرا دل جواب دیتا ہے کہ مر گئے ہیں تو بھی کیا مضائقہ ہوا۔ ایسے لوگوں کی زندگی اور موت میں فرق ہی کب ہوتا ہے۔ وہ اب بھی زندہ ہیں، اخلاق کی صورت میں زندہ ہیں، راشد کی صورت میں زندہ ہیں، صلاح الدین کی صورت میں زندہ ہیں، قیوم نظر کی صورت میں زندہ ہیں، بلکہ میری صورت میں زندہ ہیں۔

(نقوش، شمارہ 16,15، 1950ء)

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 186 (1,1)

عبادت بریلوی

میراجی

''میراجی'' کتنا عجیب نام تھا!

جب بھی میراجی کا نام سُنتا تو میرے سامنے میران جی شمس المشتاق آجاتے جو بڑے پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔اور جو ہماری زبان میں اپنے ترجمہ شرح مرغوب القلوب کے لیے مشہور ہیں۔میں سوچتا میراجی ضرور کوئی پہنچے ہوئے آدمی ہوں گے اور کوئی نہ کوئی نسبت اُنھیں میراں جی شمس المشتاق یا اسی قسم کے کسی بزرگ اور صوفیٔ صافی سے ضرور ہوگی۔ورنہ وہ اِتنا عجیب نام کیوں رکھتے۔لیکن اُن کی بعض نظمیں دیکھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ میراجی صوفی نہیں۔پہنچے ہوئے آدمی نہیں۔اللہ والے نہیں۔اسی دُنیا کے انسان ہیں۔اِسی دُنیا میں رہتے ہیں۔اِسی دُنیا میں وہ ان تمام راہوں سے گزرے ہیں جن سے ایک انسان گزر سکتا ہے۔اُن کی زندگی میں بھی وہ منزلیں آئی ہیں، جو ہر انسان کی زندگی میں آتی ہیں یا آسکتی ہیں۔اُن کے یہاں زندگی کا احساس شدید ہے۔اُنھوں نے اِس کے مختلف پہلوؤں کو بہت قریب سے دیکھا ہے،اس کی ایک ایک چیز،ایک ایک پہلو میں حُسن ہے،لطافت ہے،رنگینی ہے، رعنائی ہے اور اِس کے علاوہ بھی نہ جانے کیا کیا کچھ ہے۔وہ اِس دھرتی کو چھوڑ کر آسمانوں پر بسیرا لینے کے قائل نہیں بلکہ دھرتی ہی اُن کے لیے سب کچھ ہے۔اور وہ ان سب سے رس نچوڑ لینے ہی کو اپنا مسلک سمجھتے ہیں۔اُن کی نظموں کو پڑھنے کے بعد تو یہی احساس ہوتا تھا لیکن اُن کا نام تو میراجی تھا،اور اُن کا نام سُنتے ہی میراجی شمس المشتاق کی بزرگی اور تقدّس کی خصوصیات ضرور میرے ذہن میں منڈلانے لگتی تھیں اور رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ بہت ممکن ہے اُن کا تعلق تصوّف سے ہو اور وہ ایک پہنچے ہوئے بزرگ ہوں۔یہ کتنا عجیب تضاد تھا میرے ذہن میں میراجی کی شخصیت

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 187 (1,1)

کے بارے میں!

میں اِسی اُدھیڑ بُن میں رہتا کہ آخر میراجی ہیں کیا؟ لیکن یہ عُقدہ حل نہ ہوتا، جتنے منہ اُتنی باتیں۔ کوئی کہتا، وہ عجیب وغریب شخصیت کے مالک ہیں۔ کبھی یہ بات مشہور ہو جاتی کہ اُن کی ہیئت عجیب وغریب ہے۔ یعنی کہ وہ فقیروں کی سی صورت بنائے رہتے ہیں۔ اُن کے بال بڑے بڑے ہیں۔ اُن کے جسم پر گیروے رنگ کا لباس رہتا ہے۔ وہ ہاتھوں میں دوگولے رکھتے ہیں۔ وہ پیدل بہت چلتے ہیں۔ اُنھوں نے بہت پڑھا ہے۔ وہ سنسکرت جانتے ہیں۔ اُنھیں ہندو کلچر سے بڑی دلچسپی ہے۔ وہ ایک بہت بڑے عالم ہیں اُنھوں نے دُنیا کے مختلف ملکوں کے ادبیات کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ بہت اچھے دوست ہیں۔ وہ بہت ہی بُرے آدمی ہیں۔ اُنھیں کسی لڑکی سے محبّت ہے۔ اُنھیں بہت سی لڑکیوں سے محبت ہے۔ وہ بڑے حُسن پرست ہیں۔ وہ بہت آوارہ ہیں۔ وہ کوئی بات چھپاتے نہیں بلکہ سب کچھ کہہ دیتے ہیں۔ وہ ہندو ہیں۔ نہیں وہ مسلمان ہیں لیکن مذہبی آدمی نہیں ہیں۔ وہ تو ایک سیدھے سادے انسان ہیں، وہ ترقی پسند ہیں، نہیں وہ رجعت پسند ہیں۔ اُنھیں ایک جگہ پر قرار نہیں۔ وہ جہاں گشت ہیں۔ خانہ بدوش ہیں۔ صحرانورد ہیں۔ اُن کا رنگ گورا ہے، نہیں وہ سیاہ فام ہیں۔ اُن کا قد چھ فٹ سے کم نہیں۔ نہیں وہ پستہ قد آدمی ہیں۔ اُن کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں۔ اُن کی ناک اُوپر کو اُبھری ہوئی ہے۔ اُن کی پیشانی کُشادہ ہے۔ اُن کا سینہ چوڑا ہے۔ وہ دیکھنے سے مضبوط آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ نہیں اُن کی صحت اچھی نہیں ہے۔ وہ بیمار ہیں۔ اُنھیں بہت سے امراض نے گھیر رکھا ہے۔ غرض یہ کہ نہ جانے کتنی مختلف اور متضاد باتیں میراجی کی شخصیت کے متعلق ہوتیں۔ لیکن اِس حقیقت کا پتہ نہ چلتا کہ واقعی وہ ہیں کیا؟ اور ہر مہینے اُن کی ایک نظم یا ایک نہ ایک مضمون اپنے ساتھ ایک ہنگامہ لے کر آتا۔ میراجی اُن دِنوں بہت تیزی سے لکھ رہے تھے، اور ہمارے ایسے جدید ادب کے طالب علم اُنھیں باقاعدگی سے پڑھ رہے تھے۔

اُن دِنوں مَیں لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور یونیورسٹی میں چند ایسے ادیبوں کا چھوٹا سا حلقہ تھا جو ادبیات کے جدید رُجحانات اور خصوصاً اُردو اَدب کے جدید رُجحانات سے خاص دلچسپی

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 188 (1,1)

رکھتے تھے۔ اِس لیے جو بھی نیا نام سامنے آتا، جو بھی نئی تحریک نظر آتی، اُس سے ہم لوگ خاصی دلچسپی لیتے۔ میراجی نئے تھے اِس لیے بہت جلد اُنھوں نے ہم سب کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیا۔ اب ہم اُن کی نظموں پر آپس میں بحثیں کرتے۔ اُن کی شخصیت اور کردار پر تبادلۂ خیال ہوتا۔ کوئی میراجی کی طرف سے آنکلتا تو اُس کو گھیر لیتے تا کہ اُن کے متعلق کچھ معلومات حاصل ہوں۔ چنانچہ اِسی طرح ہم لوگ میراجی سے واقف ہوئے اور ہمیں اُن کی شخصیت کا صحیح اندازہ ہوا۔ ورنہ اس سے قبل تو لوگ اُن کے متعلق طرح طرح کی ایسی مختلف اور متضاد باتیں مشہور کر دیتے تھے جن سے اُن کی شخصیت ایک معمّہ معلوم ہوتی تھی۔ معمّہ تو خیر وہ کسی حد تک تھے بھی لیکن یہ باتیں اِس معمّے کو بھی ایک اور معمّہ بنا دیتی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قدیم و جدید کی بحث نے ہمارے ادبی رسالوں میں بڑی شدت اختیار کر لی تھی اور جدت کا ہر مخالف میراجی کا نام لے کر عجیب عجیب باتیں کہتا تھا۔ ان عجیب و غریب باتوں کی نوعیت انفرادی اور شخصی بھی ہوتی تھی اور ادبی اور فنی بھی۔

شاید سب سے پہلے میراجی کے متعلق اِس اُلجھن سے مجھے کرشن چندر یا وِشوامتر عادل نے نجات دلائی۔ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر یوں ہی سلسلۂ گفتگو چل نکلا تو اُنھوں نے میراجی کے متعلق یہ بتایا کہ میراجی کے بارے میں جو متضاد باتیں یہاں مشہور کی جا رہی ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ میراجی کا اصلی نام ثناء اللہ خان ہے لیکن اُنھوں نے اپنا نام میراجی رکھ لیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اُنھیں میرا کا نام بہت پسند ہے۔ میرا کی شاعری کے بھی وہ والا وشیدا ہیں۔ اِسی وجہ سے میرا کی شاعری کا جو موضوع ہے اُس کے اثرات خود اُن کی شاعری میں بھی نظر آتے ہیں۔ اور میرا اُس لڑکی کا نام بھی ہے جس سے وہ محبّت کرتے ہیں۔ اِسی لیے اُنھوں نے اپنا نام میراجی رکھ لیا ہے، اور وہ اِسی نام سے لکھتے ہیں۔ اُن کا اصلی نام بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ اُن کا قد درمیانہ ہے۔ اُن کی آنکھیں بڑی بڑی ہیں۔ اُن کی ناک اُبھری ہوئی ہے۔ اُن کے سر پر بڑے بڑے بال ہیں۔ کبھی کبھی وہ بال صاف کرا دیتے ہیں۔ اُن کے چہرے کی خصوصیت اُن کی مونچھیں بھی ہیں۔ اُن کی باتوں سے بلا کی ذہانت ٹپکتی ہے۔ لیکن وہ باتیں کم کرتے ہیں اور جب باتیں کرتے ہیں تو بہت

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 189 (1,1)

تیزی سے باتیں کرتے ہیں، جیسے اُنھیں کہیں بہت جلدی میں جانا ہو، یا جیسے وہ اِس بات سے پیچھا چھڑا لینا چاہتے ہوں۔ وہ بعض عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ اُن کے ہاتھ میں پیتل کے دو گولے ہوتے ہیں اور ان گولوں کو وہ مسلتے رہتے ہیں۔ یہ اُن کا عجیب و غریب مشغلہ ہے۔ وہ پڑھتے بہت ہیں۔ اُن کا مطالعہ خاصا وسیع ہے۔ وہ کئی زبانیں جانتے ہیں لیکن لاپروائی اُن کے مزاج کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ چنانچہ اِس خصوصیت کا اِظہار اُن کے افعال و کردار اور ہیئت وصورت سے بھی ہوتا ہے۔ لباس کا وہ بہت کم خیال رکھتے ہیں۔ اُن کی محبوب ترین چیزیں دو ہیں۔ ایک تو اُن کی محبوبہ جس کے لیے وہ زمین کا گز بنے رہتے ہیں اور سڑکوں کو ناپتے پھرتے ہیں اور دوسرے حلقہ اربابِ ذوق جس کے لیے میراجی وہ سب کچھ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کی اُن سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ وہ شراب بہت پیتے ہیں اور اِس وجہ سے اُن کی صحت تیزی سے انحطاط کی طرف جا رہی ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب تک زندہ رہ سکیں گے۔ اُنھیں زندگی کی بلندیوں کا احساس ہوتے ہوئے بھی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں۔

اِن باتوں کو سُن کر معلوم ہوا کہ میراجی کون ہیں، اور کیا ہیں؟ اب میری دلچسپی نہ جانے کیوں میراجی سے اور بڑھ گئی۔ نہ جانے کیوں میراجی چاہتا تھا کہ اُن سے ملاقات ہو۔ میراجی اُن دِنوں لاہور میں رہتے تھے اور بعض مجبوریوں کی بناء پر میرا لاہور تک پہنچنا مشکل تھا۔ اِس لیے کئی سال تک میری یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ میں میراجی کی نظمیں اور مضامین پڑھتا رہا اور میراجی کو دیکھنے، اُن سے ملنے اور اُن کو قریب سے دیکھنے اور اُن کا مطالعہ کرنے کی آتش فشاں تیز سے تیز تر ہو گئی۔

کئی سال اِس طرح گزر گئے۔ پھر ایک دفعہ خبر ملی کہ میراجی نے لاہور چھوڑ دیا ہے اور اب وہ دِلّی آ گئے ہیں۔ دہلی کے ریڈیو اسٹیشن میں اُنھیں کوئی ملازمت مل گئی ہے اور وہ وہاں ریڈیو کے لیے فیچر اور گیت لکھتے ہیں۔ راشد، منٹو، کرشن چندر، اور اُپندر ناتھ اشک کے ساتھ ہی ریڈیو نے میراجی کو بھی اپنا اسیر کر لیا ہے۔ مجھے اِس بات کا افسوس بھی ہوا اور خوشی بھی۔ افسوس تو اِس کا کہ میراجی شاید اب تیزی سے نہیں لکھ سکیں گے جس تیزی سے وہ لاہور میں لکھتے تھے۔ اُنھیں تخلیقی کام

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 190 (1,1)

کا موقع نسبتاً کم ملے گا۔ اور خوشی اِس بات کی کہ کبھی دِلّی جانا ہوا تو میراجی سے ملاقات ہو جائے گی۔ میں اُنھیں قریب سے دیکھ سکوں گا اور اُن سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہو سکے گی۔ اُن دِنوں کبھی کبھی لکھنؤ سے میرا دِلّی جانا ہوتا تھا۔

خدا خدا کر کے وہ دن آیا۔ میں دِلّی گیا تو دن میں ایک ضرورت سے ریڈیو اسٹیشن پہنچا۔ راجندر سنگھ بیدی میرے ساتھ تھے۔ سوچ کے چلے تھے کہ میراجی سے ضرور ملیں گے۔ پہلے اشک سے ملاقات ہوئی۔ میراجی اُس وقت وہاں موجود نہیں تھے۔ میں نے اشک سے کہا کہ ''اس وقت مَیں میراجی کی تلاش میں نکلا ہوں۔ اُن سے ملاقات کی کوئی صورت نکلنی چاہیے۔''

یہ سُن کر اشک اُٹھے اور مجھے ساتھ لے کر ریڈیو اسٹیشن کے کمروں میں میراجی کو تلاش کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک کمرے میں میراجی مل گئے۔ اُن کو دیکھتے ہی اشک نے اپنے مخصوص لہجے میں اُنھیں پکارا۔ تب معلوم ہوا یہ میراجی ہیں۔

وہ اس وقت سیدھے سادھے لباس میں تھے۔ اُن کے جسم پر ایک شیروانی تھی۔ اُن کا پاجامہ علی گڑھ کاٹ کا تھا۔ اُن کے بال یقیناً بہت بڑھے ہوئے تھے، لیکن چہرے پر بال نہیں تھے۔ اُن کی مونچھیں، جن کا اتنا شُہرہ تھا، وہ بھی مجھے اُن کے چہرے پر نظر نہیں آئیں۔ دیکھنے میں اُن کی صحت ایسی کچھ بُری نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ اُن کا بڑا اور چوڑا سا چہرہ خوب بھرا ہوا تھا۔ ان کا قد نہ زیادہ لمبا تھا نہ بہت چھوٹا، اور دیکھنے سے وہ خاصے مضبوط معلوم ہوتے تھے۔ اُن کے منہ میں پان بھرا ہوا تھا اور جب وہ پان چباتے تھے تو اُن کے منہ سے بُو آتی تھی۔

میرا اور اُن کا غائبانہ تعارف کسی نہ کسی طرح ہو چکا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی اشک نے تعارف کرانے کے لیے میرا نام لیا تو وہ انتہائی خلوص اور محبّت سے آگے بڑھے، ہاتھ ملایا اور گلے ملے۔ پھر ہم بیٹھ گئے اور باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

مَیں نے پوچھا ''میراجی ریڈیو پر کیسی گزر رہی ہے؟ کہنے لگے ''زندگی کے دن گزار رہا ہوں۔''

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 191 (1,1)

میں نے پوچھا ''دن کو پروگرام کیا رہتا ہے؟''

جواب دیا ''دن بھر ریڈیو کے لیے یہیں بیٹھ کر کچھ نہ کچھ لکھتا ہوں۔ رات کو کبھی کبھی ڈرامے میں پارٹ بھی کر لیتا ہوں۔ اور جس روز میرا اپنا فیچر ہوتا ہے، اُس روز کبھی کبھی ہدایات دینے کے لیے یہاں رُک جاتا ہوں۔ ورنہ جب شام ہو جاتی ہے تو یہاں سے پیدل گھر کی طرف چل دیتا ہوں۔ میرا گھر یہاں سے کم از کم چار میل ہو گا صبح کو بھی میں پیدل ہی یہاں آتا ہوں۔ بات یہ ہے عبادت صاحب! میں کچھ بد پرہیزیاں کر لیتا ہوں۔ اِس لیے پیدل چلنے سے ان کا ازالہ ہو جاتا ہے۔''

اُن کی یہ بات اُس وقت میری سمجھ میں نہیں آئی، لیکن بعد میں مجھے اِس بات کا علم ہوا کہ ''بد پرہیزیوں'' سے اُن کا کیا مطلب تھا۔ اور آج کسی پر بھی یہ بات پوشیدہ نہیں ہے۔ میرا جی بہت صاف گو تھے۔ وہ کوئی بات چھپا نہیں سکتے تھے۔

پہلی ہی ملاقات میں میرا جی مجھ سے بہت قریب ہو گئے۔ ہم نے کھل کر مختلف موضوعات پر باتیں کیں۔ اُن دِنوں میرا ایک مضمون آزاد شاعری کی حمایت میں چھپا تھا اور قدامت پرستوں کے حلقے اس پر ہنگامہ کر رہے تھے۔ میرا جی نے خود ہی ذکر کیا کہ میں نے وہ مضمون حال ہی میں پڑھا ہے۔ اور پھر وہ دیر تک آزاد شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے رہے۔ اُن کی باتوں میں بڑا وزن تھا۔ اُنھوں نے اِس سلسلے میں جو بات بھی کہی منطقی انداز میں کہی۔ پھر کچھ حُسن اور حُسن پرستوں کا ذکر چھڑ گیا۔ میں نے دیکھا اور محسوس کیا کہ حُسن پرستی کے سلسلے میں عورت کا ذکر کرتے ہوئے وہ اس میں ڈوب ڈوب اور کھو کھو گئے۔ حُسن کا بڑا شدید احساس اُن کے اندر موجود تھا اور اِس موضوع پر بات کرتے ہوئے وہ جھوم جھوم جاتے تھے۔ اس کے بعد بات کچھ جنسیات پر چل نکلی اور میں نے محسوس کیا کہ میرا جی اِس موضوع پر بھی نہایت کھل کر گفتگو کرنے کو اچھا سمجھتے ہیں۔ اُن کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوا کہ فرائڈ کے نظریے سے اُنھیں خاصی دلچسپی ہے۔ وہ اس کی بہت سی باتوں کو صحیح مانتے ہیں اور اُنھوں نے اس کا گہرا مطالعہ بھی کیا

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 192 (1,1)

ہے۔

میں نے مُنہ کا مزا بدلنے کے لیے موضوع گفتگو ذرا بدلا اور ادب و تنقید کی بات چھیڑ دی۔ میراجی نے اِس موضوع پر بھی خیالات کا اظہار شروع کر دیا۔ اُنھوں نے فن برائے فن کے نظریے کی اہمیت اِس طرح بتائی جیسے وہ مجھے راہِ راست پر لانا چاہتے ہیں۔ اُنھیں شاید پہلے سے اِس بات کا اندازہ تھا کہ اِس معاملے میں میرے اُن کے درمیان بنیادی اختلافات ہیں اور میں اِس معاملے میں کبھی بھی اُن کا ہم نوا نہ ہو سکوں گا۔ اِس لیے اُنھوں نے وکالت کا حق ادا کر دیا۔ لیکن اِس کے باوجود میں نے یہ محسوس کیا کہ اِس سلسلے میں بھی جو باتیں اُنھوں نے کیں اُن میں ذہانت کی بجلیاں کوندتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ ان میں جدت اور اُپج کا پتہ چلتا تھا۔

اِسی ملاقات میں میراجی نے اپنی غیر معمولی دلچسپی کا اظہار اُردو زبان سے بھی کیا۔ کہنے لگے: ''عبادت صاحب! اُردو زبان میں بڑا رس ہے میری ماں اُردو نہیں بولتی۔'' اور یہ بات اپنے دلچسپ انداز میں وہ اکثر دوستوں سے کہا کرتے تھے۔

اُن کی باتوں کا یہ سلسلہ کبھی بھی ختم نہ ہوتا لیکن دیر بہت ہو گئی تھی اور مجھے ایک دوسری جگہ جانا تھا، اِس لیے میں پھر ملنے کا وعدہ کر کے میراجی سے رخصت ہوا۔ میراجی ریڈیو اسٹیشن ہی پر رُک گئے، کیونکہ اُس روز اُن کا کوئی فیچر ہونے والا تھا اور وہ ہدایات کے سلسلے میں اپنی موجودگی کو وہاں ضروری سمجھتے تھے۔

میراجی سے رُخصت ہو کر میں پارلیمنٹ اسٹریٹ پر کناٹ پیلس کی طرف چلنے لگا۔ میراجی کی باتیں میرے ذہن میں گونج رہی تھیں۔ اُن کی شخصیت مجھ پر چھائی ہوئی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے وہ میرے ساتھ ہیں۔ اور میں سوچتا ہوا آگے قدم بڑھا رہا تھا کہ میراجی بلا کے ذہین ہیں۔ اُن کا مطالعہ بھی بہت وسیع ہے۔ اُنھوں نے مختلف مسائل پر بھی غور کیا ہے۔ وہ ہر موضوع پر اپنی مخصوص رائے رکھتے ہیں۔ اُن کے مزاج میں بڑی سادگی ہے۔ یہاں تک کہ اُنھیں اپنی اہمیت تک کا احساس نہیں۔ اُن کے نظریات میں کتنا خلوص ہے۔ وہ کیسے نئے انداز

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 193 (1,1)

میں سوچتے ہیں۔اُن کا زاویۂ نظر کس قدر تجزیاتی ہوتا ہے۔اُن کے فنی شعور میں کس قدر پختگی ہے۔ اُن کا احساسِ جمال کس قدر شباب پر ہے؟ اُن کے فکر کی پرواز کتنی بلند ہے۔اُن کے شعور میں کس درجہ رچی ہوئی کیفیت ہے۔وہ کتنے صاف گو ہیں۔ان کے مزاج میں کس قدر بے باکی ہے۔وہ کتنے کشادہ دل ہیں۔زندگی اس کی رنگینیوں،رعنائیوں اور سرمستیوں کا کیسا رچا ہوا احساس ان کے یہاں موجود ہے۔ان کی ذہانت کا کیا ٹھکانا ہے لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود نہ جانے کیوں وہ اِس قدر لاپروا ہیں۔نہ جانے کیوں اُنھیں اپنی ذات عزیز نہیں اور وہ اپنے آپ سے اِس قدر بیزار کیوں ہیں؟ کیوں ان کے یہاں اِس قدر اُداسی ہے؟ وہ کیوں کھوئے کھوئے سے، کچھ ڈوبے ڈوبے سے اور کچھ بہکے بہکے سے نظر آتے ہیں؟ وہ کیوں اپنی پروا نہیں کرتے؟ کیوں اُنھیں اپنی زندگی میں ایک خلا سا نظر آتا ہے۔اُن کی باتیں اِس بات کو کیوں ظاہر کرتی ہیں کہ اُن کی زندگی میں تاریکی ہی تاریکی ہے؟ کیوں باوجود ایک بڑائی کے اُن کے مزاج میں ایک لاابالی پن پایا جاتا ہے؟ اُن کی مسکراہٹ میں وہ شگفتگی اور شیرینی کیوں نہیں ہے جو ہونی چاہیے؟ اُن کی شوخیاں بھی اُداسیوں سے کیوں ملی جلی نظر آتی ہیں۔وہ اِتنی شراب کیوں پیتے ہیں کہ منہ سے بھبھکے نکلتے ہیں؟ وہ دُنیا کو کیوں بھلا دینے کی کوشش کرتے ہیں؟ اُن کی ہنسی میں بھی ایک کرب کی سی کیفیت کیوں ہے؟

یہ اور اسی طرح کے ملے جلے خیالات مجھے گھیرے ہوئے تھے۔میرا جی،اُن کی شخصیت، اُن کا مزاج،اُن کی تمام خصوصیات،اُن کے سارے مسائل مجھ پر اِس طرح چھائے ہوئے تھے کہ میں اور کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔میرے قدم راستے پر آگے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ہر چیز پیچھے چھوٹی جا رہی تھی لیکن میرا جی کا خیال نظروں سے کسی طرح بھی اوجھل نہیں ہوتا تھا۔اِس ملاقات نے میرے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑے۔

اِس ملاقات کے بعد میں کئی مہینے تک میرا جی سے نہ مل سکا۔لیکن کچھ عرصے بعد ایک ایسی صورت نکلی کہ مجھے مستقل طور پر دِلّی میں قیام کرنا پڑا۔میرا جی ابھی تک ریڈیو میں تھے۔جب

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 194 (1,1)

میں مستقل طور ہر دِلّی پہنچا تو خیال تھا کہ اُن سے برابر ملاقات ہوتی رہے گی لیکن یہ آرزو خاطر خواہ پوری نہ ہوئی۔ کچھ تو میں مصروف رہا اور کچھ میرا جی وقت کے ساتھ اپنے آپ میں زیادہ ڈوبتے گئے۔ پھر بھی گاہے گاہے اُن سے ملاقات ہوتی رہی اور مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیالات کا موقع ملتا رہا۔ کبھی کبھی اُنھیں کتابوں کی ضرورت ہوتی تو وہ اینگلو عربک کالج میں آجاتے۔ کتابیں مل جاتیں تو پھر ٹھہرتے بہت کم تھے۔ بس فوراً چل دیتے تھے۔ کبھی سڑک پر چلتے ہوئے اُن سے ملاقات ہو جاتی تھی، کبھی ریڈیو سٹیشن پر ملاقات ہو جاتی تھی۔ مکان پر اُن سے ملنا مشکل ہوتا تھا، کیونکہ وہ جائے قیام پر بہت کم رہتے تھے۔ دن کو جوں توں شام کرنے کے بعد، رات گئے وہ مکان میں جا کر پڑ رہتے تھے۔ چھٹی کے دن اُن کا رنگ دوسرا ہوتا تھا۔ بہر حال میں اُن سے گھر پر کبھی نہ مل سکا۔ دو ایک دفعہ کوشش کی تو ناکامی ہوئی۔ لیکن میرے ایک دوست اتوار کے دن اُنھیں گھر پر ہی پکڑ لیتے تھے۔ ان سے یہ حال معلوم ہوتا تھا کہ کس طرح وہ صبح کو پہنچتے۔ آواز دیتے تو میرا جی اندر ہی سے پکار کر کہتے کہ ذرا رُکیے۔ میں ابھی آتا ہوں۔ وہ کسی کام میں مصروف ہوتے تھے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ باہر نکلتے اور اُنھیں اندر لے جا کر بٹھاتے، اپنے دن بھر کے پروگرام سے آگاہ کرتے۔ تھوڑی دیر گپ ہوتی اور پھر اُنھیں رُخصت کر دیتے۔

میرے یہی دوست بیان کرتے تھے کہ میرا جی کو اپنے گھر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایک کمرہ تھا۔ اُس میں فرش لگا ہوا تھا۔ فرش پر چاروں طرف کتابیں بکھری رہتی تھیں۔ میرا جی جب رات کو اس کمرے میں پہنچتے تھو اُنھیں کتابوں میں دفن ہو جاتے تھے۔ دِلّی میں اُنھیں پڑھنے کا موقع بہت کم ملتا تھا۔ اس کی وجہ کچھ تو دن بھر کی مصروفیت تھی اور کچھ اُن کا جسمانی و ذہنی انحطاط۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا جی کا مطالعۂ ادب لاہور میں اپنے شباب پر تھا۔ جتنا اُنھوں نے لاہور میں پڑھا، اُس کا عشرِ عشیر بھی دلی میں نہ پڑھ سکے اور اِس بات کا احساس اُنھیں خود بھی بہت زیادہ تھا۔ وہ اِس پر کُڑھتے اور افسوس بھی کرتے تھے۔ لیکن بے بسی اُن کے راستے میں حائل تھی، مجبوریاں پہاڑ بن گئی تھیں۔

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 195 (1,1)

دِلّی کے دورانِ قیام ایک دفعہ بڑا دلچسپ واقعہ ہوا۔

اینگلو عربک کالج میں ہر سال ایک بڑا شاندار مشاعرہ ہوتا تھا۔ ایک سال جب میراجی دِلّی ہی میں تھے اِس مشاعرے کو ترتیب دینے کا کام میرے سپرد کیا گیا۔ عربک کالج کے سالانہ مشاعرے کی شاندار روایات کے پیشِ نظر میں نے اِس مشاعرے کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کی کوشش کی اور اِس سلسلے میں یہ سوچا کہ مشاعرے میں کوئی جدّت کرنی چاہیے۔ اور اِس سے بڑی جدت اور کیا ہو سکتی تھی کہ جدید سے جدید تر شاعروں کو اِس مشاعرے میں مدعو کیا جائے جو عموماً مشاعروں سے کتراتے ہیں۔ شاید اِس وجہ سے کہ عوام کے لیے اُن کی نظموں کا سمجھنا مُشکل ہوتا ہے۔

چنانچہ میں نے یہ طے کیا کہ اِس مشاعرے میں میراجی کو ضرور بلایا جائے اور اُنھیں مجبور کیا جائے کہ وہ اپنا کلام ضرور سنائیں۔ میراجی سے میں نے خود جا کر کہا لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ خط لکھا تو اسی خط پر یہ عبارت لکھ دی: ''عبادت صاحب! مشاعرے کی بات چھوڑیے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ بہت جلد آپ کا کمرہ حلقہ اربابِ ذوق کا ''معبد'' بننے والا ہے (میراجی)''۔

اُن دِنوں حلقہ اربابِ ذوق کی ایک شاخ دِلّی میں قائم ہونے والی تھی اور میراجی اس کام میں پیش پیش تھے۔ اس خط میں مشاعرے میں شریک ہونے کا کوئی ذکر نہیں تھا لیکن میں نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ میں بھی دُھن کا پکّا تھا اور میں نے یہ تہیّہ کر لیا تھا کہ پرانے شاعروں کے دوش بدوش جدید سے جدید تر شاعر اور خصوصیت کے ساتھ میراجی اس مشاعرے میں ضرور پڑھیں گے۔ چنانچہ باقاعدہ ایک اسکیم بنائی گئی جس پر عمل کرنے کی صورت میں میراجی کا مشاعرے میں آجانا یقینی تھا۔

طے یہ ہوا کہ کالج کے چند طالب علم جو میراجی کو جانتے ہیں، روزانہ اُن کے پاس جاتے رہیں گے اور یہ کہتے رہیں گے کہ میراجی آخر جدید شاعر ہیں۔ ان پرانے شاعروں سے ایسے کون سے ہیٹے ہیں کہ وہ تو مشاعرے میں اپنا کلام پڑھیں اور جدید شاعروں کے لیے یہ راستہ بند ہو۔

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 196 (1,1)

یہ تو ہم سب کے لیے خصوصًا جدید ادب والوں کے لیے بڑی بے عزتی اور شرم کی بات ہے۔ دِلّی میں لوگ یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ اگر چہ عربک کالج والوں نے اِس بات کا اعلان کیا ہے کہ جدید شاعر بھی اِس مشاعرے میں شریک ہوں گے لیکن قدیم شاعروں کے مقابلے میں بھلا وہ بیچارے کیا آ سکتے ہیں؟ اور آ بھی جائیں تو مشاعرہ بہر حال قدیم شعراء ہی کے ہاتھ رہے گا۔ اِس دفعہ تو اُن کی اِس بات کو غلط ثابت کر کے دِکھا دینا چاہیے۔

کئی دن تک جب یہ اور اِسی طرح کی باتیں میرا جی کے سامنے کی گئیں تو وہ نرم پڑے اور مشاعرے کے دن اُنھوں نے بالآخر یہ کہہ ہی دیا کہ ''اِس مشاعرے میں ضرور جانا چاہیے۔''

طالب علموں نے یہ بات آ کر مجھے بتائی۔ میں نے کہا '' چلو کامیابی ہوگئی۔ اب مشاعرے میں لطف رہے گا۔''

لیکن مشکل یہ تھی کہ میرا جی رات کو بے حال ہو جاتے تھے۔ دن میں اِتنی شراب پی لیتے تھے کہ رات پڑنے تک اُنھیں ہوش نہیں رہتا تھا۔

بہر حال میں نے چند طالب علموں کو دن ہی میں اُن کے پاس بھیج دیا اور یہ تاکید کر دی کہ شام تک اُن کے ساتھ رہیں اور مشاعرے میں اُنھیں اپنے ہمراہ لے کر آئیں، ورنہ اُن کا کچھ ٹھیک نہیں۔

مشاعرہ رات کو آٹھ بجے شروع ہونے والا تھا۔ سات ہی بجے سے ہال کھچا کھچ بھر گیا۔ دِلّی میں عربک کالج کے مشاعرے کا لوگ سال بھر انتظار کرتے تھے۔ اور واقعی مشاعرہ ہوتا بھی بہت اچھا تھا۔ خیر تو ٹھیک آٹھ بجے مشاعرہ شروع ہوا۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب جدید شاعر پہنچے۔ اُن میں میرا جی نہیں تھے۔ میں سمجھا شاید اب وہ نہیں آئیں گے لیکن نو بجے کے قریب دیکھا کہ چند طالب علم میرا جی کو گھیرے ہوئے ہال میں داخل ہو رہے ہیں۔ میں نے اُنھیں سہارا دے کر ڈائس پر بٹھایا۔ وہ نشے میں دُھت تھے۔ اُن کی آواز نہیں نکل رہی تھی اور اپنی رَو میں یہی کہے جا رہے تھے کہ ''میں آ تو گیا ہوں لیکن پڑھوں گا نہیں۔''

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 197 (1,1)

میں نے کہا ''نظم نہ ہو سکے تو غزل ہی کے چند شعر پڑھ دیجئے۔'' چونکہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ مشاعرے میں میراجی آگئے ہیں، اِس لیے سامعین اُن کو دیکھنے اور اُن کا کلام سُننے کے مشتاق تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ صاف ستھرا باذوق لوگوں کا مجمع تھا اور دوسرے اُن دِنوں میراجی کی نظموں نے ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ مخالفین نے اور بھی ہنگامے کو ہوا دی تھی۔

جب سامعین کا اصرار بڑھا اور آوازیں آنے لگیں کہ میراجی کو پڑھوائیے تو میں نے میراجی سے درخواست کی۔ اب کے اُنھوں نے میری بات مان لی۔ میں نے اعلان کیا تو مائیکروفون پر آئے۔ خود ہی ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کچھ اپنے بارے میں کہا، اور پھر اپنی غزل کا صرف ایک شعر پڑھا اور پڑھنے کے بعد فوراً ہی ہال کے باہر چلے گئے۔ لاکھ روکا لیکن نہ رُکے۔ وہ بھلا اپنے حواس میں کب تھے کہ کسی کی بات کا خیال کرتے۔ لیکن میرا مقصد پورا ہو گیا۔ میں نے میراجی کو کئی ہزار کے مجمع میں پڑھوا دیا تھا۔ اُن میں سے ہر ایک نے میراجی کو دیکھ لیا تھا اور اُن کا کلام اُنھی کی زبانی سُن لیا تھا۔ یہ کتنی بڑی بات تھی! ورنہ کہاں میراجی اور کہاں ایک قدیم طرز کا مشاعرہ!

میں نے مشاعرے کے سلسلے میں جو خط اُنھیں بھیجا تھا، اُس کو اُنھوں نے یہ لکھ کر واپس کر دیا تھا کہ ''آپ کا کمرہ حلقہ اربابِ ذوق کا ''معبد'' بننے والا ہے۔'' چنانچہ یہی ہوا۔ اگلے ہی ہفتے سے حلقہ اربابِ ذوق کے جلسے باقاعدگی کے ساتھ ہر اتوار کو عربک کالج میں ہونے لگے۔ ان جلسوں میں میراجی سیکرٹری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جس دن جلسہ ہوتا تھا، اُس دن اُنھیں ہوش آجاتا تھا۔ ورنہ ہفتہ بھر تک وہ بے ہوش بلکہ مدہوش رہتے تھے۔ جلسے میں وقت کی پابندی سے آنا اُن کا دستور تھا۔ جلسے سے قبل سارا انتظام خود کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض دن تو یہ دیکھا گیا کہ میراجی اپنے اوپر کرسیاں لاد لاد کر لا رہے ہیں اور جس جگہ جلسہ ہوتا تھا، وہاں رکھ رہے ہیں۔ جلسے میں وہ شروع سے آخر تک بیٹھتے تھے اور جو بحث ہوتی تھی، اُس کے نوٹس لیتے جاتے تھے۔ نوٹس لینے کے سلسلے میں کہنے والوں کے منہ سے نکلی ہوئی شاید ہی کوئی بات ایسی ہوتی ہو، جس کو میراجی نہ لکھ لیتے ہوں۔ بعض دفعہ تو ایسا بھی ہوا کہ بحث کرتے ہوئے اگر بحث

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 198 (1,1)

کرنے والوں کو چھینک بھی آ گئی ہے تو اُنھوں نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اس کے بعد صاحبِ مضمون یا فلاں صاحب کو ایک زور کی چھینک آئی جس کی وجہ سے وہ رُکے اور پھر سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

جلسے کی جو کارروائی میراجی خود اپنے قلم سے لکھتے تھے وہ سُننے کے قابل ہوتی تھی۔ حلقے کے اجلاس میں گرما گرم بحثیں ہوتی تھیں لیکن میراجی خود بحث میں حصّہ کم ہی لیتے تھے۔ اِس لیے نہیں کہ وہ سیکرٹری تھے بلکہ اُن سے زیادہ بات نہیں کی جاتی تھی۔ پھر بھی کبھی کبھی بحث طلب موضوع پر ایسی بات کہتے تھے کہ جی خوش ہو جاتا تھا اور اُن کی ذہانت کی داد دینی پڑتی تھی۔ پھر اُن کے بات کہنے کا انداز بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ہوتا تھا۔ اس انداز کی وضاحت الفاظ میں مشکل ہے۔ جلسے میں جو مختلف مضامین پڑھے جاتے تھے، اور اُن پر جو بحثیں ہوتی تھیں، اُن سے وہ بڑی دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔ کسی مصنّف پر اگر مضمون پڑھا جاتا تھا تو بحث کے سلسلے میں پیش کرنے کے لیے اس مصنّف کی کتابیں یا اس سے متعلق جو مواد مل سکتا تھا وہ میراجی اپنے ساتھ لے آتے تھے۔

مجھے یاد ہے میں ایک دفعہ حلقے کے ایک جلسے میں احتشام صاحب کی تنقید نگاری پر مضمون پڑھنے والا تھا۔ جس دن مجھے مضمون پڑھنا تھا اُس دن دیکھا کہ میراجی احتشام صاحب کی کتاب تنقیدی جائزے اور چند مضامین لیے چلے آ رہے ہیں۔

میں نے پوچھا ''یہ کس لیے لے آئے؟'' کہنے لگے ''اِس سے بحث میں آسانی ہوگی، شاید ضرورت پیش آجائے۔''

حلقۂ اربابِ ذوق کے جلسوں سے یہ فائدہ ہوا کہ میراجی سے ہر اتوار کو ملاقات ہو جاتی تھی۔ لیکن جلسے کے دن اُن پر کچھ عجیب کیفیت رہتی تھی۔ وہ اُس دن اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے سے ہچکتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی مقدّس فریضے کو انجام دینے آئے ہیں اور سوائے اِس کے اُنھیں اور کسی بات کا خیال نہیں۔ یہی کام اُن کے ذہن پر مسلّط ہے اور اِس لیے وہ کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اُس دن وہ کچھ اور نہیں کرتے تھے۔ دن بھر اُنھیں یہی

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 199 (1,1)

خیال رہتا تھا کہ آج جلسے میں جانا ہے۔ چنانچہ بعض دن تو ایسا ہوا ہے کہ جلسہ پانچ بجے شروع ہونے والا ہے اور وہ تین بجے عربک کالج کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

مجھے ایک دن خود اِس کا تجربہ ہوا۔

اتوار کے دن تین بجے کے قریب کسی ضرورت سے باہر جانے کے لیے میں نیچے اُترا تو دیکھا میراجی سامنے بیٹھے ہیں۔

میں نے دیکھتے ہی کہا ''بھئی ابھی سے کیسے آ گئے؟''

کہنے لگے ''جی نہیں لگ رہا تھا، اِس لیے آ گیا۔ آج کے دن اور کوئی کام نہیں ہوتا۔''

میں نے کہا ''جلدی آ گئے تھے تو اوپر آ گئے ہوتے۔ آخر میں یہیں رہتا ہوں۔''

اور اُنھوں نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا ''کچھ خیال نہیں رہا۔ پھر یہ بھی سوچا کہ شاید اور لوگ آئے ہوں گے۔ اُن کا انتظار کرنے لگا۔''

اِس کے بعد کوئی کیا کہہ سکتا تھا؟

ہاں جلسہ شروع ہونے سے قبل اگر میراجی کے پاس پان نہیں ہوتے تھے تو وہ اجمیری دروازے کے بازار میں پان کھانے ضرور جاتے تھے۔ بغیر پان کے اُن سے بیٹھا نہیں جاتا تھا اور اِس معاملے میں وہ بڑے ہی فیاض تھے۔ بہت سے پان لے آتے تھے اور جو لوگ اُن کے پاس بیٹھے ہوتے تھے، اُن کو پان ضرور کھلاتے تھے۔ بلکہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ سارے پان میز پر رکھ دیتے تھے جس کا جی چاہے کھائے۔ میں نے تو اِسی وجہ سے جلسے میں اُن کے پاس بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔

حلقے میں میراجی کی ہر مہینے ایک نظم ضرور ہوتی تھی۔ بڑی پابندی سے وہ نظموں کی بہت سی نقلیں ٹائپ کروا کے لاتے تھے۔ بحث میں اُنھیں بڑا مزا آتا تھا۔ خود تو وہ بحث میں زیادہ حصہ نہیں لیتے تھے لیکن چاہتے تھے کہ دوسرے کھُل کر بحث کریں۔ اِس بحث کو وہ بڑے غور سے سُنتے تھے، بحث کے وقت اُن پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 200 (1,1)

اس میں کھو گئے ہیں اور جو کچھ ہو رہا ہے، اُس کو بڑی بلندی سے دیکھ رہے ہیں۔ اُس وقت اُن کی بُردباری اور خود اعتمادی دیکھنے والی ہوتی تھی۔ وہ بولتے نہیں تھے لیکن چہرے سے اس کا اظہار ہو جاتا تھا۔

بحث کے سلسلے میں ایک دفعہ بڑا لُطف رہا۔ میراجی نے جلسے میں ایک طولانی آزاد نظم پڑھی۔ ٹائپ میں پورے دو صفحوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ جب میراجی اس نظم کو پڑھ چکے تو بحث کا آغاز ہوا۔ صرف موضوع پر کوئی آدھ گھنٹے سے زیادہ بحث ہوئی لیکن نظم کے بعض پہلو واضح نہ ہو سکے۔

میں نے تجویز پیش کی کہ اب ہمیں شاعر کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ جی یہ چاہتا تھا کہ میراجی کچھ بولیں۔

چنانچہ میراجی بولے اور اُنھوں نے نظم کے کئی بندوں کی وضاحت کی۔ بہت سی باتیں ذہن نشین بھی ہو گئیں، لیکن ایک بند کی جب وہ وضاحت کرنے لگے، غالباً وہ نظم کا تیسرا بند تھا، تو میراجی کچھ اُلجھ گئے۔ تھوڑی دیر توقّف کیا اور پھر کہا کہ ''یہ بند تو شاخوں کی بھی سمجھ میں نہیں آتا اور کوئی ضروری بھی نہیں کہ سمجھ میں آئے۔''

اِس بات پر حاضرین کھلکھلا کر ہنسے۔

آج مجھے جب وہ واقعہ یاد آتا ہے تو میں سوچتا ہوں میراجی کس قدر صاف گو تھے۔ اُن کے مزاج میں کس قدر بے باکی تھی۔ خیالات کی جو لہریں بھی اُٹھتی تھیں وہ اُن کو چُھپاتے نہیں تھے، بلکہ فوراً اظہار کر دیتے تھے۔

میراجی کی ذات دلّی کے حلقے کے لیے شمعِ انجمن کی حیثیت رکھتی تھی۔ ایک تو وہ خود ہی کیا کم دلچسپ تھے۔ اُن کی شخصیت بذاتِ خود ایک انجمن تھی۔ وہ اپنے دامن میں نہ جانے کتنی محفلوں کا سوز و ساز لے کر آتے تھے اور دوسرے دن اُن کا وجود ایک ایسا ماحول پیدا کر دیتا تھا کہ ہر شخص کی طبیعت رواں ہو جاتی تھی۔ اُن کو قریب سے جاننے والے جلسے میں بیٹھے ہوئے کچھ کانا پھوسی کرتے رہتے تھے۔ اس کا موضوع میراجی اور اُن کی کوئی عجیب و غریب حرکت ہوتی۔ کبھی

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 201 (1,1)

کبھی اچھے انداز سے ایک نہ ایک پھبتی بھی کس دیتا تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ اِشاروں نے بھی اس پھبتی کا کام دیا ہے۔ لیکن میراجی خاموش رہتے تھے۔ کبھی کبھی ذہانت میں ڈوبی ہوئی کوئی بات اُن کے منہ سے نکل جاتی تھی لیکن اُنھیں بگڑنا نہیں آتا تھا۔ ناراض ہونا وہ جانتے ہی نہیں تھے۔ برخلاف اس کے ایسا موقع جب کبھی بھی آتا تو اُن کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کھیلنے لگتی تھی۔ جیسے اُن کی نظریں کچھ کہنا چاہتی ہوں لیکن وہ جان کر کچھ کہنا نہ چاہتے ہوں۔ کس قدر معنویت ہوتی تھی اُن کے ان اشاروں میں۔ شوخی کی چمک بھی مجھے میراجی کی آنکھوں میں ایسے ہی موقعوں پر نظر آئی۔ اُن کی آنکھوں کی حرکت سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے دُور کہیں جگنو چمک رہے ہوں۔

دہلی کے دورانِ قیام میں ایک دفعہ بڑا ہی دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ لاہور میں ایک صاحبہ تھیں۔ اُنھوں نے اتفاق سے ریڈیو پر کوئی تقریر کی۔ میراجی ان صاحبہ سے نسبت رکھتے تھے اور اُن کی محبت کا دم بھرتے تھے۔ یار لوگوں کو بھی اس کا علم تھا۔ تقریر ہوئی تو اس بہانے اُن کی تصویر چھاپنے کی فکر کی گئی۔ بھلا اُنھیں کیا اعتراض ہوسکتا تھا؟ ریڈیو کے ہر شعبے میں سب اپنے ہی لوگ تھے۔ چنانچہ یہ تصویر ''اِنڈین لسنر'' کے سرورق پر چھاپ دی گئی۔ سارے شہر میں دھوم مچ گئی۔ اس تصویر کی اصل کاپی کسی نہ کسی طرح دفتر سے حاصل کرلی گئی۔ اور وہ دلّی کے ادبی حلقوں میں موضوعِ بحث بنی رہی۔ شاید ہی کوئی میراجی کی ذات سے دلچسپی لینے والا ایسا ہو جس نے اُس تصویر کو نہ دیکھا ہو۔ اور دو ایک روز محض خوش گپیوں کی خاطر اپنے پاس نہ رکھا ہو۔ جو سنتا تھا وہ اس کی زیارت کے لیے دوڑا آتا تھا۔ ہفتوں وہ تصویر اسی طرح گردش کرتی رہی اور اس پر طبع آزمائیاں ہوتی رہیں۔ میراجی کو دکھا کر اور سُنا کر ایسا کیا جاتا تھا بلکہ یہی تو اس کا دلچسپ پہلو تھا۔

میراجی اس پر بہت جز بز ہوتے تھے۔ جیسے اُن کی رُسوائی ہو رہی ہو لیکن اس رُسوائی میں بھی وہ خوش تھے۔ یہ رُسوائی بھی اُنھیں اپنے لیے معراج نظر آتی تھی۔

بہت سے لوگ جمع ہوں تو میراجی کھُلتے۔ بہت کم تھے۔ اُن کو جاننے اور سمجھنے کے لیے، اُن سے ہنسنے اور بولنے کے لیے، بحث اور تبادلۂ خیال کرنے کے لیے تنہائی اور سکون کی شرطیں

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 202 (1,1)

لازمی تھیں۔ ہنگامے میں وہ دیکھنے کی چیز ہوتے تھے، ملنے اور بات کرنے کی نہیں۔ جب بہت سے لوگ جمع ہوں تو اُن کی حالت دیکھنے والی ہوتی تھی۔ ہر بات کا ردِّعمل اُن کے چہرے پر دیکھا جا سکتا تھا۔ چنانچہ مجمع میں تو مَیں اُنھیں صرف دیکھا کرتا تھا اور دیکھ کر لطف لیا کرتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر وہ مطالعے کی چیز بن جاتے تھے۔ اُن کے سامنے جتنی باتیں بھی ہوتی تھیں، اُن سب کے ملے جُلے اثرات کا عکس اُن کے چہرے پر جھلکتا تھا۔ اُن کی حرکات و سکنات میں نظر آتا تھا۔ جب اُن سے گفتگو کرنا ہوتی، جب یہ جی چاہتا کہ میراجی باتیں کریں تو اُنھیں تنہا ہی گھیرنا پڑتا۔ کیونکہ ویسے وہ بڑی مشکل سے ہتھے چڑھتے تھے۔ لین جب اِس طرح مل جاتے تو اُن سے خوب باتیں ہوتیں۔ وہ اپنے آپ کو پوری طرح نمایاں کر دیتے تھے۔ چنانچہ ایسی ملاقاتیں اُن سے مُتعدّد بار ہوئیں۔ شاید ہی زندگی اور شعر و ادب کا کوئی موضوع ایسا ہو جس پر ہم نے اُن ملاقاتوں میں تبادلۂ خیال نہ کیا ہو۔ میراجی ان تمام موضوعات پر اپنی ایک رائے رکھتے تھے۔ اُن سے اختلاف کیا جا سکتا تھا لیکن اُن کے خلوص میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی۔ بہت سے مسائل پر میرے ان کے درمیان اختلافات تھے لیکن میں اُن کی عزّت کرتا تھا۔ کیونکہ جو رائیں اُنھوں نے قائم کی تھی وہ خلوص پر مبنی تھیں۔

ان صحبتوں میں جو دلچسپیاں تھیں اُن کا کیا کہنا۔ لیکن ان سب پر اوس پڑ گئی۔ جب ایک سال میں نے موسمِ گرما کی تعطیلات کے بعد دِلّی آ کر یہ سُنا کہ میراجی نے دِلّی چھوڑ دی اور وہ بمبئی چلے گئے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بمبئی میں وہ کسی فلم کمپنی کے لیے گیت لکھیں گے۔ پھر اُن کے بارے میں طرح طرح کی خبریں مشہور ہوتی رہیں، مثلاً یہ کہ مکالمے اور گیت تو خیر وہ لکھتے ہی ہیں لیکن اُنھیں پروڈیوسر بننے کا بھی موقع مل گیا ہے۔ میراجی کے پاس بہت روپیہ ہے۔ وہ اب اچھی سے اچھی شراب پینے لگے ہیں۔

خیر یہ سب باتیں تو سمجھ میں آتی تھیں لیکن ایک خبر ایسی مشہور ہوئی جس پر یقین نہیں آتا تھا۔ وہ یہ تھی کہ میراجی نے کئی شاندار سوٹ سلوا لیے ہیں اور بمبئی کے بازاروں میں سوٹ پہنے

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 203 (1,1)

پھرتے ہیں۔اس کی توقع اُن سے نہیں تھی کیونکہ لباس کے معاملے میں وہ حد درجہ لاپرواواقع ہوئے تھے۔شاید وہ اچھے کپڑوں کو بھی خراب کر کے پہنتے تھے۔صاف ستھرے کپڑوں کو بھی غالباً وہ پہننے سے قبل میلا کرلیا کرتے تھے۔اِس لیے سلک کے سوٹ کی جب خبر آئی تو سب کو بہت تعجب ہوا۔لیکن خیر اِس کی مٹی جلد ہی پلید ہوگئی ہوگی۔آخر سلک میراجی کا ساتھ کب تک دے سکتی تھی؟

میراجی کے بمبئی جانے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ہندوستان کی تقسیم ہوئی اور پاکستان بن گیا لیکن ہر طرف ہنگامے شروع ہوئے۔خصوصًا ہندوستان میں ذہنی سکون تو باقی ہی نہیں رہا۔ جانیں تو بچ گئیں لیکن حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ ایک کو دوسرے کی خبر ہی نہیں رہی۔

میراجی اُن دِنوں بمبئی ہی میں تھے لیکن اب اُن کی خیر خبر بھی کم ہی ملتی تھی۔اِتنا معلوم تھا کہ وہ فلم ہی کے سلسلے میں کہیں ہیں اور وہ بمبئی سے کہیں اور جانا نہیں چاہتے۔کچھ عرصے بعد بمبئی سے اُن کا رسالہ ''خیال'' میرے پاس آنا شروع ہوا اور پھر میراجی اور اختر الایمان کے خطوط بھی اِس سلسلے میں آئے۔خط وکتابت کا سلسلہ تھوڑے ہی دن باقی رہا۔میں بعض مصروفیتوں اور اُلجھنوں کی وجہ سے ''خیال'' کے لیے کوئی مضمون نہ لکھ سکا۔

اور پھر میراجی نے خط لکھنا چھوڑ دیا۔لیکن یہ مجھے معلوم ہے کہ وہ ناراض نہیں ہوئے تھے۔دوسرے کی طرف سے بُرائی اُن کے دل میں بہت ہی کم آتی تھی۔

اور پھر ایک دن مجھے اخبارات سے یہ اطلاع ملی کہ میراجی اِس دُنیا سے چل بسے۔ پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔میں کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میراجی اِتنی جلدی چلے جائیں گے۔غموں نے اُنھیں مار ڈالا۔وہ رنج والم اور درد وکرب کا مجسمہ تھے۔اُنھیں زندگی کی کوئی منزل بھی راس نہیں آئی۔وہ زندگی بھر تڑپتے اور تِلملاتے رہے اور بالآخر اُنھوں نے تڑپ تڑپ کر اپنی جان دے دی۔جس طرح وہ مرے اس کی نوعیت اُن کی زندگی سے بھی زیادہ افسوسناک ہے۔ اُنھوں نے ایک ہسپتال میں جان دی۔اُن کا اپنا عزیز کوئی بھی اُن کے پاس موجود نہیں تھا۔ صرف دو ایک دوست تھے۔مرنے سے قبل اُن کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔جو کچھ تھوڑا بہت کیا

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 204 (1,1)

وہ دوستوں نے کیا،لیکن اس پُر آشوب زمانے میں وہ بھی بیچارے جیسا کرنا چاہتے ویسا نہیں کر سکتے تھے۔ بہر حال میراجی مر گئے۔ بہت افسوس ہے کہ میراجی مر گئے۔میراجی بُری حالت میں مرے۔اس کا بھی بہت افسوس ہے۔لیکن سب سے بڑا افسوس اِس بات کا ہے کہ میراجی کے ساتھ ایک دُنیا ختم ہوگئی۔ایک مخصوص رُجحان ختم ہوگیا۔ایک انداز ختم ہوگیا۔ایک اِرادہ ختم ہوگیا۔ایک تحریک ختم ہوگئی۔کیونکہ اُن کی شخصیت ایک دُنیا،ایک رُجحان،ایک تحریک کی حیثیت رکھتی تھی۔

میں میراجی کی بڑائی کا قائل تھا، باوجود اِس کے کہ میرے اور اُن کے درمیان نظریاتی اختلافات کی خلیج حائل تھی۔میں آج بھی اُن کی بڑائی کا قائل ہوں حالانکہ اُن کے فلسفۂ زندگی اور زاویۂ نظر سے نظریاتی اختلاف مجھے آج بھی ہے۔لیکن اس کے باوجود ان کے ایک بڑے شاعر اور نقاد ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

اِسی وجہ سے مجھے رہ رہ کر یہ خیال آتا ہے کہ میراجی مرجانے کے باوجود مرے نہیں۔وہ زندہ ہیں کیونکہ اُنھوں نے اُردو شاعری کو ایک نیا آہنگ دیا ہے۔نئی تکنیک دی ہے۔نئے موضوعات سے اس کو روشناس کیا ہے۔اُنھوں نے ہندی کی مدھر بحریں اپنائی ہیں۔ہندی کی شیرینی اور گھلاوٹ کو اُردو کے قالب میں ڈھالا ہے یا اُردو کو ہندی کی شیرینی اور گھلاوٹ کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔معنوی اعتبار سے بھی اُن کی شاعری میں ہندی کے اثرات نظر آتے ہیں۔اوران کی اسی خصوصیت نے اُنھیں اِس رُجحان کے سلسلے کی دوسری کڑی بنا دیا ہے جس کے علم بردار عظمت اللہ خان تھے اور جن کے سُریلے بول آج بھی ہمارے کانوں میں گونجتے ہیں۔فرق یہ ہے کہ عظمت اللہ خان کے موضوعات محدود تھے۔میراجی ان موضوعات سے بہت آگے بڑھے ہیں۔اُنھوں نے اپنے دامن کو وسیع کیا ہے۔اُن کی شاعری کا ایک اہم موضوع، زندگی ہے،اور زندگی کے جنسی پہلو پر وہ خوب لکھتے ہیں۔لیکن زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو بھی اُنھوں نے نظر انداز نہیں کیا ہے۔اُن کے یہاں کچھ اُلجھنیں ضرور ہیں،بعض ایسی باتیں بھی ہیں جن کو سراہا نہیں جاسکتا لیکن اس کے باوجود مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو اُن کی شاعری اپنی

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 205 (1,1)

جگہ ایک مُنفرد حیثیت رکھتی ہے۔ اُن پر فرانسیسی تمثیل نگاروں میں سے میلارمی، رمبو اور باودیلیر کے اثرات بڑے گہرے تھے۔ چنانچہ اُن کی شاعری میں نئی اشاریت اور نئی تمثیل نگاری کا استعمال قدم قدم پر پڑھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ تمثیل نگاری اُنھیں ابہام کی طرف بھی لے جاتی ہے لیکن اِس سلسلے میں بھی اُنھوں نے ایک نئی آن اور نئی شان کو اپنی شاعری میں پیدا کیا ہے۔ اُنھوں نے آزاد نظمیں لکھی ہیں۔ پابند نظمیں لکھی ہیں۔ گیت لکھے ہیں، غزلیں لکھی ہیں اور ان سب میں اُن کا ایک مخصوص رنگ جھلکتا ہے۔ رطب و یابس ان سب میں ہے لیکن ان سب کا انتخاب اُردو میں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہنے کے لیے ہے۔ اسے کون مٹا سکتا ہے؟

اور پھر اُن کی نثر، اور خصوصیت کے ساتھ اُن کی تنقید بھی کسی کم مرتبے کی مالک نہیں۔ میراجی کے قلم میں بڑی روانی تھی۔ وہ بڑی سادہ اور رواں نثر لکھتے تھے۔ اُن کی نثر میں رنگینی نہیں ہوتی تھی لیکن اُن کی سادگی ہی میں ایک پُرکاری تھی۔ تنقید میں اُن کی نگاہیں دُور تک پہنچتی تھیں۔ شعر فہمی گویا اُن کی گھٹی میں پڑی تھی اور اِس خصوصیت نے اُن کے تنقیدی شعور کی نشو و نما میں بڑا حصہ لیا تھا۔ وہ تنقید میں نفسیات کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اور خصوصاً تحتِ شعور کے مسائل کی روشنی میں کسی تخلیق پر قلم اُٹھانا اُن کی سب سے نمایاں خصوصیت تھی۔ اِس لحاظ سے اُنھوں نے اُردو تنقید میں بھی ایک اضافہ کیا۔ ہر چند وہ اِس سلسلے میں کچھ زیادہ کام نہ کر سکے لیکن پھر بھی اُنھوں نے ایک ایسا چراغ روشن کیا جس کی روشنی سے آئندہ اور چراغ جلتے رہیں گے۔ میراجی کا زاویۂ نظر تجزیاتی بھی ہوتا تھا اور تاثراتی بھی۔

میراجی کی موت کا خیال مجھے جب بھی آتا ہے، اُن کی نظموں اور گیتوں کی یہ خصوصیات اُن کی تنقید کا یہ انداز اور نثر کی یہ صفات میری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہیں۔ اور وہ مجھ سے کہتی ہیں گویا مجھے یقین دلاتی ہیں کہ میراجی مرے نہیں، وہ مر نہیں سکتے۔ وہ تو ہمارے ساتھ زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 206 (1,1)

عصمت چغتائی

سُوکھے پتے رمیراجی

گھنٹی بجی، نوکر سودا لینے گیا تھا، میں نے دروازہ کھولا، ایک میلا کچیلا بدبودار انسان دو سیڑھیاں چڑھ کر ٹھٹھک گیا، مجھے دیکھ کر وہ بُری طرح خوف زدہ ہوگیا، اُس کی پتلی پتلی ٹانگیں کانپنے لگیں، مُنہ کھُلا مگر آواز نہ نکلی، جیسے اُس نے ایک دم کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

''آئیے اوپر آجائیے۔'' میں نے کہا۔

اُس کی پیشانی پر پسینہ پھوٹ نکلا، بغل میں دبی ہوئی فائل لرزتے ہاتھوں سے چھوٹ پڑی، منہ، سانس لینے کے لیے کھولا، لب پھڑپھڑائے، فائل اُٹھانے کو جُھکا، تو ہاتھ سے دو لوہے کے گولے چھوٹ کر سیڑھیوں سے لڑھک گئے۔ اُس نے پھر زخمی کبوتر کی طرح مجھے سہم کر دیکھا، جلدی سے فائل سمیٹی۔ کاغذ اُلٹے سیدھے ٹھونسے اور گولے سمیٹنے لگا۔ ایک سسکی سی اُس کے مُنہ سے نکلی اور وہ جلدی جلدی سیڑھیاں پھلانگ کر سرپٹ بھاگا۔

''نجانے کون مسخرا ہے'' میں بالکنی سے اُسے پھاٹک کی طرف لپکتا دیکھتی رہی۔ کچھ بھورے بھورے سے کپڑے، سُرخی کی جھلک لیے لمبے گندے بال، بڑے بڑے ڈھیلے بے موزوں ربڑ کے جوتے، خپ خپ دھول میں اٹی پھٹی ہوئی ایڑیاں، دُور تک دِکھائی دیتی رہیں۔ پھر وہ دفتری روڈ پر لپک گیا۔

شاہد اسٹوڈیو سے لوٹے تو اُن کے ساتھ منٹو بھی تھے۔ میں نے اجنبی کا حُلیہ بتایا تو منٹو فوراً بولے: ''ارے میراجی ہوگا۔''

''ارے ہاں، آج اتوار ہے نا، میں نے اُن سے ملنے کا وعدہ کیا تھا، کم بخت مکرجی نے

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 207 (1,1)

آج شوٹنگ رکھ دی، کیا کہتے تھے؟''

''اچھا، تو کچھ کہتے بھی ہیں؟ وہ تو مجھے دیکھ کر ایسے رپٹے کہ جیسے میں اُنھیں ڈکار ہی جاؤں گی۔''

''تمھارے اکھڑپن سے گھبرا گیا ہوگا۔''

''لو بھلا، اتنے چمرخ چوہے پر میں کیا اکھڑپن کا رُعب جماتی۔ مجھے تو بے چارے پر بڑا ترس آیا۔''

''یار، بے چارے پر ترس تو مجھے بھی آتا ہے، بڑی بُری حالت ہے، مکرجی سے کہا تو ہے کہ اسکرپٹ ڈپارٹمنٹ میں رکھ لو، بڑا اچھا ادیب ہے، شاعر بھی ہے۔''

''بکواس!'' منٹو جھلّا یا۔ ''بس سالی میرا سین کا رونا روتا ہے۔''

''میلا بہت رہتا ہے'' میں نے بے چارگی سے کہا۔ ''نہ جانے کیوں بچپن میں مجھے ہمیشہ سڑک پر گھومتے میلے کچیلے یتیم پلّوں کو نل کے نیچے نہلانے پر مار پڑتی تھی۔

میرا جی چاہا کہ ایک بڑے سے ٹب میں میرا جی کو بل باتھ دوں۔ بال صفا چٹ۔ نہیں بال تو اُس کے بڑے گھنے ہیں اور دُھل کر کافی اچھے لگیں گے۔ ذرا سے چھانٹ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اونچے نیچے ہیں، بڑھا ہوا شیونائی کو بلوا کر بنوایا جا سکتا ہے اور اگر وہ نچلا بیٹھنے کو تیار ہو تو شاہد کے سیفٹی ریزر سے شیو بھی بن سکتا ہے۔''

آج نہ میرا جی ہیں، نہ منٹو اور نہ شاہد لطیف، مگر کچھ تصویریں ہیں جو دماغ کے البم میں چپکی رہ گئی ہیں۔ مجھے میرا جی کی شاعری کچھ زیادہ پسند نہ تھی۔ اصل میں ہمارے خاندان میں شاعری کو ہیجڑوں کا فن کہا جاتا تھا۔ پھر میں نے جب شاعری میں دلچسپی لینی شروع کی تو اپنے بزرگوں کی جہالت پر بڑا افسوس ہوا۔ مجاز پہلا شاعر تھا جسے میں نے سمجھا اور پسند کیا تھا۔ اور پھر جگر صاحب اور جوش صاحب پر دِل آ گیا۔ اپنے خاندان میں شاید میں ہی پہلی فرد تھی جس نے شاعری میں اچانک غیر معمولی دلچسپی لینی شروع کر دی تھی، مگر میرا جی تو میرے پلے ہی نہیں پڑتے تھے۔ اُن کی

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 208 (1,1)

شاعری نہایت روہانسی اور کچھ مرگھلّی سی لگتی تھی، یہ میری جہالت ہی ہوگی، کیونکہ نئے شاعر تو اُنھیں پیرومرشد مانتے ہیں۔

میراجی سے میری دوسری ملاقات ایک فلمی دعوت میں ہوئی۔ وہ بھیڑ میں کچھ اکیلے سے بھٹک رہے تھے، میں نے اب تک اُن کی آواز نہیں سُنی تھی وہ کسی سے بات بھی نہیں کر رہے تھے۔ بڑے انہماک سے پی رہے تھے اور جلدی جلدی گلاس تازہ کر رہے تھے۔

پھر میں نے دیکھا وہ ایک صوفے کے کونے پر تنہا بیٹھے تھے۔ میں ایک دم سے جا کر اُن کے قریب بیٹھ گئی۔ وہ ایسے اُچھلے جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ مگر میں نے کہا:

''بھاگنے کی کوشش مت کیجیے گا، ورنہ ہاتھ پکڑلوں گی اور آپ چھڑا نہیں پائیں گے۔''

وہ چپ چاپ زمین کو گھورنے لگے۔

''اور سب کہیں گے کہ بدنام زمانہ ادیبہ نے بھری سبھا میں میراجی کا ہاتھ پکڑ لیا، بڑا مذاق اُڑے گا۔ میرا کچھ نہیں بگڑے گا، مگر آپ بدنام ہو جائیں گے۔''۔۔۔۔۔ وہ کچھ نہیں بولے۔

جی چاہا پوچھوں ''کس صدی میں غسل میّت فرمایا تھا؟'' مگر مجھے یقین تھا کہ وہ زخمی کبوتر کی طرح تھرتھرا کر رہ جائیں گے۔ منہ توڑ جواب ہرگز نہ دیں گے، وہ بڑے معصوم، دُکھی اور غم کے مارے انسان ہیں، نہتّے پروار کرنا بُزدلی ہے، اُنھیں یوں بیٹھنے پر مجبور کرنا بھی میری طبعی سادگی کا ثبوت ہے۔

وہ بڑی تیزی سے مٹھی میں جکڑے ہوئے لوہے کے گولے مسل رہے تھے۔ یقیناً تخیّل میں وہ مجھے پیس رہے تھے اور میں جُثّے میں اُن سے کئی گُنا زیادہ صحیح سالم ذرا سی دھمکی کے سہارے اُنھیں قید کیے بیٹھی تھی۔

وہ دُور نجانے کہاں دیکھ رہے تھے، میں اُنھیں سر سے پیر تک ناپ تول رہی تھی۔ نہایت سبک نقشہ، حسّاس نازک ہونٹ جو بار بار تر ہونے کے باوجود خشک تھے۔ نازک بدن، نرم نرم آنکھیں، جن میں ان جانے کرب کا زہر، کرب جو نئی پود کو وہ ورثہ میں سونپ گئے۔

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 209 (1,1)

''یقیناً انھیں ماں کا دُودھ نہیں مِلا۔'' میں نے سوچا، اور اُن کے والد بے حد جھلّے مزاج کے ہوں گے۔ یہ شخص بازی گر نہیں ہوسکتا۔ یہ ڈھونگ نہیں، کبھی کسی نے انھیں لوری دے کر تھپک تھپک کر چھاتی پر نہیں سلایا۔ ان کے اشعار سنپولیوں کی طرح ان کے رُوئیں رُوئیں سے میں اُلجھے ہوئے تھے، رینگ رہے تھے۔ میرا جی مجسم اپنی شاعری لگ رہے تھے۔ میری محدود عقل کے پیمانے سے!

پھر مجھے بیل باتھ کی یاد ستانے لگی۔

کیا کبھی ماں نے گھٹنوں پر لٹا کے تیل کی نرم گرم مالش کی ہوگی؟ ننھے ننھے ہاتھ پیر بین مل کر دھلائے ہوں گے، ان ہونٹوں پہ دُودھ کی دھاریں ہیں تو پھر یہ خشک کیوں ہو جاتے ہیں، بار بار۔

کیا میرا سین نے اِن لبوں کو کبھی خوابوں میں بھی نہیں چوما۔ پھر کیوں سوکھے پتوں کی طرح لرزاں ہیں۔

یا ایک ہی بوسے میں سارا رس چوس لیا اور پھوک تھوک دیا۔

کتنے سوالات میرے دماغ میں طوفان مچا رہے تھے، مگر میں چُپ تھی کہ کہیں یہ ہوا تپا واہمے سے مشابہہ پرچھائیں جس پر زندہ انسان ہونے کا الزام ہے، دِیے کی لَو کی طرح لپت نہ ہو جائے اور اپنے پیچھے صوفے پر سوکھتے پتوں کا ڈھیر چھوڑ جائے۔ پھر تو لوگ مجھے میڈوسا کا خطاب دیں گے۔ وہ بلا جس کے سر پر بالوں کی جگہ سانپ پھنکارتے تھے اور جس پر نظر ڈالتے ہی انسان پتھر بن جاتا تھا۔

ویسے بھی لاہور کے مقدمے کو زیادہ دن نہیں بیتے تھے۔ لوگ میری طرف ایسے دیکھتے تھے، جیسے اُن کے اور میرے درمیان جیل کی آہنی سلاخیں ہیں، جو غیر مرئی ہوتے ہوئے بھی خاصی ٹھوس ہیں۔

''آپ کچھ کھاتے نہیں، بس یکساں پیئے جا رہے ہیں۔'' میں نے سوچا، جو ہوگا سو دیکھا

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 210 (1,1)

جائے گا، حملہ کر ہی دیا۔

وہ ایسے کسمسائے جیسے میں نے اُٹھا کر اُنھیں جلتے توے پر بٹھا دیا ہو۔ اس سے پہلے کہ وہ بھاگ کھڑے ہوتے، میں نے کہا:

''میرا جی! آپ کو ہاتھ دیکھنا آتا ہے، میں نے سُنا ہے آپ کو علمِ نجوم سے بڑی دلچسپی ہے۔'' میں نے اِس قسم کی کوئی بات اُن کے بارے میں نہیں سُنی تھی۔ میں نے اُن کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا اور نادانستہ طور پر اُنھوں نے میری ہتھیلی پر نظر ڈال ہی دی۔

میرے دم میں دم آیا کہ شے میں جان ہے، زندگی کی رمق ہے۔

''کچھ زیادہ نہیں'' وہ بولے اور مجھے ایسے لگا، میں نے گنگا نہالی۔۔۔۔ وہ بول دیے۔

''نجومی نے کہا تھا میرے ہاتھ میں ولایت کا سفر ہے۔'' اور جواب سُننے سے پہلے ہی اُن کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔۔۔ ''آپ کی لائف لائن تو بہت لمبی ہے۔۔۔ قیامت کے بوریے سمیٹیں گے۔''

''کون سی لائف لائن؟'' وہ واقعی شیشے میں اُتر آئے، جب میں بی ایڈ کے لیے بچوں کی کلاس لیا کرتی تھی تو بچوں کو ہینڈل کرنے کے خانے میں سب سے زیادہ نمبر ملا کرتے تھے۔

''یہ۔۔۔ یا شاید۔۔۔۔ یہ۔۔۔'' میں نے ہوائی چھوڑی۔ ''بہت دن ہو گئے کیرو کی کتاب دیکھی تھی۔''

''کھولی بھی تھی؟''

ارے، یہ تو ڈنک مارتا ہے!

''ایمان سے پڑھی تھی، ٹھیک سے لائنیں یاد نہیں رہیں، مگر میں ہمیشہ سب سے صاف سیدھی اور لمبی لائن کو ہی لائف لائن سمجھتی ہوں۔ یہ دیکھیے میرے ہاتھ میں، یہ والی لکیر سب سے تگڑی ہے مگر آپ کے ہاتھ میں یہ دوسری والی بہت صاف اور سیدھی ہے۔۔۔ آپ بہت جیئیں گے۔۔ مجھے جینے کا خبط ہے۔۔۔۔''

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 211 (1,1)

تب وہ سوکھے ہوئے حساس ہونٹ یوں ہی ذرا سے ہلے، شاید وہ اس سے زیادہ بڑا ڈگ نہیں بھر سکتے تھے۔ اور یہ وہ اکلوتی مسکراہٹ ہوگی جس کے درشن میرے نصیب میں لکھے تھے۔

''یہ لوہے کے گولے آپ کیوں مسلتے رہتے ہیں؟'' میں نے چہرے پر نہایت احمقانہ تاثر طاری کر کے کہا۔ بے وقوف عورتیں مردوں کو زیادہ دل چسپ لگتی ہیں، معصوم اور بھولی۔ اگر مردانگی کو جلا بخشنی ہو تو ہوشیار اور عقل مند خواتین کو چاہیے احمق بن کر نہایت بچگانہ سوال کریں، کیسا بھی مرگھلا، گیا گزرا مرد ہو فوراً سینہ سپر ہو جائے گا اور وقتِ ضرورت آگ میں بھی کود پڑے گا۔

مگر ذہنی طور پر میرا جی مرگھلے قطعی نہ تھے، وہ پھر دُور خلا میں گھورنے لگے۔ اُن کا گلاس بھی خالی ہو رہا تھا اور انجام کے خوف سے روح فنا ہو رہی تھی۔ میں نے فوراً ایک گزرتے ہوئے بیرے کو بلایا۔ دو گلاس اُٹھائے اور سوڈے کی بوتل میز پہ رکھوالی۔

میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ آج تُو نہیں کہ مَیں نہیں۔ میں نے دو گلاسوں کا ایک بنایا اور اس میں سوڈا انڈیل دیا۔ ''یہ لیٹ گیا تو میری بلا سے، مجھے تھوڑی بٹورنا پڑے گا۔'' میں نے سوچا۔

''یہ گولے!'' اُنھوں نے مٹھی کھول کر میرے سامنے کی اور دوسرے ہاتھ سے گلاس دبوچ لیا۔

''جی۔۔۔'' میں نے رشوت کا پھل سمیٹنے کے انداز میں لقمہ دیا۔

''یہ لوہے کہ ہیں۔۔۔''

''جی ہاں، وہ تو ہیں ہی۔'' میں بُجھ گئی، غنیم غچہ دے گیا۔۔۔!

''جب میری مٹھی میں ہوتے ہیں۔''

''جی!'' بڑی فرماں بردار مشرقی خاتون کے لہجے میں کہا۔

''جب میری مٹھی میں ہوتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے دونوں جہاں میرے قبضہ میں ہیں۔''

''دِکھائیے۔ ذرا دیکھوں کتنے بھاری ہیں۔''

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 212 (1,1)

''اِن کا بوجھ خدا آپ پر نہ ڈالے۔ آپ کے ہاتھ بہت نازک ہیں!'' حالانکہ میرے ہاتھ اُن کے ہاتھوں سے چاول بھر لمبے ہی ہوں گے۔ مگر میں سمجھ گئی کہ اُن کا اِشارہ ہاتھوں کی طرف نہیں، میری قوتِ برداشت کی طرف ہے۔

''مَیں تو یہ گولے دُنیا کی کھوپڑی پر پٹخ دیتی۔''

''یقیناً مجھے یہی یقین ہے۔''

ہم سب سے الگ بیٹھے تھے۔ ایک دم میں نے محسوس کیا بہت سی آنکھیں عجوبہ سمجھ رہی ہیں۔ جیسے سانپ اور نیولے کی لڑائی ہو رہی ہو۔

ایک دم شیام لمبے لمبے ڈگ بھرتا لپکا اور آتے ہی کسی قطعی بے بنیاد بات پر لڑنے لگا۔ اسکرین پر شیام رومانٹک سین بے حد مرے مرے کرتا تھا لیکن دھڑام دھڑام میں اُس کا جواب نہیں تھا۔

''اُدھر جوش صاحب اپنا کلام سنانے جا رہے ہیں اور تم یہاں بیٹھی ہو۔ حد ہے بدمذاقی کی۔

''بھئی جوش صاحب کا کلام سمجھنے کے لیے ہر تیسرے لفظ پر ڈکشنری دیکھنی پڑتی ہے۔ میں۔۔۔''

''اچھا بکواس نہ کرو۔'' اُس نے ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنے کی دھمکی دی، مگر جلدی سے کھڑی ہو گئی، مُڑ کر دیکھا، میرا جی پھُر! دُور دُور نام و نشان نہ تھا۔ میں نے چھت کی طرف دیکھا کوئی سوراخ نہ تھا۔ در و دیوار بھی سلامت تھے۔

وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

دیئے کی لَو لپت گئی اور صوفے پر سوکھے پتوں کا ڈھیر بھی نہ چھوڑا۔

''میں کہتا ہوں کرشن کا ''اَن داتا'' ماسٹر پیس ہے۔۔۔''

''بکواس!'' منٹو نے مُنہ میں کونین گھول کر کہا۔

میرا جی سے پھر میری ملاقات کبھی نہیں ہوئی، کئی برس گزر گئے، جب ہم شیواجی پارک

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 213 (1,1)

میں رہتے تھے، تو ایک دن ایک خط ملا۔ میں بڑی پھوہڑ ہوں۔ اُف! میں نے کیسے کیسے خط نہ جانے کہاں کھو دیے، میں نے نہیں کھوئے، میرے ایک بد ذات نوکر نے میرے کاغذوں کا صندوق صاف کیا اور سب ردی میں بیچ دیے، میں اُن دِنوں اسپتال میں تھی۔ اس صندوق میں اُس نے شاہد کے کپڑے، جوتے، میری ساڑھیاں اور چپلیں، فلموں کے ریکارڈ مع ریکارڈ پلیئر اور شینیل نمبر 5 کی لبالب بھری بوتل اور نہ جانے کیا کیا بھرا اور غائب ہو گیا۔ خدا اُسے سمجھے۔

اُس ردّی میں مجاز کا رانچی سینی ٹوریم سے آیا ہوا ایک تاریخی خط تھا، جس میں اُنھوں نے لکھا تھا کہ ''خدا کا واسطہ، مجھ سے شادی کر لو، ورنہ مجھے کچھ ہو گیا تو خون تمھاری گردن پہ ہو گا۔''

میں نے بے حد غصہ میں جواب دیا تھا ''تمھاری ایسی کی تیسی، میں کوئی کیلشیم کا انجکشن یا وٹامن کی گولی ہوں، شوق سے مر جاؤ۔۔۔۔ پھوٹے منہ سے اِتنا لکھ دیتے ''تم سے پیار ہے'' تو۔۔۔۔ خیر!

اور ایک خط میراجی کا تھا جس میں اُنھوں نے بڑی لجاجت سے لکھا تھا ''خدا کا واسطہ، میری شادی کروا دیجیے، بھنگن ہو، چماری ہو، بس عورت ہو۔''

خط پڑھ کر میں نے سوچا، خیر، اتنا تو میں بھی جانتی ہوں، کہ میراجی کی شادی عورت ہی سے کرا سکتی ہوں، کسی پہلوان یا مخنّث سے تو نہیں کرا سکتی۔ اِتنی عقل تو مجھے اللہ نے دے دی ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ بمبئی میں بھنگنیں ہی نہیں ہوتیں۔ یہ رومانٹک جنس تو یوپی اور پنجاب میں ہی پائی جاتی ہے۔ رہی چماری تو آس پاس کوئی چمرواڑی نہیں دِکھائی دیتی۔ بڑا پوش ایریا ہے، زیادہ تر فلمی ایکسٹراؤں سے پالا پڑتا ہے اور وہ شادی کے نام ہی سے بدکتی ہیں۔ مرد ذات نے اِتنی چک پھیریاں دی ہیں کہ شادی سے زیادہ اپنا رول بڑھوانے اور ہو سکے تو ایک آدھ ڈانس ڈلوانے میں زیادہ دلچسپی لیتی ہیں۔۔۔۔ نہ میں نے جواب دیا نہ اُن کا ریمائنڈر آیا۔ میراجی کے پھر درشن نہ ہو پائے۔۔۔۔ شاید وہ پونا سے چلے گئے۔ بمبئی کی زندگی اِتنی سرپٹ دوڑتی ہے کہ ہوش نہیں رہتا۔

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 214 (1,1)

کبھی میٹنگ میں میرا جی کی شاعری پر جملے بازی ہوتی، میں کبھی اس مباحثے میں ڈوب کر حصہ نہ لے سکی۔ اوّل تو شاعری کی گہرائیاں میرے پلّے نہیں پڑتیں۔۔۔۔ بس جی کو چھوتی ہے تو اچھی لگتی ہے۔ دوسرے اُن دِنوں ترقی پسند ننگی تلوار ہو رہے تھے۔ بے حد زور و شور سے انقلاب لایا جا رہا تھا۔ کوئی ذرا بھی اِدھر سے اُدھر کھسکتا نظر آتا، اُس کے فوراً مچلکے لے لیے جاتے۔ میں جو زندگی کو عموماً ایک دل چسپ ہنگامہ سمجھنے کی عادی تھی، ہر جارحانہ قدم بے حد اہم اور چٹپٹا نظر آتا تھا۔ زیادہ سنجیدگی سے نہیں، پھر بھی کافی جوش و خروش سے ہر اُلٹے قدم سے قدم ملا کر چلنے میں پیش پیش رہنے کی عادی تھی۔

غلطی کرنے سے خوف کھانا مجھے کبھی نہ آیا۔ ارے بھئی، غلطی ہوگئی تو کون سا اندھیر ہوگیا۔ گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں۔

میرا جی کو نظر انداز کیا گیا، بلکہ غیر ترقی پسند بھی سمجھا، تو پھر؟ سمجھنے والے کی عقل پر شُبہ ہو تو ہوا کرے۔ اس وقت ہمیں یہ تھوڑے معلوم تھا کہ ایک دن جدید شعراء اور تنقید نگار اُنھیں امام کا رُتبہ دے دیں گے۔ وقت وقت کی بات ہے اور پسند ناپسند پر بھی کسی کا اِجارہ نہیں۔ مگر جتنا اُنھیں پرستش کا حق ہے اُتنا ہی نہ یقین رکھنے والوں کو نظر انداز کرنے کا حق ہے، یہ بھی کوئی احکامِ الٰہی ہیں کہ مانے ہی جائیں ورنہ بخشش کھٹائی میں پڑ جائے گی۔

مجھے تو ن۔م راشد بھی بور لگتے تھے، ظاہر ہے بدمذاق اور کج فہم ہوں۔ اب خدا نے محدود سمجھ دی تو رسماً اور اپنی جہالت پر پردہ ڈالنے کے لیے میرا جی اور ن۔م راشد کو پیر و مرشد مان لوں، کہ نہ مانا تو ناک کٹ جائے گی۔

کان پکڑ کر کہتی ہوں کہ میرا جی کی شاعری میں اِتنی یاسیت، بے چارگی اور ماتم ہے کہ میرا دم بولانے لگتا ہے۔ تاریکی، تنہائی، یاسیت، مجبوری، مرگھلا پن! اُف میرا تو دم بولاتا ہے۔ اور پھر اینچ پینچ، گھومے ہوئے معنی، حد سے زیادہ ''پتے کی بات'' جو سمجھنے میں کوفت پہنچائے۔ نہیں بھئی، وہ کتنی ہی بلند پایہ اور مقدّس ہو، نہیں چلے گی۔ مانا کہ میرا جی کو ماں کا دُودھ نہیں ملا۔ کانوں

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 215 (1,1)

میں کومل لوریاں نہیں گھلی ہوں گی، لڑکیاں بے وفائی کر گئیں، اس میں بے چاری لڑکیوں کا کیا دوش، پیدا ہوتے ہی نانیاں دادیاں کہہ دیتی ہیں:

''بیٹی مضبوط کھونٹا دیکھ کر گلے میں پھندا ڈالنا۔'' ظاہر ہے مضبوط کھونٹے مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں، اِس لیے بڑے دل ٹوٹتے ہیں، تنہائیاں ڈستی ہیں، اندھیرے گھونٹتے ہیں، وجود بکھرتے ہیں، انسان ٹوٹتے ہیں، فرق اِتنا ہے کہ ایک زمانہ تھا جب طوفان سے ٹکرانے والے نوجوان سینہ سپر تھے، وہ بھی بے روزگاری، مفلسی، تنہائی، لاچاری اور مجبوری کا شکار تھے، مگر سرنگوں ٹسوے نہیں بہا رہے تھے، پہاڑوں سے ٹکرا رہے تھے، بانگِ دُہل مجرموں کو للکار رہے تھے، زناٹے سے عشق لڑا رہے تھے اور لڑکیاں اُن پر نثار ہوا کرتی تھیں۔ میراجی جیسوں کو میراسین ملی جو اُن کا ملغوبہ بنا کر چلتی بنی۔ کہتے ہیں اُنھوں نے اُس کے نام پر ہی اپنا تخلّص میراجی رکھ ڈالا۔ انتہا ہے لیچڑپن کی، کوئی بھی سمجھ دار لڑکی اِتنے پھس پھسے مرد سے وابستہ ہونا پسند نہ کرے گی جو اُس کی بیگم کا مقام پا کر فخر کرتا ہو۔ ملک پر موت اور زندگی کا ہیجان طاری ہو اور ایک لڑکی کے عشق میں سر پیٹ رہا ہو۔ آج جب ساری دُنیا میں تہلکہ مچا ہوا ہے، ملک میں گھمسان برپا ہے ''میراجی'' ابابیلیں اُڑا رہے ہیں، پتہ نہیں کیوں میں جب بھی ''میراجی'' کو پڑھتی ہوں، مجھے قبرستان میں سوکھے ہوئے پتّوں کے ڈھیر یاد آجاتے ہیں، جن پر اوس کی نمی سے کائی جم گئی ہے اور دھیمی دھیمی سڑاند اُٹھ رہی ہے۔ یہ سُوکھے پتّے آہستہ آہستہ کھاد بن جائیں گے اور نئے پودے لہلہا اُٹھیں گے۔

(چراغ روشن ہیں)

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 216 (1,1)

محمد حسن عسکری

میراجی

میراجی کی نظموں سے لوگوں کو ہمیشہ شکایت رہی ہے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور شاعر نے پڑھنے والوں کا خیال ہی نہیں رکھا۔لیکن ذاتی زندگی میں میراجی دوستوں کو خوش رکھنے کے سخت قائل تھے۔ایک طرف دیکھیے تو اُنھوں نے اپنی زندگی ہی دوستوں کے لیے تفنن طبع کی خاطر لُٹا دی۔

جب وہ آٹھویں یا نویں جماعت میں پڑھتے تھے تو اُن کے ہر دوست کی ایک نہ ایک محبوبہ تھی۔کوئی فارغ البال تھا تو بس ایک میراجی۔وہ اپنا دل دوسروں کی آگ سے گرم رکھتے تھے۔

ایک دن کوئی بنگالی لڑکی میرا سامنے سے گزر رہی تھی، دوستوں نے یونہی مذاق میں کہہ دیا یہ ہے اُن کی محبوبہ۔دو چار دن لڑکوں نے میرا کا نام لے کر اُنھیں چھیڑا، اور وہ ایسے بنتے رہے جیسے واقعی چڑ رہے ہوں۔پھر جب اُنھوں نے دیکھا کہ دوست اُنھیں ایک افسانہ بنا دینا چاہتے ہیں تو وہ بے تامل افسانہ بھی بن گئے۔اس کے بعد اُن کی ساری عمر اِس افسانے کو نبھانے میں گزری۔لاہور سے دِلّی گئے، دلّی سے بمبئی، ہر جگہ نئے دوست بنائے اور ان لوگوں کی دلچسپی کی خاطر اس افسانے میں نئی پیچیدگیاں اور اُلجھنیں شامل کرتے رہے۔اپنی موت میں بھی اُنھوں نے افسانوی روایات برقرار رکھیں۔اُن کا تخیّل اِس قدر افسانوی واقع ہوا تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ زندگی چاہے زندگی نہ رہے مگر افسانہ ضرور بن جائے۔خاص طور سے اس وقت جب کہ اس افسانے کو دیکھنے والے بھی موجود ہوں۔غرض ایک طرف تو خود اُنھیں افسانہ بن جانے میں مزا آتا تھا، دوسری طرف شاید شروع ہی سے ان کے اندر کوئی ایسی بات تھی کہ میرا جی کو دیکھ کر آدمی کا جی چاہتا

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 217 (1,1)

تھا کہ اُنھیں افسانہ بنا دیا جائے۔ یہ بات کچھ اُن کے دوستوں اور جاننے والوں تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ جس نے کوئی اُن کی تحریر پڑھ لی اُس نے ایک افسانہ اُن کے بارے میں گھڑنا شروع کر دیا۔

یہ ۳۹ء کی بات ہے کہ میں گرمیوں کی چھٹیوں میں الہ آباد سے گھر آیا۔ میں نے اُن دِنوں ادب، خاص طور سے اُردو ادب پڑھنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ فلسفہ، سیاسیات سے میری دلچسپی بڑھ گئی تھی لیکن میرے ایک دوست تھے سلطان احمد نقوی، جن کے دُنیا میں بس دو کام تھے۔ اُردو کے سب اچھے بُرے رسالے خریدنا اور گپ اُڑانا۔ ایک دن اُنھوں نے مجھے ''ادبی دُنیا'' کا سالنامہ لا کے دیا اور بتایا کہ لاہور میں شاعروں اور ادیبوں کا ایک نیا گروہ ایک دم سے اُبھرا ہے اور اُس کے قائد ہیں میرآجی اور قیوم نظر۔ اُنھوں نے اِس پر اکتفا نہیں کی بلکہ یہاں تک کہہ ڈالا کہ میں تو ان سب لوگوں سے لاہور میں مل کر آرہا ہوں۔ میرآجی کا نقشہ اُنھوں نے اِس طرح کھینچا: سات آٹھ زبانوں کے ماہر ہیں۔ کسی کالج میں انگریزی پڑھاتے ہیں۔ دُہرا بدن، گندمی رنگ، کندھوں پر زلفیں چھوڑے ہوئے، گردن میں مالا، زرد ریشم کا ڈھیلا ڈھالا کُرتا زیبِ تن، دن کو پڑھاتے ہیں شام کو شعر و سخن کی محفل جماتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ غرض اُنھوں نے اچھی خاصی اُودے شنکر کی تصویر پیش کی۔

خیر میں نے رسالہ پڑھ کے دیکھا تو نظم و نثر دونوں میں ذہنی اور جذباتی تازگی نظر آئی۔ اُس دن سے میں ''ادبی دُنیا'' باقاعدہ پڑھنے لگا۔

کچھ تو میرآجی کی ذاتی جاذبیت کی وجہ سے اور دو چار نظموں کے ان تجزیوں کی وجہ سے جو وہ ہر مہینے پیش کیا کرتے تھے۔ ان تجزیوں میں جو بات سب سے نمایاں رہتی تھی وہ یہ کہ ایک نئی ادبی تحریک اور احساس کا ایک نیا انداز پیدا ہو رہا ہے۔ شاعروں کی تعریف میں تو میرآجی ضرور مبالغہ برتتے تھے لیکن اصل کوشش اُن کی یہ رہتی تھی کہ نئے رُجحانات اور اسالیب کو سمجھیں اور سمجھائیں۔ بعض شاعروں کو اُنھوں نے اپنی تعریفوں سے بگاڑا بھی۔ لیکن چاہتے وہ یہی تھے کہ شاعر اپنی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ لگائیں اور اُن کی نشو و نما بالکل نامیاتی طریقے سے ہو۔ پھر وہ اُردو

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 218 (1,1)

ادیبوں کو یہ بتاتے رہتے تھے کہ اُردو کے علاوہ دُنیا کی دوسری زبانوں میں بھی کچھ لکھا گیا ہے۔ مغرب کے شاعروں کو میرؔاجی نے چاہے ٹھیک سمجھا ہو چاہے غلط لیکن اُنھوں نے ہمارے نئے ادیبوں میں ذہنی تجسّس ضرور پیدا کیا۔ یہی وجہ تھی کہ ادب سے سنجیدہ دلچسپی رکھنے والے نوجوان ہر مہینے ''ادبی دُنیا'' کے انتظار میں رہتے تھے اور میں تو اُن دِنوں اپنی ادبی کامیابی کی معراج یہ سمجھتا تھا کہ میرا افسانہ ''ادبی دُنیا'' میں چھپ جائے لیکن مجھ سے افسانہ لکھا ہی نہ جاتا تھا۔

آخر خُدا خُدا کر کے ایک افسانہ ہوا تو میں نے فوراً میرؔاجی کو بھیجا لیکن اُس زمانے میں افسانہ چھپواتے ہوئے ڈر یہ لگتا تھا کہ گھر والے کیا کہیں گے۔ اِس لیے میں نے شرط لگائی کہ افسانہ فرضی نام سے شائع ہو۔ ہفتے بھر بعد میرؔاجی کا خشک سا جواب آیا بالکل دفتری زبان میں کہ:

صاحب! ہم فرضی نام سے کوئی چیز نہیں چھاپتے۔

مجھے افسانے کی واپسی نے کوئی ایسی تکلیف نہیں پہنچائی لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ جو شخص لمبے بال رکھتا ہو وہ ''ایسا سرکاری'' قسم کا خط کیسے لکھ سکتا ہے۔ خیر میں نے افسانہ اِدھر اُدھر ڈال دیا۔

اس عرصے میں ''نیا ادب'' شائع ہونے لگا تھا اور اس سے بھی نئے ادیبوں کا ایک گروہ متعلق تھا۔ تین مہینے بعد میں نے افسانہ اس رسالے کو بھیج دیا۔ وہ صدائے برنخاست کا مضمون رہا۔ تین مہینے اور گزرے تو میں نے سوچا کہ میرا نام ہی چھپ گیا تو کون سی قیامت آجائے گی، لہٰذا میں نے افسانہ پھر میرؔاجی کی خدمت میں روانہ کیا۔ اب کے ادھر سے رسید نہ آئی اور میں یہی سوچتا رہ گیا کہ میرے افسانے میں آخر ایسی کیا خرابی تھی؟

آخر ایک دن اچانک میرؔاجی کا کارڈ ملا۔ اُنھوں نے بس تین چار جملے لکھے تھے کہ افسانہ فلاں مہینے میں چھپے گا، مجھے بہت پسند آیا ہے، وغیرہ۔ یوں بات تو ذرا سی تھی لیکن آخر میرؔاجی کا سرٹیفکیٹ تھا۔ میرا نتیجہ بھی دو چار دن پہلے نکلا تھا۔ اِتنی خوشی تو مجھے بی اے میں فرسٹ کلاس پاکر بھی نہ ہوئی تھی۔ میرؔاجی کے اس کارڈ کو میں نے پانچ چھ سال تعویذ کی طرح محفوظ رکھا۔

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 219 (1,1)

بعد میں میرآجی نے مجھے بتایا کہ میرا افسانہ اُنھوں نے مضمونوں کے ڈھیر میں سے محض اِس لیے اُٹھایا تھا کہ ذرا صاف صاف لکھا ہوا تھا۔

بہرحال میرآجی نے مجھے فوراً ادیب بنا دیا۔ سُنا ہے کہ بعض لوگوں سے اُن کے تعلقات اُستادی شاگردی کے ہوتے تھے لیکن نہ جانے کیا بات ہوئی کہ مجھ سے وہ تو بالکل شروع ہی سے بے تکلّفی برتنے لگے۔ خط لکھنے کے بڑے چور تھے۔ بعض دفعہ مجھے قیوم نظرؔ یا یوسف ظفرؔ کے ذریعے تقاضا کرنا پڑتا تھا، جب کہیں جا کے جواب دیتے تھے، لیکن خط ہمیشہ اس انداز کا ہوتا تھا، جیسے وہ اور میں دونوں بڑی زبردست تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف ہیں اور ایک دوسرے کا ساتھ دیے بغیر گزارہ نہیں ہوسکتا۔ میرآجی نے مجھے افسانہ نگار بنا دیا تو ''نیا ادب'' گروپ کے بھی بعض حضرات مجھے خط لکھنے لگے لیکن وہ صرف شاباشی دیتے تھے۔ میرآجی یہ بھی پوچھا کرتے تھے کہ آئندہ کس قسم کا افسانہ لکھو گے؟

خطوں کے ذریعے میرآجی اور اُن کے قریبی دوستوں یعنی قیوم نظرؔ اور یوسف ظفرؔ سے میری اِتنی دوستی بڑھی کہ یہ لوگ مجھے لکھا کرتے تھے کہ تم رہتے تو ہو الہ آباد میں، لیکن ادیب لاہور گروپ کے اور میرآجی کی شفقت تو اِس حد تک پہنچی کہ وہ اپنے حالاتِ زندگی کبھی نہیں لکھتے تھے مگر میں نے نظموں کا ایک مجموعہ مرتّب کیا تو وہ بھی لکھ دیے۔ لیکن اِس بے تکلّفی کے باوجود وہ رہے میرے لیے ایک افسانہ ہی۔

خطوں میں وہ اپنی ذات سے متعلق کوئی بات کبھی نہ لکھتے تھے۔ نئے ادیبوں کے مسائل سے اُنھیں اِتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ چنانچہ اس افسانے کی حقیقت اب بھی میرے لیے ایک راز ہی رہی۔

ادیبوں سے ملنے کا شوق تو مجھے ایسا نہ تھا، لیکن میرآجی نے مجھے بھی ادیب بنا ڈالا تھا۔ اِس لیے برادری میں شامل ہونے کے فرائض ادا کرنے ہی پڑے تھے۔ اِسی سلسلے میں سلام مچھلی شہری سے ملاقات ہوئی۔ اُنھوں نے میرآجی کو اور افسانہ در افسانہ بنا دیا۔ مثلاً اُنھوں نے سنایا

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 220 (1,1)

کہ میرا جی جاڑے، گرمی، برسات ایک گرم اوورکوٹ اور موٹی موٹی اونی جُرابیں پہنے رہتے ہیں۔، کار میں کبھی نہیں بیٹھتے ،تصویر کبھی نہیں کھنچواتے۔ یہ کردار میرا جی کی تحریروں کا نہیں تھا۔اُن میں تو سمجھ کی باتیں ہوتی تھیں۔ اِس لیے میرا جی کا احوال سن کر مجھے وحشت نہیں ہوئی بلکہ اُنھیں دیکھنے کا اشتیاق پہلے جیسا نہیں رہا یا یوں کہیے کہ اس کی نوعیت بدل گئی۔

ہاں جب میرا جی سے ملاقات ہوئی تو سلام مچھلی شہری سے جو کچھ سنا تھا میں نے اُن سے تصدیق چاہی۔

میرا جی بولے بھئی میں اپنے بارے میں مختلف آدمیوں سے مختلف قسم کی باتیں کہتا ہوں۔ممکن ہے سلام کو یہی بتایا ہو۔اس کے بعد اپنی ایک تصویر نکال کر دی اور کہا یہ میری پہلی اور آخری تصویر ہے۔

اُن سے میری پہلی ملاقات مئی ۱۹۴۲ء میں ہوئی۔ دہلی میں ترقی پسند ادیبوں کی ایک کانفرنس بڑی دھوم دھام سے ہو رہی تھی۔ میں نے سُنا کہ لاہور سے بھی لوگ آرہے ہیں تو میں جا پہنچا۔ پہلا اجلاس ختم ہوگیا لیکن میرا جی کا سراغ نہ ملا۔مہندر ناتھ اور میں ہال سے باہر نکل چکے تھے کہ یکا یک اُنھوں نے چلّا کر کہا:

''وہ آئے میرا جی!'' سامنے سے پانچ چھ آدمیوں کا ایک جلوس چلا آرہا تھا۔ان میں سے کوئی ایسی شکل نظر نہ آئی جسے میں میرا جی سمجھ سکوں۔ میں نے پوچھا کِدھر ہیں۔اب کے مہندر ناتھ نے اشارے سے بتایا۔اتنے میں یہ لوگ قریب آچکے تھے۔

اب جو میں نے میرا جی کو غور سے دیکھا تو نہ ریشم کا کُرتا اور نہ اوورکوٹ، دُبلے پتلے آدمی، گردن کی ہڈی باہر نکلی ہوئی، لمبا سا سُوتی کوٹ اور پیجامہ پہنے، لمبے لمبے بال مگر بالکل خشک اور اُلجھے ہوئے۔سر پر کشتی نما سیاہ ٹوپی، یہ بھی ایک افسانہ تھا مگر جتنے افسانے سنے تھے اُن سے بالکل مختلف تھا۔ مجھے کئی دن تک یہ یقین ہی نہ آیا کہ یہ میرا جی ہو سکتے ہیں۔ابھی میں میرا جی کو دیکھ ہی رہا تھا کہ مہندر ناتھ نے مولانا صلاح الدین سے تعارف کرایا۔ وہ بڑے تپاک سے ملے لیکن میرا جی

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 221 (1,1)

دفتری خطوں کی زبان میں ملے۔ اِس دفعہ دہلی میں تین چار دن ٹھہرنا ہوا اور ان سے دو تین مرتبہ مڈبھیڑ ہوئی۔ لیکن میرآجی گراموفون کی طرح بولتے رہے۔ یوں تو میرآجی کو گفتگو کا بڑا سلیقہ تھا۔ دلچسپی اور شائستگی دونوں کو برقرار رکھنا بہت کم لوگوں کو آتا ہے۔ لیکن اِس ملاقات میں وہ کڑی کمان ہی بنے رہے۔ یہ ہُنر بھی خاصا مشکل ہے۔

تین چار مہینے بعد وہ اور میں دونوں مستقل دہلی میں آرہے۔ اُن دِنوں وہ ریڈیو میں ملازمت کے لیے کوشاں تھے۔ اِس لیے ہر وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتے تھے۔ ایک ٹوٹی پھوٹی سائیکل پر کرشن چندر کے یہاں آتے، یا تو خاموش بیٹھے لوگوں کے چہروں کا اِس طرح جائزہ لیتے رہتے جیسے گھر جا کے ان کا تجزیہ لکھیں گے یا پھر اس میکانکی انداز میں تھوڑی بہت باتیں کر کے اُٹھ جاتے۔ بہر حال میں نے یہی رائے قائم کی کہ ان سے خطوں کی دوستی ہی اچھی۔ جب میراجی مشین بن جاتے تھے تو اُن کا انداز سرکاری افسروں سے بھی زیادہ ڈراؤنا ہو جاتا تھا۔

لیکن میرآجی کو ریڈیو میں ملازمت مل گئی تو اُن کی مشینیت دُور ہوگئی۔ اب وہ اصرار کرنے لگے کہ اتوار کے دن دوپہر کو میرے گھر آؤ۔ یہ وقت اُن کے کپڑے دھونے کا ہوتا تھا۔ کپڑے وہ دو تین جوڑوں سے زیادہ نہ رکھتے تھے۔ اِس لیے اتوار کے اتوار خود ہی بیٹھ کر دھوبی کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ کپڑے دھوتے وقت وہ بڑا ذہنی سکون اور طمانیت محسوس کرتے تھے۔

اپنی ذاتی زندگی کے متعلق وہ اسی حالت میں منصوبہ بندی کیا کرتے تھے۔ اُن دِنوں اُنھیں یہ دُھن سمائی تھی کہ ایک دن ریڈیو میں اسٹیشن ڈائریکٹر بن کے دم لوں گا۔ چنانچہ وہ حساب لگایا کرتے تھے کہ اِس کام میں کتنا عرصہ لگے گا، تنخواہ کتنی ملے گی۔ ماں اور بھائی بہنوں کو کتنے کتنے پیسے دیے جائیں گے، وغیرہ وغیرہ۔ ایسی باتیں کرتے ہوئے وہ بالکل بچوں کی طرح معصوم لگتے۔ لیکن جب وہ یہ بتانا شروع کرتے کہ آدمی سٹیشن ڈائریکٹر کس طرح بنتا ہے تو مجھے اُن سے ڈر لگتا۔ میرآجی کی فطرت واقعی بچوں کی طرح معصوم تھی۔ لیکن دُنیا معصومیت ہی کے ہاتھوں

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 222 (1,1)

تباہ ہوا کی ہے۔ خدا نے بڑا فضل کیا کہ میر آجی شرابی بنے، اسٹیشن ڈائریکٹر نہیں۔

ان ملاقاتوں کا سلسلہ کئی مہینے تک چلتا رہا لیکن ہمارے درمیان یگانگت کا احساس ذرا بھی پیدا نہ ہوا۔ مگر جب اُن کی منصوبہ بندی کا جوش ختم ہو گیا اور وہ سیدھے سادے شراب نوشی پر آ گئے تو پھر مجھے پتا چلا کہ میر آجی کسی موضوع میں جذب ہو کر گھنٹوں باتیں کرنے کی کیسی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اب اُن کے ملنے کا وقت رات کو ہو گیا تھا۔ شام کو دفتر سے گھر آجاتے اور پھر رات کے دس بجے شغل کے لیے نکلتے۔ ہوش کے دو تین گھنٹے اُنھیں ملتے تھے۔ اس وقت کبھی کبھی میں پہنچ جایا کرتا، کبھی کتابوں پر باتیں کرتے، کبھی اپنے عشق کا قصہ لے بیٹھتے، لوگوں کی تحلیل نفسی شروع کرتے۔ خوابوں کے تجزیے کا اُنھیں بڑا شوق تھا۔ بلکہ اُنھوں نے تو نفسیاتی معالجے کا طریقہ بھی لوگوں پر آزمانا شروع کر دیا۔ پھر ایک خصوصیت اُن میں یہ تھی کہ کتاب ہر قسم کی پڑھتے تھے۔ ادب، نفسیات، عمرانیات وغیرہ تو خیر ایک سلسلے کے مضمون ہوئے، لیکن ایک زمانے میں اُنھیں اُنھیں کپڑوں کے ڈیزائن مطالعہ کرنے کا شوق ہوا۔ کہا کرتے تھے کہ جب شادی ہوگی تو بیوی کو مشورہ تو دے سکوں گا۔ اِسی طرح نہ معلوم کن کن موضوعات پر الم غلم کتابیں اُنھوں نے مجھے زبردستی پڑھوائیں۔

زندگی کے ہر شعبے میں اُنھیں متفرقات کا شوق تھا۔ اِسی سلسلے میں اُنھوں نے پان بنانا سیکھا تھا، بلکہ اپنے مخصوص ہُنر کے ساتھ ساتھ اِس فن کے بھی دو چار نئے طریقے ایجاد کیے تھے اور اِس میں حال یہ تھا کہ چاہے ان کی باتیں بھول جاؤں لیکن اُن کا پان نہیں بھول سکتا۔ دس منٹ میں تو اُن کا ایک پان بنتا تھا۔ بچارے اپنے لیے پانوں کا ایک پلندہ لے کر چلتے تھے لیکن اُن کے سارے پان تبرّک ہو کے بٹ جاتے تھے۔

اُن کے جاننے والوں نے اُن کی شراب نوشی کے قصے بہت بیان کیے ہیں لیکن مجھے یہی حسرت رہی کہ میر آجی کو نشے کی حالت میں دیکھوں۔ مجھ سے تو وہ یہ کہا کرتے تھے کہ شراب میں پیتا ہوں، لیکن اصل شرابی تم ہو۔ غالباً اپنا امتیاز برقرار رکھنے کے لیے میرے سامنے وہ ہمیشہ ہوش

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 223 (1,1)

ہی کی باتیں کرتے تھے۔

ایک دن مجھے وہ شراب خانے ضرور لے گئے تھے لیکن اُس دن اُنھیں بھی شراب میں کوئی مزا نہ آیا ہوگا، کیونکہ ہر پانچ منٹ بعد وہ مجھ سے یہی پوچھتے رہے کہ عسکری صاحب! میں نے کوئی بے عقلی کی بات تو نہیں کی؟

مجھے اصل میں میرؔاجی سے ایک ہی شکایت ہے۔ اُنھوں نے مجھ سے کبھی بے تکلفی نہیں برتی اور اِتنے گھل مل جانے کے بعد بھی ہمیشہ میرا بڑا لحاظ کرتے رہے۔ اُن کی یہ ایک خاص عادت تھی کہ اُنھیں کوئی کتاب پسند آجائے تو واپس نہیں کرتے تھے لیکن میری کوئی کتاب اُنھوں نے کبھی نہیں رکھی۔ اگر پڑھنے کا وقت نہ ملا تو اپنے آپ واپس کر گئے۔ البتہ اُن کی ایک کتاب ضرور میرے پاس رہ گئی اور اِس وجہ سے کہ جب وہ دہلی سے بمبئی گئے ہیں تو اُنھیں اپنا ہی ہوش نہ تھا۔

میرؔاجی سے میری آخری ملاقات عجب حالات میں ہوئی ۱۹۴۶ء کا ذکر ہے قائدِ اعظم دہلی کے اینگلو عربک کالج میں تقریر کرنے والے تھے۔ سڑکیں آدمیوں سے پٹی پڑی تھیں۔ میں بھی دروازے کے باہر ایک طرف کھڑا تھا۔ اتنے میں دیکھتا ہوں کہ میرؔاجی چلے آرہے ہیں۔ سال بھر سے یہ حال ہوگیا تھا کہ وہ گھر پر رہتے ہی نہ تھے۔ کبھی کبھی حلقۂ اربابِ ذوق کے جلسوں میں نظر آجاتے تھے حالانکہ شراب نے اُن کا بُرا حال کر رکھا تھا۔ لیکن اُن کے ذہن کی تیزی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ حلقے کے جلسوں میں ہاتھ باندھے چُپ چاپ بیٹھے رہتے۔ بیچ بیچ میں کوئی جملہ ایسا شوخ کہہ دیتے کہ مجھے تو اُن کی ذہانت اور حاضر دماغی پر رشک ہونے لگتا۔ پچھلے دو تین مہینے سے وہ بالکل ہی غائب رہے۔ بس یہ سُنا کرتے تھے کہ جب پیسے نہیں رہتے تو وہ اپنی کسی کتاب کا مسوّدہ شاہد صاحب کو دے جاتے ہیں، اور پیسے لے جاکے سڑکوں پر بکھیر آتے ہیں۔ لیکن آج تو اُن کی عجیب ہی کیفیت تھی۔ میلے کچیلے پھٹے ہوئے کپڑے۔ چہرے پر ورم، جگہ جگہ خون جما ہوا۔

میں نے اُنھیں اِس عالم میں دیکھا تو منہ کھُلے کا کھُلا رہ گیا۔ پوچھا کہ میرؔاجی خیر تو ہے۔

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 224 (1,1)

نہایت اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ بولے کہ:

رات نشے کی حالت میں ریڈیو اسٹیشن میں ہی پڑ کے سو گیا۔ کسی نے آ کے میری خوب مرمت کی اور مجھے پتا ہی نہ چلا۔ میں نے اور تفصیلات معلوم کرنا چاہیں لیکن وہ تو ایسی بے فکری سے باتیں کر رہے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اُن کا ذہن ہمیشہ کی طرح کام کر رہا تھا۔ وہی مسکراہٹ، وہی شوخی، وہی ذکاوت۔ میں نے کچھ مسلم لیگ اور پاکستان کا ذکر چھیڑ دیا۔ اُنھوں نے سیاست کے متعلق جو کچھ بھی کہا اُس سے ہوش مندی ٹپکتی تھی۔ پھر کچھ ادب کی باتیں رہیں۔ غرض میرآجی اپنی اِس ہیئت کذائی کے باوجود وہی پرانے میرآجی تھے۔ تھوڑی دیر بعد کہنے لگے کہ اب مجھے یہ معلوم کرنے جانا ہے کہ یہ کون آدمی تھا جس نے رات مجھے مارا اور وہ جلدی ہی ملنے کا وعدہ کر کے ہجوم میں غائب ہو گئے۔

مجھے خوشی ہے کہ اُنھوں نے اپنی بہتری کے جتنے منصوبے بنائے تھے وہ سب خاک میں مل گئے۔ اگر وہ اسٹیشن ڈائریکٹر ہو جاتے تو اُن کا چہرہ میرآجی کا بھی چہرہ نہ رہتا بلکہ ثناء اللہ کا چہرہ بن جاتا لیکن خون آلود چہرہ بیسویں صدی کے فن کار کا چہرہ ہے۔

(میراجی ایک مطالعہ)

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 225 (1,1)

محمود نظامی

میرا جی

اصل بات کہنے سے قبل اگر میں دو تین ضمنی باتیں شروع ہی سے کہہ دوں تو نامناسب نہ ہوگا۔

میرا جی کی موت کا حادثہ اِتنا حالیہ ہے کہ ادبی دُنیا میں اُن کو ذاتی طور پر جاننے والے بیسیوں افراد موجود ہیں۔ان میں سے بعض ایسے لوگ ہیں جو اُنھیں بچپن سے جانتے تھے۔بعض ایسے ہیں جو اُن سے اُس وقت ملے جب اُن کی ادبی شہرت لاہور کی صحافت کے ذریعے باہر پھیل چکی تھی اور پھر کچھ ایسے بھی ہیں جو اُن سے اُن کی مختصر زندگی کے آخری ایام ہی میں مل پائے۔میرا شمار آخری قسم کے افراد میں ہے۔ چنانچہ میں عرض کر دوں کہ گو میں میرا جی کو اُن کے کلام اور تحریروں کے ذریعے اب بھی کبھی دیکھ لیتا ہوں،لیکن دراصل زندگی میں اُن کی رفاقت کے لیے مجھے صرف پانچ برس ہی میسّر آئے۔

پانچ برس کا عرصہ کوئی بہت بڑی مدت نہیں۔لیکن ایسے شخص کی زندگی کے لیے جسے خود اِس جہانِ رنگ و بُو میں صرف چند برس بسر کرنے کی مُہلت ملی ہو،یہ اگر کچھ ایسی قلیل بھی نہیں،خصوصًا جب کہ اُس کی زندگی کے کئی جوہر انھی پانچ برس میں کُھلے ہوں۔

تاہم میں اپنی اور میرا جی کی دوستی کو مثالی دوستی نہیں کہہ سکتا۔بلکہ اِس امر کے باوجود کہ میرا جی کی ہیئت کذائی اور میرا جی کو بعض دیرینہ عادات کو بدلنے کا گناہ بھی گو خود مجھی سے سرزد ہوا، مگر میں اپنی اور میرا جی کی دوستی کے متعلق یہ دعوے نہیں کر سکتا کہ وہ کوئی ایسی لاہوتی شے تھی جس

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 226 (1,1)

سے باقی دُنیا کو سبق لینا چاہیے۔ البتہ اِتنا کہوں گا، یہ ایک ایسا قرب تھا جس کا ذمہ دار دل نہیں بلکہ دماغ تھا۔ گویا یہ ایک ایسی رفاقت تھی جو اجنبی دُنیا میں بعض اوقات دو ہم جنسوں کو یوں اکٹھا کر دیتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکتے اور ہر مشکل میں ایک دوسرے سے استمداد کرتے ہیں۔

جس چیز نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے اِس قدر قریب لا کھڑا کیا تھا، وہ نہ تو میراؔجی کی ادبی حیثیت تھی نہ میری ادب سے وابستگی۔ حقیقت یہ ہے کہ سب سے پہلے مجھے جس چیز نے میراؔجی کی طرف متوجہ کیا، وہ اُن کی شاعری نہیں بلکہ ہیئت کذائی تھی۔ اور پھر جس چیز نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے صحیح معنوں میں روشناس کرایا وہ ہمارا باہمی ادبی ذوق نہیں، بلکہ ہمارا ریڈیو سے شغف تھا۔ چنانچہ ہماری رفاقت اِس امر کی دلیل تھی کہ بعض اوقات جغرافیائی اور لسانی بُعد اور طبائع کے اختلاف کے باوجود دو شخص ایک مشترک مشغلے کی وجہ سے ایک دوسرے سے بہت قریب آسکتے ہیں۔ اگر ہم دونوں ریڈیو سے وابستہ نہ ہوتے، اور ہم دونوں کے معاش میں ریڈیو کو دخل نہ ہوتا تو شاید میں میراؔجی کو نہ جان سکتا اور وہ تو یقیناً مجھ سے کبھی متعارف نہ ہوتے۔

میراؔجی کا نام میں نے شاید ۱۹۳۹ء میں پہلی مرتبہ ''ادبی دُنیا'' میں ایک نظم کے نیچے لکھا ہوا دیکھا۔ لاہور کے اکثر ادیبوں کو میں ذاتی یا غائبانہ طور پر جانتا تھا۔ چونکہ یہ نام میرے لیے بالکل نیا تھا اِس لیے میں نے اِس سے یہی اندازہ لگایا کہ یہ شاید کوئی ہندو خاتون ہیں جنھیں ہندی اُردو الفاظ کی آمیزش سے ہندی اور فارسی بحور میں شعر کہنے کا بہت اچھا ذوق ہے۔ اس کے بعد بھی میں نے اِسی نام کے ساتھ کئی اور نظمیں دیکھیں اور میں سمجھا کہ مجلّہ ''ادبی دُنیا'' نے کہیں سے ایک اچھی ہندو شاعرہ کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ چند ماہ بعد میں ایک دن گیلانی پریس لاہور کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ بشیر ہندیؔ کسی سے باتیں کرتے ہوئے نظر آگئے۔ اُنھوں نے مجھے آواز دے کر روک لیا اور ہم کچھ عرصے کے لیے اِدھر اُدھر کی گپ شپ میں مصروف ہو گئے۔ میں چونکہ ان صاحب کے عقب کی طرف سے وارد ہوا تھا جن سے ہندیؔ میری آمد سے قبل مصروفِ کلام تھے۔ اِس لیے

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 227 (1,1)

مجھے اُن کی طرف دیکھنے کا دھیان نہ رہا۔ میری بے توجہی سے متاثر ہو کر ہندیؔ نے پوچھا ''تم اِن ذاتِ شریف کو نہیں جانتے؟'' میں نے پلٹ کر ان صاحب پر نظر ڈالی اور اُنھوں نے میری طرف دیکھا اور پھر ہم جلدی جلدی ایک دوسرے کا جائزہ لینے لگے۔ ایک ساعت جو مشاہدے اور غور کے لیے ہمیں ملی، اس میں میں نے دیکھا کہ یہ حضرت اپنے حُلیے کی وجہ سے بھارت ماتا کے اُن سپوتوں کا نمونہ تھے جن پر ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی بیک وقت سبھی کچھ ہونے کا شُبہ گزرتا تھا۔ سر پر سادھوؤں کی تقلید میں لمبے لمبے اُلجھے ہوئے چکٹ میلے بال، چہرے پر چینی طرز کی نیچے کو لٹکی ہوئی مونچھیں۔ کلّے میں ایک طرف بڑی سی گلوری، نیچے پیک سے لتھڑی ہوئی باچھیں، جسم پر مٹی، کتھے اور سیاہی کے دھبّوں سے اٹی ہوئی ایک بوسیدہ سی شیروانی، اس کے نیچے ٹخنوں سے اُوپر تک اُلٹی ہوئی مُہری کی میلی کچیلی پتلون، اس سے اور نیچے ایک گندا ساخستہ حال بوٹ اور پھر ہاتھ میں ایک ٹوٹی پھوٹی سائیکل۔ اور ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ یہ صاحب کس مذہب اور پیشے سے متعلق ہو سکتے ہیں کہ ہندیؔ نے میرے استعجاب کو رفع کرتے ہوئے کہا: یہ میرا جی ہیں۔''

کئی مہینے گزر گئے۔ پھر ایک دن میں اعجازؔ بٹالوی کی دعوت اور اصرار پر حلقۂ اربابِ ذوق میں شرکت کے لیے جا نکلا۔ حلقہ ابھی نیا نیا وجود میں آیا تھا۔ اُس زمانے میں اُس کے اجلاس ایبٹ روڈ پر نشاط سینما کے بالمقابل ایک دو منزلہ مکان کے نچلے حصّے میں ہُوا کرتے تھے۔ اور اس کے ارکان مقامی کالجوں کے وہ چند ادب پسند طلبہ تھے جو آج ہمارے نوجوان ادیبوں کی صف میں ممتاز جگہ پر نظر آتے ہیں۔ یہ شاید حلقے کا تیسرا یا چوتھا اجلاس تھا اور میں جب اُس تاریک سے کمرے میں پہنچا ہوں تو اٹھارہ یا بیس نوجوانوں کی مختصر سی جماعت عاشق حسین بٹالوی کی صدارت میں دیوندر ستیارتھی سے اُن کا کوئی افسانہ سُننے میں محو تھی۔ اپنی نشست پر پہنچ کر میں نے ایک اُچٹتی ہوئی نظر کمرے میں دوڑائی۔ کچھ لوگ ایک اُونچی سی میز پر چڑھ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن سے ہٹ کر دروازے کی اوٹ میں دو تین نوجوان کھڑے تھے۔ اور اُن کے پیچھے وہی سادھوؤں کے بالوں اور چینی مونچھوں والا چہرہ آگے کو جُھکا ہُوا یوساکت و جامد نظر آ رہا تھا، گویا اُسے

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 228 (1,1)

کسی نے پتھر سے تراشا ہے۔

دفعتاً اُس میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے۔ دو تین جُنبشوں کے بعد اُس نے دائیں جانب کو حرکت کی اور میں بھانپ گیا کہ وہ اُدھر ہی کو پلٹ رہا ہے جہاں آ کر میں ابھی ابھی بیٹھا تھا۔ جیسے ہی ہماری آنکھیں چار ہوئیں، اُس چہرے کی مسکراہٹ سے مجھے یوں محسوس ہوا گویا اس پر وہی تبسّم کھیل رہا ہے جس سے بعض اوقات برسوں سے بچھڑے ہوئے دوست ایسی محفلوں میں ایک دوسرے کا خیر مقدم کرتے ہیں، جہاں آدابِ محفل اُنھیں ہمکلام ہونے کی اجازت نہیں دیتے اور پھر سادھو کے بال لہرائے، پان کی پیک سے لتھڑی ہوئی باچھیں ایک ساعت کے لیے کِھلیں اور اُس کے ساتھ ہی ہونٹ سُکڑ کر پہلی حالت پر آ گئے۔ سادھو کے بالوں میں ایک اور جُنبش ہوئی اور پھر وہ چہرہ اُدھر ہی کو پلٹ کر جامد ہو گیا جدھر سے اُس نے میری جانب پانچ سیکنڈ پہلے حرکت کی تھی۔

جلسہ ختم ہونے سے ایک منٹ پہلے ایک صاحب نے اُٹھ کر چند حضرات کے نام لیے اور کہا کہ اجلاس کے بعد یہ لوگ حلقہ سے متعلق بعض ضروری امور کے فیصلے کے لیے رُک جائیں۔ جب مجمع چھٹنے لگا تو میں رُخصت ہونے کی غرض سے اُٹھا مگر مجھے اعجاز بٹالوی نے جو اِس عرصے میں میرآجی سے دروازے کی دہلیز کے قریب کھڑے کوئی مشورہ کر رہے تھے، جانے سے روک دیا۔ جب یہ مجلسِ شُوریٰ منعقد ہوئی اور حلقے کے انتظامی امور اور لائحۂ عمل کے لیے بحث و تمحیص کا آغاز ہوا تو میں نے دیکھا کہ ان نوجوانوں کی مجلس میں میرآجی کی حیثیت پیرِ مغاں کی سی تھی۔ ہر معاملے میں آخری فیصلہ کے لیے یہ لوگ میرآجی ہی کی طرف دیکھتے اور ہر بات اُنھیں کے فیصلے کے مطابق طے ہوتی۔ جس خشک متانت اور سختی سے وہ بحث کے ہر پہلو کو ختم کرتے تھے، اس سے مجھے شُبہ ہو رہا تھا کہ یا تو یہ شخص حد درجہ اکھڑ اور بد دماغ واقع ہُوا ہے یا پھر اپنے ساتھیوں کی رائے کو بچپنے پر محمول کرتا ہے۔ مجلس کے ختم ہونے تک مجھ پہ یہ بات واضح ہو گئی کہ حلقۂ اربابِ ذوق کا قیام اِسی شخص واحد میرآجی کی کوششوں کا نتیجہ ہے اور یہ مجلس اسی طرح چلے گی، جس طرح

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 229 (1,1)

اس کا بانی چاہے گا۔

مجلس کے خاتمے پر جب میں ریڈیو اسٹیشن کی طرف روانہ ہونے کے لیے اُٹھا تو میرا جی بھی جن سے یہ میری دوسری ملاقات تھی، میرے ہمراہ ہو لیے۔ مجھے دوسرے دن کے لیے ایک ریڈیو پروگرام کا ایک مسوّدہ پھر سے دیکھنا تھا۔ یہ مسوّدہ میرا اپنا لکھا ہوا تھا۔ پروگرام کے رہرسل ہو چکے تھے اور مسوّدے میں بظاہر اب کسی ترمیم کا وقت نہیں تھا لیکن پھر بھی اس میں دو تین ٹکڑے ایسے تھے جو رہرسل میں ہر بار مجھے کھٹکتے تھے۔ ان فقروں کی زبان میں کچھ ایسا اُلجھاؤ سا تھا جن کی وجہ سے اُن کی ادائیگی میں روزمرّہ کی بے ساختگی نہ آپاتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اُنھیں پھر سے لکھوں لیکن ہر کوشش بیکار ثابت ہو چکی تھی۔ چنانچہ جب میرا جی نے میرے تردّد کی وجہ پوچھی تو قدرتی طور پر میں نے وہ صفحات اُن کی طرف بڑھا دیے۔ اُنھوں نے پڑھنے کے بعد قلم اُٹھایا پہلے فقروں پر خطِ تنسیخ کھینچا اور پھر نئے فقرے جلدی جلدی لکھنا شروع کر دیے۔ میں بے اعتباری کے عالم میں اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس زُود نویسی پر مجھے کچھ بے اطمینانی سی ہو رہی تھی۔ ریڈیو کے پروگراموں پر نشریات کے اُن ابتدائی ایام میں بہت اہتمام کیا جاتا تھا۔ مسوّدات میں نہ کتابی قسم کی رسمی طرزِ تحریر کو اور نہ محض بولی ٹھولی کے استعمال کو قبول کیا جاتا تھا۔ ریڈیو ایک اپنا ادب پیدا کر رہا تھا جن میں الفاظ کے آہنگ و اصوات کے صحیح جائزے کے بعد اُن کے مناسب اور موزوں استعمال پر اصرار کیا جاتا تھا اور اِس بات پر خاص زور دیا جاتا تھا کہ جو کچھ کہا جائے، وہ سُننے والوں کے اُس طبقے کے عین مزاج کے مطابق ہو جو اس کے مخاطب ہیں، اور ایسے الفاظ کے استعمال کا انتظام ملحوظ رکھا جائے جو آسانی کے ساتھ بولے جا سکیں۔ آسانی کے ساتھ لکھے جا سکیں۔ یہ طرزِ تحریر ہمارے عام لکھنے والوں کے لیے ایک نئی چیز تھی۔ اِس لیے اکثر ادیبوں کی طبیعتوں نے اس نئی پابندی کو اپنے لیے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

میرا جی سے جنھیں میں اُس وقت تک محض شاعر کی حیثیت سے جانتا تھا، مجھے اس سلاست اور سادگی کی توقع نہ تھی جو ریڈیو کی تحریروں کا اصل سرمایہ متصوّر ہوتی ہے۔ چنانچہ

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 230 (1,1)

میں نے اُن کی اصلاح کو بے اعتباری کے عالم میں محض رفعِ استعجاب کی خاطر یونہی ایک نظر دیکھا۔ خیال تھا یہ بھی مروّجہ کتابی طرزِ تحریر کا ایک اور نمونہ ہوگا لیکن جیسے ہی میں نے اُنھیں پڑھا وہ فقرے کچھ ایسے پھڑکتے ہوئے نظر آئے، گویا خود بول رہے تھے۔ اُن کی جان وہی سادگی تھی جو ریڈیو کے مکالموں کے لیے ضروری متصوّر ہوتی ہے۔ جملوں کی ساخت کی سادگی، الفاظ کی سادگی اور مافی الضمیر کے اظہار کی سادگی۔ لیکن میرؔ آجی کا اصل کمال یہ تھا کہ اُنھوں نے کہیں کہیں ادُھورے فقروں سے کام لیا تھا جو پورے فقرے بھی ادا نہ کر سکتے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے بعض اوقات بے تکلّف دوستوں کی بات چیت میں نامکمل فقرے پورے معنی پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ ایک ایسے شاعر سے جو انسانی ذہن کو اپنے پیچیدہ خیالات اور مبہم تصوّرات سے اُلجھاؤ میں ڈالنے کا بہت بڑا ملکہ رکھتا ہو، ایسی تحریر کو دیکھنا جو آنکھ کے لیے نہیں بلکہ محض کان کے لیے تھی، میرے لیے بڑی اچنبھے کی بات تھی۔

اُس زمانے میں ریڈیو کے لیے نئے نئے لکھنے والوں کی تلاش بڑی شدت سے جاری تھی۔ جہاں کوئی اچھا لکھنے والا مل جاتا، ریڈیو کے ارکان اُس کے سر ہو جاتے۔ میرؔ آجی کی تحریر کو دیکھ مجھے خیال آیا کہ اِس شخص کو ریڈیو کی طرف مائل کرنا چاہیے۔ چند روز میں ''معجونِ مرکب'' کے عنوان سے ایک ورائٹی پروگرام نشر ہونے والا تھا۔ جس کے مختلف ٹکڑے میرے پاس لکھے رکھے تھے۔ اُنھیں منطقی سلسلے میں جوڑنے کے لیے ''راوی'' کے فقروں کی ضرورت تھی جنھیں لکھنے کا کام میں نے میرؔ آجی کے سپرد کیا۔ بادی النظر میں یہ کام شاید بہت معمولی دکھائی دے لیکن فی الحقیقت مختلف لوگوں کے لکھے ہوئے الگ الگ خاکوں، تمثیلچوں، افسانوں، گانوں لطیفوں وغیرہ کو ایک ہی منطقی سلسلے میں فنکارانہ کامیابی کے ساتھ منسلک کرنا کوئی ایسی آسان بات بھی نہیں۔ لیکن میرؔ آجی دوسرے دن مسوّدہ واپس لائے تو مجھے مزید حیرت ہوئی کہ اُنھوں نے کس خوبی سے یہ کام انجام دیا تھا۔ اس کے بعد اُنھوں نے حلقۂ اربابِ ذوق کے بعض ارکان کے ساتھ مل کر تین پروگرام اور لکھے۔ اُن کی کامیابی سے متأثر ہو کر میں نے اُنھیں ایک بالکل نئی طرز کا پروگرام

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 231 (1,1)

لکھنے کو کہا۔ میں ریڈیو پر ایک ایسے پروگرام کو پیش کرنا چاہتا تھا جس میں ملک کے نامور فنکاروں کو اپنے اپنے کام اور فن پر بے تکلّف تبادلۂ خیال کے لیے ایک ہی جگہ پر اکٹھا کیا جا سکے۔ یہ پروگرام جو ''خرابات'' کے عنوان سے پیش کیا گیا اور جس میں دینا ناتھ رتشی، نفیس خلیلی، عبدالمجید سالکؔ، فیض احمد فیض، اُستاد غلام علی خاں، ملکہ پکھراجؔ اور دوسرے فنکاروں نے اپنے اپنے ناموں کے ساتھ شرکت کی۔ میراؔجی نے میرے لیے لکھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس پروگرام کی کامیابی میں فنکاروں کا بھی ہاتھ تھا۔ لیکن میراؔجی نے اس پر جس قدر محنت کی اس سے ہمارے لیے ریڈیو اسٹیشن پر یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ نشریات کو ایک نیا فنکار مل گیا ہے۔

دراصل اِس نئے ذریعۂ اظہار کے جملہ لوازمات کو جسے نشریات کہا جاتا ہے، سمجھنے اور اُن پر حاوی ہونے کے لیے میراؔجی نے بہت محنت کی تھی۔ اُنھوں نے متواتر مطالعہ، تجربے اور محنت سے اندازہ لگا لیا تھا کہ اظہارِ خیال کا یہ ذریعہ انسانی تقریر کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچانے ہی کا نام نہیں بلکہ ایک مخصوص فن ہے جس کی تکمیل کے لیے ذاتی جوہر اور اہلیت کا ہونا از بس ضروری ہے۔ ورنہ ٹیلی فون ہی کے چونگے کی طرح مائیکروفون کے سامنے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اصل اہمیت اُس میکانکی عمل میں مائیکروفون پر کچھ کہنے یا پڑھنے کی نہیں، بلکہ اُس تاثر کی ہے، جو مائیکروفون میں جاتے ہوئے نہیں بلکہ لاؤڈ سپیکر سے نکلتے ہوئے الفاظ پیدا کرتے ہیں۔ اگر بولنے والے کے جملوں نے سُننے والوں کی دلچسپی کو اپنی گرفت میں لے کر چند منٹوں کے لیے ان کے تصوّر میں سوئی ہوئی دُنیا میں زندگی کی لہر دوڑا دی تو سمجھ لیجیے کہ بولنے والا ان چند منٹوں کے لیے ضرور فن کار بن گیا۔ گویا ریڈیو کا کام بے بصر سُننے والوں کی ذہنی نگاہ میں ایسی بینائی یا بصیرت پیدا کرنا ہے جس کے تصوّر کے پردۂ سیمیں پر مطلوبہ تصاویر اُبھرتی ہوئی اور معنی پیدا کرتی ہوئی چلی آئیں۔ میراؔجی کی نشری تحریروں کی یہی خوبی تھی کہ وہ جس طبقے اور جماعت کے لیے لکھی جاتیں، اُنھیں کی ذہنی سطح اور فہم و فراست کے مطابق ہوتیں۔ سُننے والوں کے لیے اُن کا ساتھ دینا حد درجہ آسان ہوتا، اور اُس کی قوتِ متخیّلہ آسانی سے حرکت میں آ

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 232 (1,1)

جاتی۔ کچھ عرصے بعد لاہور سے میرا تبادلہ دہلی کر دیا گیا۔ میرے لاہور سے رُخصت ہونے سے دو تین دن قبل میرؔاجی مجھے اتفاقیہ طور پر ملنے آئے۔ اُنھیں دیکھتے ہی مجھے فوراً خیال آیا کہ میں انھیں ساتھ کیوں نہ کھینچ لے چلوں۔ دہلی میں میرے ذمے فوجی پروگرام کی تشکیل اور نگرانی کا کام تھا۔ جس کے لیے مجھے ایسے مصنّف کی ضرورت پیش آسکتی تھی جو میری فرمائش پر قلیل عرصے میں پروگرام لکھ کر دے سکتا۔ میں نے سوچا جب میرؔاجی میرے ڈھب کے پروگرام لکھ سکتے ہیں تو دہلی میں کسی نئے آدمی کو آزمانے کی بجائے انھیں کو ساتھ کیوں نہ رکھا جائے۔ میں نے فوراً اُن سے اپنا عندیہ بیان کیا۔ وہ کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر بولے کل بتلاؤں گا۔ اس کے بعد وہ ملنے نہیں آئے۔ آخر روانگی کا دن آگیا۔ اور میں دوست احباب سے رُخصت ہو کر ریلوے سٹیشن پر پہنچا۔ وہاں جا کر دیکھتا ہوں تو میرؔاجی مجھ سے قبل اپنا مختصر سا سامان ایک ڈبّے میں جما کر میرے انتظار میں پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں۔ اُنھیں دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا گویا میرے بازوؤں میں پھر سکت آ گئی ہے اور میرے ذمے نئے شہر میں جو کام سپرد کیا گیا ہے، اُس کی مشکلات آسان ہوگئی ہیں۔

دفتر میں چارج لینے کے دوسرے دن میرؔاجی اپنی رہائش کے انتظامات سے فارغ ہو کر میرے پاس پہنچ گئے۔ مگر اِدھر اُدھر کی باتوں کے دوران میں اچانک مجھے جس چیز کا پھر شدّت سے احساس ہوا، وہ میرؔاجی کی ہیئت کذائی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ اِس نئی جگہ پر شاید ان کی ظاہری حالت ان کے خلاف جائے۔ دِلّی ریڈیو کا عملہ ایک خاص قسم کے خوش پوش نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت پر مشتمل تھا جو کالجوں کے ماحول سے نکل کر تازہ تازہ اس نئے اِدارے میں وارد ہوئے تھے۔ اُن میں سے اکثر افراد کی نظریں ملنے والوں کی وضع قطع اور اُن کی پوشش پر ضرور جا کر اٹکتی تھیں۔ ظاہر تھا کہ اپنے عجیب و غریب حُلیے کی وجہ سے میرؔاجی ایسے افراد کے مجمع میں آسانی سے پنپ نہ سکتے تھے، جہاں اُن کا دوست تو کیا کوئی واقف تک نہ تھا۔ جب کمرے سے میرے دوسرے ساتھی چلے گئے اور میرؔاجی اور میں اکیلے رہ گئے تو میں نے کہا:

''میرؔاجی! میرا ایک مخلصانہ مشورہ ہے۔ آپ میرے ساتھ جس اِرادے سے یہاں آئے ہیں، اُس کو

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 233 (1,1)

عملی جامہ پہنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ اپنی اوّلین فرصت میں اپنے بے ڈھنگے بالوں اور مونچھوں کو صاف کروا دیں، اور پھر اپنے لباس کی طرف توجہ دیں۔ ان کپڑوں میں آپ پر ریڈیو کے ادیب ہونے کی بجائے لکڑہارے کا گمان ہوتا ہے۔

میرآجی میری تجویز سے بگڑ گئے۔ کہنے لگے آپ کو مسوّدات لکھوانا ہیں یا مجھ سے اپنی مصاحبت کے فرائض سرانجام دِلوانا ہیں۔ میں نے جو کچھ آج تک لکھا ہے، انھیں کپڑوں اور داڑھی مونچھ کی موجودگی میں لکھا ہے۔ یہ چیزیں میری سوچ بچار اور طرزِ نگارش میں پہلے حائل ہوئی ہیں، نہ اب ہوں گی۔ اِس لیے آپ کے مذاق کا لُطف اُٹھانے سے قاصر ہوں۔ آخر مجھے اپنا نقطۂ نظر سمجھانے کے لیے میرآجی سے پہلے ایک طویل مناظرے اور پھر مجادلے میں اُلجھنا پڑا۔ اس کے آخر میں میرآجی خفگی کے عالم میں کھڑے ہوئے اور جھنجھلا کر بولے: ''آپ شاید ثناء اللہ سے ملنا چاہتے ہیں۔ عرصہ ہُوا میں اُسے دفن کر چکا ہوں اور اب اس کی خاطر مَیں میرآجی کو نہیں مار سکتا۔'' اِتنا کہا اور غُصّے میں کمرے سے نکل گئے۔

اور پھر اُن کے جاتے ہی مجھے وہ سرگزشت یاد آ گئی جو لاہور میں مَیں نے دہلی کی طرف روانہ ہونے سے چند ہفتے قبل ایک دوست کی زبانی سُنی تھی۔ اور ثناء اللہ اور میرآجی کے متضاد کردار میرے تصوّر کی دُنیا میں اُبھر کر میرے سامنے آئے۔

ثناء اللہ خاں ڈارلاہور کے ایک طالب علم تھے جو میٹرک کے امتحان میں کامیابی کے بعد (کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ مرتّب) بعض وجوہ کی بنا پر مزید تعلیم کے لیے کالج میں داخل نہ ہو سکے۔ اتفاق سے اُن کے دوستوں میں سے ایک صاحب ایسے بھی تھے جنھیں ثناء اللہ خاں افسانہ نویس بنانے کی بڑی آرزو رکھتے تھے۔ اُنھیں ادبی مشورے دینے کے لیے یہ کبھی کبھی اُن کے کالج میں جا نکلتے۔ ان صاحب کی سیٹ کے برابر ایک بنگالی لڑکی بیٹھا کرتی تھی جس کا نام میرآسین تھا۔ ثناء اللہ خاں نے اُس لڑکی کو نہ جانے کس عالم میں دیکھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے اُس پر مر مٹے۔ میرآ کو اُس کے اعزا پیار سے میرآجی کے نام سے پکارتے تھے۔ ثناء اللہ خاں نے پہلا کام تو یہی کیا کہ

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 234 (1,1)

اپنا اصل نام ہمیشہ کے لیے ترک کر کے یہی نام اپنے لیے اختیار کر لیا۔ پھر میرؔا کے بال اُنھیں خاص طور پر پسند تھے۔ جب اُس کے بالوں تک ان کی دسترس نہ ہو سکی تو خود اپنے بال بھی میرا ہی کی تقلید میں بڑھا لیے۔ کچھ عرصے میں میرؔا کے گیان دھیان نے اُنھیں ایسا بے سُدھ کیا کہ اُنھیں نہانے دھونے اور لباس کا بھی ہوش نہ رہا۔ زندگی کے تمام مشاغل ختم ہوئے۔ اگر کوئی لَو باقی تھی تو وہ میرؔا کے دھیان کی تھی اور جو وقت اس سے بچ رہتا، وہ مطالعے کی نذر تھا۔ ثناء اللہ خاں ڈاریوں عشق کی آگ میں جل کر ہمیشہ کے لیے ختم ہوئے اور اُن کی راکھ میں سے جو نیا کردار میرؔا جی کے نام سے وجود میں آیا، وہ اپنے ادراک و استعداد، اپنی طبیعت، اپنے حُلیے اور اپنے اعمال و افعال کی وجہ سے اِس قدر جاندار ثابت ہوا کہ اس نے ثناء اللہ کے تمام نقوش احباب کے دل سے یوں مٹا کر رکھ دیے۔ گویا اس نام کا کوئی شخص زندگی میں کبھی تھا ہی نہیں۔

دوسرے دن میرؔا جی وقتِ مقررہ پر دفتر میں نہ دیکھے گئے تو شُبہ گزرنے لگا کہ وہ مُجھ سے شاید خفا ہو گئے ہیں۔ دل نے ملامت کی کہ میں نے اپنے نقطۂ نظر کو تسلیم کروانے کے لیے اُن سے خواہ مخواہ بحث میں اُلجھنے کی کوشش کی۔

دو دِن گزر گئے میرؔا جی یوں غائب تھے گویا دِلّی میں نہیں ہیں۔ گمان گزرنے لگا شاید وہ خفگی کے عالم میں لاہور چلے گئے ہیں اور اُنھیں پکڑنے کے لیے وہیں جانا پڑے گا۔ میں بد دِلی کے عالم میں اِس معاملے پر غور کر ہی رہا تھا کہ مجھے کمرے میں کسی نو وارد کی موجودگی کا احساس ہوا۔ نظر اُٹھائی تو میز کے سامنے ایک ایسے بزرگوار کو کھڑا پایا جن کا چہرہ تو مانُوس معلوم ہو رہا تھا لیکن یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ زندگی میں اِن سے کہاں ملاقات ہوئی تھی۔ اور پھر یک لخت مُنڈی ہوئی مونچھوں، کٹے ہوئے بالوں اور بدلے ہوئے کپڑوں کے باوجود میرؔا جی کے تبسم نے اُن کی نئی ہیئت کا راز فاش کر دیا۔ آج میرؔا جی عمر میں دس برس کم دِکھائی دے رہے تھے۔ اُن کی اُجلی قمیض اور صاف سُتھری پتلون سے پتہ چلتا تھا کہ اِس ہیئت کو اختیار کرنے سے قبل اُنھوں نے بڑی محنت سے کام لیا ہے۔ مگر جیسے ہی ہماری آنکھیں چار ہوئیں تو مجھے یُوں محسوس ہوا گویا اس حُلیے میں

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 235 (1,1)

میرآجی کچھ کھسیانے سے ہو رہے ہیں۔ اور پھر اپنی خفت کو کم کرنے کے لیے اُنھوں نے پان کی پُڑیا میری طرف بڑھائی اور مسکرا کر میری طرف دیکھنے لگے۔ مطلب یہ تھا گویا مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ کہو پسند آیا یہ نیا حُلیہ۔

میرآجی کی پُرانی ہیئت اُن کی شخصیت کا ایک ایسا ضروری جُز بن چکی تھی کہ اس کے بغیر میرآجی کو دیکھ کر مجھے خوشی کی بجائے قلق سا ہُوا۔ میرآجی کی اِس تبدیلیٔ ہیئت نے اُن کی ظاہری حالت میں ایک معقولیت ضرور پیدا کر دی تھی۔ لیکن آج اُن میں وہ کشش دکھائی نہیں دے رہی تھی جس نے روزِ اوّل مجھے ان کی شخصیت کو سمجھنے کی ترغیب دلائی تھی۔ پہلے تو میرے جی میں آئی کہ میرآجی سے صاف صاف کہہ دوں کہ جو تجربہ میں کرنا چاہتا تھا اُس کا نتیجہ کچھ بہت حوصلہ افزا ثابت نہیں ہوا۔ لیکن پھر میں نے مصلحتاً خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ اور ان کے نئے حُلیے کے بارے میں اپنی رائے کے اظہار کی بجائے اُن سے کام کے اس طومار کا ذکر چھیڑ دیا جو پچھلے دو دن سے میرے لیے سوہانِ رُوح ہو رہا تھا۔ میرآجی نے کاغذات اُٹھائے اور ساتھ کی میز پر بیٹھ کر اُن کا مطالعہ کرنے لگے۔ فاصلے پر سے مَیں جُوں جُوں اُنھیں دیکھتا، مجھے رہ رہ کر افسوس ہوتا کہ میں نے اُنھیں اپنا حُلیہ بدلنے کا مشورہ کیوں دیا۔ اور پھر مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ اگر میرآجی نے ثناء اللہ خاں ڈار کا گلا گھونٹ ڈالا تھا تو اُنھوں نے کوئی زیادتی نہ کی تھی۔ ثناء اللہ خاں بہرحال ایک غیر مشخص انسان تھے اور میرآجی بہرطور ایک حد درجہ پُرکشش شخصیت!

دِن گزرتے گئے اور آہستہ آہستہ دِلّی میں میرآجی کا حلقۂ احباب وسیع ہونے لگا۔ حلقے کی وسعت کے ساتھ میرآجی کے مشاغل میں بھی کئی گُنا اضافہ ہو گیا۔ اور جب ان مشاغل کی توسیع سے اُن کی آمدنی کے وسائل وسیع ہوئے تو میرآجی کی اکثر شامیں بھولا رام کے شراب خانے کی نذر ہونے لگیں۔ جیسے ہی چار بجتے میرآجی کی طبیعت بے قرار ہونے لگتی اور اُنھیں موری دروازے کی نکڑ والی اُس عمارت کی یاد ستانے لگتی جس میں بھولا رام کا بار مرجع خواص و عوام تھا۔ وہ جلدی جلدی کام سے فارغ ہو کر ہم مشرب دوستوں کو اکٹھا کرتے اور اُن کی معیّت میں سیدھے بار کا رُخ کرتے۔

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 236 (1,1)

یہاں رات گئے تک اُن کے رفقاء کے ہنگاموں کی آوازیں باہر سڑک پر سُنائی دیتیں۔

پھر میرؔاجی پر ''میراجیّت'' دوبارہ طاری ہونے لگی۔ایک دن دفتر میں آئے تو دیکھتا ہوں، قمیص کے نیچے کوئی چیز اُن کی گردن کے قریب اُبھری ہوئی ہے۔معلوم ہوا مونگے کی وہی پرانی مالا ہے جو حُلیہ بدلنے سے قبل ہمیشہ اُن کے گلے کا ہار ہوا کرتی تھی۔دو چار دن میں قمیص کے اُوپر شیروانی بھی نمودار ہوگئی اور پھر ہفتے میں دس دن بعد جسمانی غلاظت کے آثار دِکھائی دینے لگ گئے۔گویا میرؔاجی پھر میرؔاجی نظر آنے لگے۔

۱۹۴۵ء میں ہندوستانی فلموں پر ایک پروگرام مرتّب کرنے کا کام میرے سپرد کیا گیا۔ اس پروگرام کی تکمیل کے لیے مجھے بمبئی جانا تھا۔سفر پر روانہ ہونے سے تین چار دن قبل مجھے خیال آیا کہ پروگرام کا مسوّدہ مرتّب کرنے کے لیے میرؔاجی کو ساتھ لے چلنا چاہیے۔مگر اس وقت بظاہر میرؔاجی دِلّی کی گوناگوں رنگینیوں میں کچھ اِس طرح کھوئے ہوئے تھے کہ سفر پر چلنے کے لیے اُن سے کہنا کچھ بیکار دِکھائی دیتا تھا۔لیکن جیسے ہی میں نے سفر کا ذکر کیا وہ فوراً میرے ساتھ چلنے کے لیے آمادہ ہوگئے۔بمبئی پہنچ کر پہلے چار پانچ دن بڑی مصروفیت میں گزرے مگر ایک دن ایسا بھی آیا کہ میں بعض وجوہ کی بنا پر میرؔاجی کو کام پر ساتھ لے جانے کی بجائے اُنھیں نخشب جارچوی ہی کے ہاں مسوّدے کی تکمیل کے لیے چھوڑ گیا۔رات کو جب بہت دیر کے بعد میں واپس پہنچا تو دیکھتا ہوں نخشبؔ اور نواب زادہ شمشاد علی خاں بڑے فکر کے عالم میں گُم سُم بیٹھے میری راہ تک رہے ہیں۔مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکے اور مجھے اِشارے سے خاموش رہنے کے لیے کہا۔ معلوم ہوا میری غیر موجودگی میں شام کو میرؔاجی بہت زیادہ شراب پی کر گھر آئے تھے۔اُنھوں نے پہلے تو آتے ہی اُن آہنی گولوں سے جنھیں وہ ہر وقت ساتھ رکھتے تھے، کھڑکیوں کے تمام شیشے توڑ ڈالے۔پھر کھڑکی میں کھڑے ہو کر راہ گیروں پر آوازے کسے۔بعد میں ہر شخص کو صلواتیں سنائیں اور آخر میں غسل خانے کا فلش توڑ دیا۔

صبح جب میں اور میرؔاجی ناشتے کے لیے میز پر بیٹھے تو میں نے میرؔاجی کو رات کی حرکات

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 237 (1,1)

سے آگاہ کیا۔ کہنے لگے ''شاید میں زیادہ پی گیا تھا۔'' میں نے پوچھا: ''کس علّت میں؟'' بگڑ کر بولے ''منشی مہتاب دین کی آنکھیں خراب ہوگئی ہیں۔'' میں نے غُصّے سے کہا: ''مہتاب دین کی بینائی کو آپ کی شراب خوری سے کیا کام ہے؟'' بولے: ''مہتاب دین میرے والد ہیں شاید آپ سمجھتے ہوں گے میں یہاں بمبئی میں پروگرام لکھنے کے لیے آیا تھا۔ میں یہاں غم غلط کرنے آیا ہوں۔''

چند روز کے بعد مجھے دِلّی واپس جانا پڑ گیا اگر میں اُس وقت میرآجی کو ساتھ لے جاتا تو شاید صورتِ حال وہ نہ ہوتی جو بعد میں ہوئی۔ بہر حال جب ایک ہفتے کی غیر حاضری کے بعد میں بمبئی لوٹا تو دیکھتا ہوں، میرآجی اب وہ میرآجی نہیں تھے۔ اُن کے مشاغل اور حلقۂ احباب دِلّی کی طرح یہاں بھی بہت وسیع ہو چکا تھا۔ شراب کا دَوراب کم وبیش ہر وقت چلتا اور میرآجی بمبئی کی فلمی دُنیا کی رنگینی میں بتدریج کھوئے چلے جا رہے تھے۔

جب ہمارا پروگرام تیار ہو گیا تو میں نے میرآجی سے دِلّی واپس چلنے کو کہا۔ مگر اب کہاں، میرآجی اب کچھ اور ہی تھے۔ کہنے لگے: ''آپ جائیے میں دِلّی نہیں جاؤں گا۔ آپ لاہور سے مجھے دِلّی لائے میں آ گیا۔ آپ دِلّی سے مجھے بمبئی لائے تو میں چلا آیا۔ آگے چلیے تو تیار ہوں، پیچھے نہیں جاؤں گا۔''

چار سال اور گزر گئے اور پھر اچانک اطلاع آئی کہ میرآجی بمبئی سے بھی آگے چلے گئے ہیں، بہت آگے۔ جہاں سے واقعی کوئی نہیں لوٹتا۔

(نقوش، شخصیات نمبر جلد اوّل)

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 238 (1,1)

مختار صدیقی

اکیلا

اب تو وہ ظاہری پُتلا بھی نہیں رہا جس میں میرآجی کی روح سالہال اپنے اکیلے پن کے نوحے پڑھتی رہی۔ زندگی میں اُن کے باطن سے بہت کم لوگوں کو سروکار تھا، ورنہ دُنیا یہی دیکھتی رہی کہ اُن کا لباس ٹھیک نہیں، وضع قطع آج صاف سُتھری ہے تو مہینوں بدحال ہیں۔ بال بڑھتے بڑھتے لٹیں بن گئے۔ ورنہ بالکل صاف کر دیے گئے۔ کبھی کچز ٹائپ مونچھیں اور کبھی صفاچٹ ہیں۔ کبھی اچکن کے بند لگے ہیں، تو کبھی گلے میں مالا ہے اور اُن کے ہاتھوں میں لوہے کے گولے، کچھ کتابیں، تازہ بیاض اور گندے پنسلی مسودوں اور پُرزوں پر مشتمل کاغذوں کے مسوّدے ہیں۔

غرض میرآجی اپنی ظاہری ہیئت میں وہ سب کچھ ہیں جو اُن کے دوست، اُن کے بے شمار ملاقاتی اور نادیدہ مداح نہیں ہیں۔ مگر ذرا قریب آ کر یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ میرآجی کا باطن بھی وہ نہیں ہے جو اُن کے دوستوں اور ملاقاتیوں کا ہے یا ہوسکتا ہے۔

قریب آنے والوں کو اُن کی شخصیت کے اَن گنت پہلو اُلجھائے رکھتے تھے۔ وہ بیک وقت قدیم ہندوستانی اور بے حد جدید، بلکہ مغربی آدمی تھے۔ مگر یہ آمیزش بھی سیدھی سادی نہ تھی۔

اُن کی ہندوستانیت کو دیکھیں تو اس میں بھی بڑی اُلجھن تھی۔ اُن کا تیاگ اور رہبانیت ویدک دور سے تعلق رکھتی تھی، مگر ایک آن میں اُن کی روح ہزاروں برس کا عرصہ طے کر کے بھگتی تحریک میں سرشار نظر آتی تھی۔ کبیر، میراں بائی اور دادو کے ساتھ، کبھی رام اور رحیم کو ایک کہتی تھی، کبھی صحرا کی اس شعلہ آشام مہارانی کی طرح، ایک پیکر کو جسمانی پیار کی والہانہ شدت سے چاہتی تھی،

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 239 (1,1)

اور کبھی محض چھایا داد کے دوسرے شاعروں کی طرح کسی نامعلوم جذبے سے گیتوں میں جی ہلکا کر لیتی تھی۔

اُن کے جدید اور مغربی ہونے کو دیکھیں تو یہ نظر آتا تھا کہ وہ بڑے عقلیت پرست اور منطقی آدمی ہیں۔ اُن کا انداز سائنٹفک ہے۔ مغربی معاشرے کی آزادی اور حقوق، آزاد اور کارکن سماج کا تصور، مذہب، (میرا مطلب دین اور عقیدہ نہیں) سے آزاد خیالی میں وہ بالکل مغربی آدمی تھے۔ لیکن مغرب کی مادہ پرستی اور استعمار سے اُنھیں شدید نفرت تھی۔ ان چیزوں نے کبھی نو آبادیاتی راج، کبھی سامراجی نظام، کبھی جمہور پرستی کبھی آمریت بن کر جو کارنامے کیے ہیں میرا جی اُن سے بھی بے حد متنفّر تھے اور اپنی عقلیت پرستی کو مادہ پرستی سے الگ ثابت کرنے کے لیے اپنی تمام تر منطقی قوت اور ذہانت سے کام لیتے تھے۔

قدیم ہندوستانی اور جدید مغرب کی یہ آمیزش ایک طرف تھی۔ یوں اُن کی شخصیت کو دیکھیں تو وہ بے حد جذباتی آدمی تھے، لیکن اُنھوں نے اپنی چال ڈھال اور طور طریقوں میں ایک کھرّا پن، ایک عجیب درشتی پیدا کر رکھی تھی تاکہ ان کی عقلیت پرستی شرمندہ نہ ہو۔

شاعر نہ ہوتے تو قول و فعل میں جذبات کے اظہار کو بھی جذباتیت کہہ کر مردود قرار دیتے۔ جس معاشرے نے اُنھیں پیدا کیا اور پروان چڑھایا، اس سے متنفّر اور باغی تھے۔ لیکن یہ بغاوت اپنی ذات تک محدود تھی۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ اسے بدلنا نہیں چاہتے تھے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اُنھیں تشدّد اور شدید ردِّ عمل اور ان دونوں کے اظہار سے نفرت تھی۔ اس لیے سماج، مذہب اور کہنہ روایات کی بوسیدگی سے اُنھوں نے جو بغاوت کی اُسے اپنے لیے ایک مثالی چیز بنا دیا اور اپنی منطق سے ثابت کر دیا کہ ردِّ عمل ارتقاء کی صورت ہے۔ دوسرے چاہیں تو اس مرحلے پر پہنچ جائیں جہاں میں ہوں۔ اگر اِس بغاوت کو انفرادی اعمال کی صورت میں رکھنا ہے تو بہتر یہ ہے کہ اس سے گریزاں ہی رہیں۔ چنانچہ دیکھنے سُننے میں وہ بڑے پُر امن شہری تھے، پولیس اور ٹریفک کے جو قاعدے قانون سب توڑتے ہیں اور کوئی پوچھتا نہیں۔ میرا جی اُن کے بڑے پابند تھے۔

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 240 (1,1)

سماج کے جو قانون توڑ کر بھی ہم آپ شریف اور وضع دار ہی رہتے ہیں میرا جی اُن پر سختی سے عمل کرتے تھے۔ مگر کوئی شریف اور وضع دار کہے تو بگڑ جاتے تھے۔

اُن کی ضدوں اور عادتوں میں بڑا بچپنا تھا، مگر بقول خود، جنم جنم، صدیاں گزارنے کے تجربوں نے اُنھیں بڑا صائب الرّائے، بے حد ذی فہم بنایا تھا۔ وہ بڑے صاف اور تیز ذہن کے آدمی تھے۔ تجزیہ اور منطقی سیاق و سباق اُن کی زندگی تھے لیکن اُن کی نثر اور اُن کے گیتوں میں صاف ذہن کے کارنامے دیکھنے والوں کے لیے اُن کی نظمیں مبہم، اُلجھی ہوئی اور بے معنی تھیں۔

اِن باتوں کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ ہمدردی اور خدمت میں وہ اپنی نظیر آپ تھے۔ دوستوں کا ذکر کیا۔ ساتھی کارکنوں اور معمولی شناساؤں کے لیے وہ اتنا کچھ کرتے تھے کہ ہم آپ دوستوں کے لیے کر سکیں تو بہت بڑا احسان کریں۔ لوگوں کی عرضیاں لکھنے لکھوانے سے لے کر اُن کے قرض کا انتظام کرنا، اُن کی دفتری اور غیر دفتری اُلجھنیں سُلجھانا، اُن کے لیے ۔۔۔ ہومیوپیتھی کی دوا مہیّا کرنا، اُن میں ادبی جوہر کی نمود و نمائش، غرض اُن کے مرنے جینے کے سب کاموں کا ٹھیکہ اُن کے پاس تھا۔

اُن کی شخصیت کا یہ بیان ناممکن اور تشنہ ہے۔ ہمہ گیر شخصیت جو بیک وقت متضاد اور یکساں خصوصیت رکھتی ہو، ایک مخصوص کردار کی صورت میں پیش نہیں کی جا سکتی، نہ اس کی ہمہ گیری اور بوقلمونی چند خطوط کھینچ دینے سے واضح ہوتی ہے۔ اسے پیش کرنے کا ایک اَدھورا سا خاکہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایسی شخصیت کے یا تو مختلف پہلو، مختلف ذریعوں سے پیش کیے جائیں اور اِس طرح ایک خاکہ تیار کیا جائے اور یا یہ کہ اُس کے مختلف دور اُن لوگوں کی وساطت سے سامنے لائے جائیں جو ان مخصوص ادوار میں اس شخصیت کے ہر پہلو سے قریب آ سکے تھے۔

مجھے اُن کی شخصیت کے اِس دُھندلے اور تشنہ خاکے سے ایک بات واضح کرنی ہے اور وہ یہ ہے کہ میرا جی جہاں رہے اور جیسے رہے اپنے ظاہر و باطن میں اکیلے رہے۔ بچپن گجرات

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 241 (1,1)

اور سندھ میں گزرا تو اُن کے بلوغ اور بیداری نے دوسرے بچوں کو اُن کا ساتھی نہ بننے دیا۔ لڑکپن اور جوانی کی ابتداء ہر کسی کو اپنے خول میں سمٹنے پر مجبور کرتی ہے اور اُنھوں نے اپنے امتیاز کو پالیا تھا۔ اِس لیے نہ ماں باپ اُن کو سمجھ سکے، نہ سکول کی تعلیم اُنھیں کچھ سمجھا سکی۔ جوانی آئی تو ایک محبت ہوئی جو کئی برس بعد دوسری محبّت میں تبدیل ہو کر گویا اپنی منزل پر پہنچ گئی۔ اِس دوران میں اُنھیں اپنے اکیلے پن کا احساس ہو چلا تھا اور کتابیں اور لاہور کی نہر کا کنارا ہی اُن کا خاموش ساتھی بن سکتا تھا۔

جب اِن مرحلوں سے گزر کر اُنھوں نے اپنے آپ کو پالینا شروع کیا تو قدیم ہندوستان اور جدید مغرب کا یہ امتزاج اُن کے سامنے آیا، جس میں ایک طرف کبیر اور میراں بائی، چنڈی داس اور کوی وِدیاپتی اُن کے ساتھی بن سکتے تھے اور اُن کے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ جی سکتے تھے، اور دوسری طرف ایلس، رسل، ایڈگر ایلن پو اور والٹ وٹمین اُس کا ساتھ دے سکتے تھے۔

جذبات کی زندگی اور اس کی نہج کا یہ حال تھا کہ بنگال کی جس سانولی بیٹی نے محمد ثناء اللہ ڈار کو میراجی کا نام، کردار اور زندگی دی، اُن کی ساتھی تو کیا، اُن کا آدرش بننے سے بھی دُور تھی۔ کیونکہ ظاہر کی دُنیا میں یہ بنگالی اور ہندو تھے۔ اس کے برسوں بعد دِلّی میں اُنھیں یہ غلط فہمی ہوئی تھی کہ جو بنگالی لڑکی ظاہر اور باطن دونوں دُنیاؤں میں اُن کی نہیں ہو سکی تھی اب وہ کم سے کم ظاہر دُنیا میں اُن کی ہو سکے گی۔

اب کی بار وہ چمپئی رنگ کی ایک تیز طرار مسلمان لڑکی تھی۔ میراجی نے اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں جن میں ہمیشہ سُرمے کی تحریر رہتی تھی، وہ گہرائیاں دیکھیں جو اُن کے دل میں تھیں اور اُس کی آواز میں وہ کھنک پائی جو بعد کو اُنھوں نے شوجی کے راگوں جے جے ونتی اور گوری سے متعلق کی۔

اور اب چونکہ وہ اپنے خیال میں بڑے دُنیادار اور سمجھ دار آدمی بن گئے تھے، اِس لیے اُنھوں نے اپنے منطقی ذہن سے کام لے کر اُسے اپنانے کی بڑی روایتی سکیم بنائی۔ دلیل یہ تھی کہ چونکہ اُسے ہم سے یک گونہ رغبت ہے، اِس لیے سیدھی طرح اُسے پیغام بھجوایا جائے۔ اس کے

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 242 (1,1)

جواب میں اُس کا ردِ عمل تین صورتوں میں ظاہر ہوسکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ مان جائے، تو اور کیا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ وہ میری بے قاعدہ زندگی اور وضع قطع سے بدک کر اِنکار کرے، اس کی ضمانت میرے ذمہ دار دوست جو افسر بھی ہیں، دے دیں گے۔ تیسری بات یہ ہوسکتی ہے کہ محبت کو جیون ساتھی بنانے کی شرط پیش کرنے گی، سو پھر اظہارِ محبت کا موقع نکل ہی آئے گا جو یوں بڑی جذباتیت ہے۔۔۔۔ مگر غیر متوقع چیزوں اور جدّت کا یہ علمبردار اس روز مرہ اور روایتی کام میں جدّت اور غیر متوقع واقعات کی امید نہ رکھتا تھا۔ چنانچہ پیغام کے جواب میں اُس لڑکی نے کہا کہ:

''اس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں تو میرا جی کو اپنا بزرگ سمجھتی ہوں!''

اور اِس طرح وہ پھر اکیلے ہو گئے۔

دوستوں اور شناساؤں میں اُن کی شخصیت کے چند پہلوؤں کے سلسلے میں اور وہ بھی کچھ دُور تک اُن کا ساتھ دینے والے لوگ ہیں۔ اُن کے قریب آ کر، اُن کی شخصیت میں کھو جانا، اس کے پہلو، اس کے ترکیبی عناصر، ان عناصر کی آمیزش اور اس کا کُلّیہ اس کی استثناء وغیرہ کا مطالعہ ہی فرصت نہ دیتا تھا کہ کوئی ان کا ساتھ دے سکے۔ ماضی، حال اور مستقبل کے جن زمانوں سے وہ متعلق تھے، وہ غیر معمولی تھے۔ ماضی میں اُن کا ساتھ دینے والے جوکوی اور تیاگی اور بھگت تھے، لوگوں نے اُنھیں مستقبل کا آدمی سمجھا تھا، حال میں اُن کا ساتھ دینے والے لوگ اس ملک کے باسی نہیں تھے اور مستقبل میں کون کسی کا ساتھ دے سکتا ہے۔

اُنھیں اِس اکیلے پن کا احساس بہت دیر سے تھا، لیکن یہ خیال بھی تھا کہ کوئی تنہائی، کوئی دُوری ایسی نہیں جو قائم رہ سکے۔ اپنی موت سے تین سال پیشتر یہ خیال پختہ ہوا اور اُنھوں نے خود لکھا:

اے پیارے لوگو!
تم دُور کیوں ہو
کچھ پاس آؤ

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 243 (1,1)

آؤ کہ مل لیں

اے پیارے لوگو!
مَیں تم سے مل کر بہتر بنوں گا
ایسے اکیلے
یوں روتے روتے
آنسو بہیں گے
اور کچھ نہ ہوگا

لیکن جس طرح وہ چاہتے تھے، اور شاید اُن کے سلسلے میں ''پیارے لوگوں'' کو جس طرح قریب آنا چاہیے تھا، کوئی قریب نہ آسکا۔۔۔۔ یہ دُنیا کا قاعدہ ہے، وہ اپنے ساتھ نہ چلنے والوں کو اپنے میں سے نہیں سمجھتی۔ خود میرآجی کے نفسی اُلجھاوے اس منزل پر پہنچ چکے تھے جہاں سے لوٹ کر آنا، یا وہاں سے ایک نئی پگڈنڈی پر چل نکلنا ناممکن تھا۔ اِس لیے خود آگے بڑھ کر اس اپنائیت میں پہل کرنا (جس کی تمنا نے اُنھیں یوں اکیلا کیا تھا) اُن کے لیے نہ تھا۔۔۔۔ اِس اپنے پن کے ساتھ جسم اور روح کی جو بالیدگی، جو نمو اور تکمیل سے وابستہ ہے، اُن کے مقدّر میں نہ ہوسکی۔ اور ستم یہ ہے کہ اس سے وہی شخص محروم رہا جو اس بالیدگی اور تکمیل کا بہت زیادہ عرفانی تھا اور جسے اِس ازلی محرومی اور شدید احساس ہی نے جنسی لذّتوں، پیراہنوں کی خوشبو، دامنوں کی لہروں اور سیمیں پنڈلیوں کا وجدانی بنا دیا تھا۔۔۔۔ جسم کی یہ بالیدگی اور روح کی تکمیل و نمو جو سرمستیاں اور سکون لاتی ہے، میرآجی کے زبردست جنسیاتی اور فلسفیانہ مطالعے نے اُن پر بے طرح واضح کیے تھے۔ لیکن اس کے حصول یا کوشش کے لیے جو خلیے اور جذبے درکار ہوتے ہیں، وہ شاید اُن کے جسم اور دماغ میں موجود نہ تھے۔ اِن حالات میں اُن کی حیاتِ نفسی کا مزید کج دار ہونا عجیب نہ تھا بلکہ ایک معمولی بات تھی، اور میرآجی اِسے معمولی بات ہی سمجھتے اور ثابت کرتے تھے۔

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 244 (1,1)

حالانکہ یوں دیکھنے میں اُن کی حیاتِ نفسی معمولی ہونے سے کوسوں دُور، عجوبہ صحراؤں میں اکیلی بھٹکتی پھرتی تھی۔

لیکن اُنھوں نے جسم و رُوح کی بالیدگی اور سکون کے لیے یہ کچھ طریقے ایجاد کر لیے تھے۔ ایک تو شراب کی مستی تھی اور پھر تنہائی سے اُکتا کر، محرومی میں بقولِ خود ''اپنے آپ سے کھیلنے'' کا مشغلہ تھا۔ بہت جلد یہ دوسری بات بھی وہ نہ رہی اور صرف شراب رہ گئی۔۔۔۔۔ سستی اور گھٹیا شراب، جو کبھی گہرے بھورے رنگ کی آگ تھری ایکس رم تھی، کبھی رُہتک کا ''سفیدا'' کبھی گہرے نارنجی رنگ کا ''سنترہ''، لیکن سرمستی اور بالیدگی لانے والی یہ چیز کبھی اچھی اور عمدہ نہ ہوتی تھی۔ کفایت اور اسراف کے متعلق میر آجی کے خیالات دُنیا جہان سے نرالے تھے۔ اِس لیے اچھی یا انگریزی شراب کو وہ بڑی فضول خرچی اور نالائقی سمجھتے تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اُن کی آمدنی اور اس میں جتنی شراب اُنھیں چاہیے ہوتی تھی، انگریزی شراب کے لیے موزوں بھی نہ تھی۔

ہوتے ہوتے ہم نے یہ بھی دیکھا کہ کس طرح اُن کے بے حد قوی ذہن پر اِس سرمستی اور بالیدگی نے غلبہ پانا شروع کیا اور اس کا طریقہ ظاہر تھا۔ اُن کا جسم ہمیشہ سے نحیف تھا۔ شراب میں پانی یا سوڈا ملانا وہ شراب کو نجس کرنے کے برابر سمجھتے تھے۔ چنانچہ رگوں کو چیر چیر کر دوڑنے والی آگ نے اُن کا جسم اندر سے کھانا شروع کیا اور وہ اسی کے ہو گئے۔ اُن کی زبردست قوتِ کار ضائع ہونے لگی کیونکہ اُن کی مالک شراب کا تقاضا یہ تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ اُسی کی خدمت میں بسر کریں اور اِس خدمت کے لیے وہ اکیلے ہی درکار تھے۔

اور پھر بمبئی جا کر اُنھوں نے بڑی مصیبتیں سہیں۔ آخر نہایت مخلص دوستوں کے بار بار کہنے سُننے اور بگڑنے پر اُنھوں نے شراب چھوڑ دی اور دُنیا میں کامران ہونے کی ٹھان لی۔ لیکن اب شاید کامرانی کی کاوشوں کا وقت نہ رہا تھا۔ اپنے اندر زندگی گزارنے اور سب کے ساتھ چلتے رہنے سے کوئی کب تک جی سکتا ہے۔ اُنھوں نے آخری سنبھالا لے کر یہ تو طے کر لیا کہ ایک دفعہ اپنی مفلوج کارکردگی کو پھر قوی اور زندہ قوت بنا دیا اور آخری دور میں کام کے اعتبار سے اپنے

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 245 (1,1)

اوّلین دور کی یاد تازہ کی۔ چنانچہ ''خیال'' کے مرتّب اور رُوحِ رواں بن کر اُنھوں نے اِداریے لکھے، ترجمے کیے، نظموں اور غزلوں کی وہی آمد زندہ کی جو کبھی ''ادبی دُنیا'' کے دور میں اُن کا خاصہ تھی۔ اور مستقل تصانیف پر بھی توجہ کی۔۔۔۔۔ لیکن جہاں تک جیئے جانے کا تعلق ہے، اُن کا جسم جواب دے چکا تھا، اور اختر الایمان کے خطوط تو یہ کہتے ہیں کہ اُن کی روح بھی جو اپنی جسمانی بالیدگی، نمو اور تکمیل کو ترس گئی تھی، اُنھیں جواب دے چکی تھی۔ پھر بھی اُنھوں نے جسم و روح کے ملاپ اور ان کی نمو کے لیے ایک آخری کوشش کی جس میں اُنھوں نے اپنا سب کچھ داؤں پر لگا دیا۔۔۔۔ اب کی دفعہ اس کوشش کا جسمانی پیکر ایک پارسی نژاد لڑکی تھی۔

اور جب پہلی اور دوسری کوششوں کی طرح یہ کوشش بھی نامرادی کے اندھیروں میں گم ہوئی تو میرا جی کا ذہن اور جسم دونوں ردِّ عمل اور صدمے اور محرومی کے تسلسل کی تلخیوں کو برداشت کرنے کے ناقابل ہو چکے تھے۔

اِس حالت میں شراب ایک جسمانی ضرورت بن کر پھر اُن پر چھا گئی۔۔۔۔۔ اور زندگی کو ایک بڑی نعمت سمجھنے والا یہ تیاگی، زندگی سے اُسی طرح مایوس ہو گیا جس طرح اپنے اکیلے پن میں برسوں پہلے ہوا تھا۔ اِس صورت میں اُن کی ظاہری وضع بھی وہی بن گئی جو دِلّی جانے سے پہلے تھی۔ اُن کی مونچھیں پھر کچھ ٹائپ ہو گئیں اور بال پھر لمبے ہو گئے۔

اب کی بار وہ ان ''پیارے لوگوں'' سے مایوس ہو چکے تھے جن کو وہ قریب لانا چاہتے تھے، جن سے مِل کر وہ بہتر بننا چاہتے تھے کیونکہ ہر بار وہ اکیلے رہے تھے۔ کوئی قریب نہ آیا تھا اور اُنھیں بقولِ خود، ان لوگوں سے ''دُور ہی دُور اور دُور ہی دُور'' اکیلے چلتے رہنا تھا، اور اسی طرح اکیلے چلتے چلتے، اکیلے ہی اپنی منزل پر پہنچ جانا تھا۔

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 246 (1,1)

مظہر ممتاز

یہ میرا جی ہیں

(بحیثیت انسان چند ملاقاتیں، چند تاثرات)

سن اُنیس سو چھیالیس دسمبر کی ایک صبح ۔۔۔۔۔۔ جبکہ حیدرآباد شہر کُہرے میں لپٹا ہوا تھا اور دُور دُور تک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز کفن اوڑھے ہوئے ہے۔ میں حیدرآباد ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم کی گول، لانبی ستون سے لگا کھڑا تھا اور میری نظریں کہرے میں اُس طرف لگی ہوئی تھیں جس طرف سے ٹرین آتی تھی۔ جب میری نظریں شبنمی دھندلکے کو دیکھتے دیکھتے تھک گئیں اور فرش پر گرے ہوئے سنتروں کے سرخ چھلکوں کو دیکھنے لگیں تو ایک لمحہ بعد دھندلکا چھٹا، دھندلکے کو چیرتی چارتی ''بمبئی ٹرین'' پلیٹ فارم پر آلگی۔ شور وغل مچا، لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے دوڑنے لگے۔ اِتنے میں اخترالایمان نے مجھے پکارا۔ میں اختر کی جانب لپکا۔ اختر سے ہات ملایا۔ پھر اخترؔ نے میرا تعارف اپنے ساتھیوں سے کرایا۔ اُن میں جو درمیانہ قد کے تھے اختر نے اُن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''اِن سے ملو، یہ میرا جی ہیں۔'' میں نے آگے بڑھ کر ان سے ہات ملایا۔ جب میں نے اپنی اُنگلیوں کو میرا جی کی اُنگلیوں سے جُدا کیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے کسی برف کے چھوٹے ٹکڑے پر ہاتھ رکھا تھا۔ اور پھر میرا جی کی اُنگلیاں اِتنی پتلی اور نازک تھیں کہ مجھے اپنی اُس محبوبہ کا خیال آیا جس سے میں نے پہلی بار (نئی دِلّی کی اورنگ زیب روڈ کی ایک کوٹھی کے خوب صورت ڈرائنگ روم میں) ہات ملایا تھا۔ لیکن میری محبوبہ کی نرم اور نازک انگلیوں میں گرمی کا اثر زیادہ تھا۔ میرا جی کی برفیلی اُنگلیوں سے مجھے نفرت کا احساس ہوا تھا۔ میں

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 247 (1,1)

ابھی کچھ کہنے ہی کو تھا کہ میراجی کے پتلے ہونٹوں سے بھاری آواز نکلی ''مظہر ممتاز صاحب! میں آپ کے خطوط پڑھتا رہا ہوں، آپ نے اختر کو خطوط لکھ کر اُردو ادب کی کوئی خدمت نہیں کی۔''

میں چپ رہا جیسے میں اپنے اُستاد کے سامنے کھڑا ہوں۔

پھر اختر نے میرا تعارف اپنے دوسرے گورے چٹے ساتھی سے کراتے ہوئے کہا ''اِن کو تم نہیں جانتے، یہ تمھارے ہی شہر میں رہتے ہیں، نواب اکبر یار جنگ کے نواسے آج کل پونا میں LAW کر رہے ہیں۔ یہاں لال ٹیکری پر ان کا مکان ہے اور مکان کا نام مجھے ان کے نام سے زیادہ پسند ہے۔ ویسے ان کا نام ہے نورالحق اور مکان کا نام ہے منظرستان۔''

میں اِتنے وقفے میں نورالحق سے بات ملا چکا تھا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میں کسی امریکی ایکٹر سے بات ملا رہا ہوں جو ایک لمحہ بھی خاموش نہیں رہنا چاہتا۔۔۔۔نورالحق کی شکل و صورت، اُن کے جسم کے ڈیل ڈول سے مجھے BOB HOPE کا خیال آیا اور اُن کی باتیں سُن کر نہ جانے کیوں مجھے شفیق الرحمٰن کی یاد آئی۔

اِتنے میں قلی نے آواز دی، اور ہم سب یونہی خاموشی سے چلتے چلتے اسٹیشن کے باہر آ گئے۔ اور پھر نورالحق کے مکان منظرستان تک پیدل چلتے رہے جو اسٹیشن کے پچھواڑے میں ہی تھا۔ میں راستہ بھر میراجی کو دیکھتا رہا۔ سب سے پہلے جو تاثر میرے ذہن نے قبول کیا وہ یہ تھا ''میراجی یہودی ہیں۔'' میرا ذہن ایک لمحہ میں حضرت ابراہیمؑ سے اُڑ کر آئن سٹائن تک گیا اور پھر میری نظریں میراجی پر جمی رہیں۔ میں نے اپنے تاثر میں کوئی فرق محسوس نہ کیا بلکہ مجھ میں شدت سے یہ احساس بڑھنے لگا میراجی واقعی یہودی ہیں۔ جب گھر پہنچ کر کچھ اور باتیں ہوئیں اور اختر نے بتایا کہ میراجی کے والد منشی مہتاب دین بہت پرہیزگار مسلمان تھے، پچھلے سال اُن کا انتقال ہو گیا۔ اِس کے باوجود میں نے میراجی میں مسلمانوں کی سی کوئی بات نہیں دیکھی، جو اُن کے نام ثناء اللہ کی غمازی کر سکے۔ اس سے پہلے ان کے تخلّص میراجی کی مناسبت سے میں ان کو ہندو سمجھتا رہا تھا۔ جب ان کو دیکھا تو ان میں ہندو پن کی بھی نمایاں بات نہ پا سکا۔ اور میں اپنے اوّلین تاثر کے

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 248 (1,1)

ثبوت میں بھی کوئی ایسی خصوصیت نہیں دیکھتا تھا جو ان کو یہودی ثابت کر سکے۔ پھر بھی میرے ذہن نے (غیر شعوری طور پر) ان کو یہودی کی شکل وصورت میں قبول کیا۔ اور میں ۔۔۔۔۔۔۔۔ میراجی میں سب سے پہلے وہ چیزیں بھی دیکھنا چاہتا تھا جس کا ذکر اُن کے بعض ناقدوں نے کیا تھا۔ میں نے اب جو دیکھا تو ان میں بہت ساری چیزیں نہیں تھیں۔ اُن کے گلے میں قمیص کے نیچے آبنوسی لکڑی کے چھوٹے چھوٹے گولوں کی مالائیں نہیں تھیں۔ نہ اُن کے بال سادھوؤں کی طرح میلے اور غلیظ تھے۔ اُن کی مونچھیں بھی اُن کے ہونٹوں سے آگے نہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اُن کے دُبلے پتلے جسم پر لانبا ڈھیلا ڈھالا گرم کوٹ بھی نہیں تھا اور نہ اُن کے سر پر گرم اُونی ٹوپی تھی۔ اور نہ اُن کے بغل میں پیوند ور پیوند لگی ہوئی چھتری تھی۔ نہ اُن کے پیروں میں اُکھڑے ہوئے تلے کے بُوٹ تھے۔ اِس کے برخلاف وہ ننگے سر تھے۔ بالوں کو کنگھی سے ٹھیک کیا گیا تھا۔ اُن کے جسم پر چاکلیٹی رنگ کی شال کے نیچے سفید بش شرٹ تھی۔ اور اُن کی پتلی ٹانگوں میں اِستری کی ہوئی پتلون تھی اور پیروں میں پنجابی سینڈل تھی۔ البتہ جب میں نے اُن سے ہات ملایا تھا تو میری نظریں، اُن دو پنّی لگے لوہے کے گولوں کو دیکھ سکی تھیں۔ جن کو اُنھوں نے دائیں ہات کی ہتھیلی سے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی میں رکھ لیا تھا۔ منظر ستان میں جو باتیں ہوئیں اس سے دوسرا تاثر میں نے یہ لیا، میراجی کے سر کے بال گردن سے نیچے مونڈھوں تک لانبے لانبے نہ ہوتے۔ ان کی مونچھیں اتنی گہری نہ ہوتیں۔ ان کے جسم پر یہ چاکلیٹی شال لپٹی نہ ہوتی اور میراجی اپنے ذہنی اور جسمانی ارتقاء کو بدستور ایک نارمل آدمی کی طرح قائم کیے رکھتے تو بہت ممکن تھا میراجی ۔۔۔ ثناء اللہ ہی رہتے ۔۔۔۔۔۔ میں نے یہ بھی تاثر قائم کیا تھا، یہ آدمی اپنی جوانی کے ابتدائی زمانے میں خوب صورت ہوگا کیونکہ میراجی کے سانولے چہرے پر لانبی سیدھی اُبھری ناک، چوڑی پیشانی، پتلے ہونٹ، گول ٹھوڑی سے ایسا معلوم ہوتا تھا وہ یقیناً خوب صورت ہوں گے (ان میں کشمیری نسل کا خون جو تھا)۔!!

میراجی دو چار روز تک مجھ سے بہت کم بولا کرتے، کبھی آزادی کے سلسلے میں ایک دو

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 249 (1,1)

باتیں کہہ دیں، کبھی چاند تاروں کی سیر کی باتیں کرلیں۔ کبھی ادیبوں کی خانگی زندگی پر ان کے تجربے کہہ دیے۔ یہ سب باتیں وہ تکلّف میں کہتے رہے اور جب وہ کچھ بے تکلّف ہوئے اور ایک روز جب کہ اختر الایمان اور نورالحق۔۔۔۔فلم پروڈکشن کے سلسلے میں ایک سرمایہ دار کے پاس گئے ہوئے تھے اور ڈرائنگ روم میں کوئی نہ تھا تو میں نے میراجی سے وہ تمام باتیں پوچھیں جن کی ترتیب میں نے پہلے سے دے رکھی تھی۔ میں نے کہا تھا: ''میراجی مجھے آپ کا یہ نام پسند نہیں۔ مجھے یہ بھی پسند نہیں کہ آپ ایک بے وفا ہندو لڑکی کی جدائی میں اپنی زندگی برباد کرلیں۔ میرا سین جب آپ کو نہیں چاہتی تھی تو آپ کا اُس سے محبت جتانا محض جنون ہے۔''

میراجی کچھ دیر چپ چُپ سے رہے، اُن کے چہرے پر مختلف رنگ آئے اور گئے اور مجھے اُن کی گہری اور روشن آنکھوں میں عجیب بے قراری سی نظر آئی۔ کچھ دیر وہ اُس گُل دان کو دیکھتے رہے جو ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں چغتائی کی تصویر کے نیچے کشمیری لکڑی کی تپائی پر رکھا ہوا تھا۔ مجھے ایسا دکھائی دے رہا تھا، وہ گُلدان میں رکھے ہوئے صرف اُس زرد پھول کو دیکھ رہے ہیں جو مُرجھا کر گُل دان کے باہر ڈھلک چکا تھا۔ اِتنے میں وہ اپنے پیروں کو پنجابی سینڈل سے نکال کر کرسی پر اِس طرح رکھ چکے تھے جیسے کوئی سادھو گیان دھیان میں مصروف ہو۔ پھر اُنھوں نے میری طرف دیکھا جیسے کچھ راز کی باتیں کہنا چاہتے ہوں مگر وہ خاموش رہے اور فرانسیسی دریچے کے باہر سڑک کی دوسری جانب جرمن ڈیزائن بنگلے پر لپٹی ہوئی پھولوں کی بیل کو دیکھنے لگے جو دیوار کے آخری کونے کی طرف رینگتی جارہی تھی۔

ابھی تک میراجی میرے سوال کے جواب کے لیے شاید مواد اِکٹھا کر رہے تھے، یا میرے سوال نے اُن کے خوابیدہ جذبات کے تاروں کو جھنجھنا دیا تھا۔ کیوں کہ ان کی دیر تک خاموشی نے میرے ذہن کو اُلجھاوے میں رکھا۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا یہ آدمی مغرور ہے اور یہ خاموشی محض FRAUD کی خاطر ہے۔

میں نے جب دیکھا وہ صرف فضا میں ہی دیکھتے جارہے ہیں اور کچھ کہتے نہیں، میں

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 250 (1,1)

نے پھر پوچھا: ''میرا سین واقعی اِتنی حسین تھی کہ آپ اُس سے محبّت کرنے لگے۔''

اب کی دفعہ میں نے محسوس کیا کہ میرا جی کو ہونٹوں پر ہلکی ہلکی تبسّم کی لہریں پھیلیں اور اُنھوں نے ساحرانہ انداز سے مجھے دیکھا اور گُل دان پر نظریں جماتے ہوئے کہا: ''ممتاز صاحب! آپ کی پہلی بات نے مجھے خوش نہیں کیا۔ آپ نے میرے دھیان کو توڑ دیا تھا، جب آپ نے دوبارہ میرے دھیان کو توڑا تو میری نظروں میں وہ منظر جاگ گیا جس کی مجھے تمنا تھی۔ بس یوں سمجھ لیجیے وقت وقت کی بات ہے میں نے میرا سین سے کوئی رسمی محبت نہیں کی۔ میرے تخیّل میں عورت کے خدوخال کا جو تصوّر تھا اُس کو میں نے میرا سین کے کافر جسم میں مکمل پایا۔ میں اُس کے قریب گیا اور قریب گیا اور قریب ۔۔۔۔ لیکن میری قربت نے اُسے مجھ سے دُور کر دیا۔ اگر میں دُور ہی رہتا تو شاید وہ میرے قریب رہتی۔ وہ مجھ سے دُور چلی گئی۔ راوی کے کنارے سے دُور، برہم پترا کے ڈیلٹاؤں سے پرے چلی گئی اور اُن دُھندلکوں میں کھو گئی جن کو صرف میرا ذہن دیکھ سکتا تھا۔ مجھے اس کا غم نہیں کہ اُس نے مجھے مُنہ نہیں لگایا، بلکہ اس کا غم ہے کہ اُس نے میرے اُس جذبے کی قدر نہیں کی جو نسل در نسل بعد مجھ میں ''بھی'' پیدا ہوا تھا۔ جب وہ قدرے خاموش ہوئے تو میں نے یہ بھی پوچھا تھا: ''آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟''

میرا جی کا مُوڈ شگفتہ ہو رہا تھا: ''بات یہ ہے ممتاز صاحب! میں نے میرا کو حاصل کرنے کے لیے ذہنی اور جسمانی قوت لگائی تھی اور اب میں نہیں چاہتا کہ دوبارہ اُسی طرح کی قوت لگاؤں۔''

''میرا جی! آپ راضی ہو جائیے، میں حیدرآباد میں آپ کی شادی کرا دوں گا۔''

''مجھے ایسی عورت نہیں چاہیے جو مجھ سے دُور رہے، اور اچانک میری زندگی میں شامل ہو جائے۔ اس اجنبی پن سے جو عورت میری محدود زندگی کے دائرے میں آئے گی، میرا خیال ہے وہ دوسرے روز ہی مجھ کو چھوڑ کر بھاگ جائے گی۔ میں لکھنؤ جاؤں گا وہاں لطیف کی بیوہ بہن سے شادی کر لوں گا۔ وہ میری طبیعت سے واقف ہے۔ لیکن وقت کے گھیرے نے مجھے ایسے

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 251 (1,1)

گھیرا ہے کہ میں چاہوں بھی تو نکل نہیں سکتا۔۔۔۔"

اِتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے اور پھر گُل دان کے مُرجھائے زرد پھول کو دیکھتے دیکھتے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔۔۔۔ کچھ دیر تک وہ آنکھیں بند کیے رہے جیسے وہ میرا سین کو تصوّر میں دیکھ رہے ہوں۔ کیونکہ میں نے یہ بھی دیکھا کہ اُن کے ہونٹوں پر تبسم کی لہریں ڈوبتی اُبھرتی جا رہی تھیں۔ دفعتاً چونک کر اُنھوں نے آنکھیں کھولیں اور کہنے لگے: "میرے قارئین کو میری محبت کی داستان سُننے کا کیوں شوق ہے۔ دُنیا میں اور بھی انسان محبت کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ میری محبت دانتے کی طرح ہے۔ ایک بات یاد رکھیے ممتاز صاحب! انسان کی زندگی میں ایک "لمحہ" کی بڑی اہمیت ہے۔ آپ کو اسٹرانومی اور اسٹرالوجی سے شوق ہو تو اس کی اہمیت سمجھ میں آسکتی ہے۔ جب آپ میری داستان سُننا چاہتے ہیں تو سُن لیجیے۔۔۔۔۔۔۔۔

میرے دل میں بچپن سے ہی عورت کی محبت جاگتی رہی جب میں بچہ تھا تو مجھے اپنی ماں سے بے پناہ محبت تھی اور اب بھی میں اپنی ماں کو چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے والد سے محبت کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ کیونکہ وہ بہت مصروف آدمی تھے۔ ریلوے کی ملازمت نے اُن کو گھر سے زیادہ باہر کا بنا دیا تھا۔ وہ N.W.R میں انجینئر تھے۔ ابھی میں چھ سات سال ہی کا تھا کہ اُن کا تبادلہ پنجاب سے گجرات کاٹھیاواڑ کے اُس تاریخی علاقے میں ہو گیا جس کو چمپانیر کہتے ہیں اور پھر اُس علاقے میں ہمیں ایسے اسٹیشن پر قیام کرنا پڑا جو غیر آباد تھا۔ میں نے ایسی کچھ باتیں آج سے چار سال پہلے حسن عسکری کے لیے بھی لکھی تھیں۔۔۔ ہاں تو اُس ریلوے اسٹیشن کا نام تھا ہالول۔۔۔ وہاں مجھے پہلی دفعہ چوکیدار کی لڑکی جمنا کے زیریں جسم کے حصّوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ مجھے پہلے کراہت محسوس ہوئی لیکن میرے تحت الشعور میں اس منظر کو دوبارہ دیکھنے کی خواہش زندہ رہی۔ پھر جب ہم لوگ ہالول سے اُٹھ کر ملتان آ گئے تھے تو مجھے وہاں بھی ایک ایسے ہی منظر کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مگر یہ منظر کچھ دُھندلا دُھندلا میرے لاشعور میں جاگتا رہا۔ ملتان ریلوے اسٹیشن کے اسٹیشن ماسٹر کی لڑکی ایک روز ہمارے گھر کچھ سوغات لے آئی۔ شاید اُس کے والد نے بھیجی تھی جو

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 252 (1,1)

پچھلے روز لاہور سے لوٹا تھا۔لڑکی کے دائیں ہاتھ پر پیتل تھالی تھی اور بائیں ہاتھ سے وہ چلمن کو ہٹا کر دروازے میں چلی آئی۔میں دروازے کے قریب ایک لانبی کُرسی پر بیٹھا نظموں کی کتاب پڑھ رہا تھا۔اُس نے دہلیز پر قدم رکھ کر مجھے دیکھا اور ایک لمحہ ٹھٹھک کر کھڑی رہ گئی۔گھبرا کر مجھ سے پوچھا ''موسی کہاں ہے؟'' وہ میری ماں کو موسی کہتی تھی۔میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ میری کرسی کے آگے سے سامنے والے کمرے میں چلی گئی۔لیکن اس منظر کی جو بات اب تک میرے ذہن میں زندہ ہے وہ یہ ہے کہ لڑکی جب ایک لمحہ ٹھٹھک کر اپنے پیروں کو پیچھے ہٹائے اور گھبرائے لجائے کھڑی رہی اس وقفے میں میری نظر اُس کے جسم کے نچلے حصے پر پڑی جو کچھ نمایاں ہو گیا تھا۔چونکہ سورج کی کرنیں اُس کی سفید ململ کی دھوتی میں سے چھنتے ہوئے نچلے جسم کے خطوط کو چمکا رہی تھیں۔مجھے یہ منظر بھی گدگداتا رہا لیکن مجھے اس برہنگی سے نفرت ہو گئی۔''

میراجی نے یہ تمام باتیں وقفے وقفے سے کہیں تھیں۔درمیان میں وہ ایک جملہ کہتے پھر کچھ سوچنے لگتے اور اِس درمیان میں میری طرف بھی دیکھ لیتے اور زیادہ تر اُن کی نظریں گلدان پر لگی رہتیں۔اُنھوں نے عریانی کی بات چھیڑی تو میں نے پوچھا ''میراجی آپ اپنی شاعری میں عورت کے جسم کو برہنہ کر کے دکھاتے ہیں لیکن اس سے کراہت محسوس نہیں ہوتی، بلکہ لذّت کا احساس بڑھ جاتا ہے۔''

میراجی یہ سُن کر مسکرائے، پھر اپنے جسم کو سکیڑ لیا اور جھومتے ہوئے کہنے لگے: ''تعجّب ہے آپ بھی وہی بات کہہ رہے ہیں جو اکثر ناقد مجھ سے پہلے بھی کہہ چکے ہیں۔جب میں لاہور میں تھا تو لوگ یہی کہا کرتے تھے۔جب میں دِلّی ریڈیو پر سن بیالیس سے پینتالیس تک رہا تو وہاں بھی لوگ یہ کہہ کر بدنام کرتے تھے کہ مجھے عورت کے جسم سے محبت ہے (عورت کی روح سے نہیں)۔اُن کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ عورت کے جسم سے لباس ہٹا کر تلذّذ حاصل کرنے کے بعد اس جنسی فعل کو شاعری کا موضوع نہیں بنانا چاہیے۔وہ یہ بھی کہتے تھے کہ میں نے اپنے اشعار پر لفظوں کا ایسا دبیز پردہ ڈال رکھا ہے کہ اگر ان دبیز پردوں کو عورتیں ہٹائیں تو اُن کو اپنی ننگی آنکھیں شرم سے ۔۔۔۔

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 253 (1,1)

نیچی کر لینی پڑیں گی۔ میں نے پہلے بھی اُن کو یہ جواب دیا تھا اور آج آپ بھی سُن لیجیے محض جنسی پہلو ہی میری توجہ کا واحد مرکز نہیں ہے۔ جنسی فعل کو میں قدرت کی بڑی نعمت سمجھتا ہوں کیونکہ یہ ہماری زندگی کو ترقی کی راہ پر لگاتا ہے اور سکون بخشتا ہے۔ مجھے ہمیشہ یہ بات ناگوار معلوم ہوتی رہی کہ ہماری مشرقی تہذیب و تمدن نے آخر عورت کے گرد اِس قدر آلودگی کیوں پھیلا رکھی ہے۔ اس لیے میرا ذہن ردِّ عمل کے طور پر اس کائنات کی ہر بات کو جنس کے روپ میں دیکھتا ہے۔ مجھے یہاں آپ سے ابلیس کی وہ بات دہرانی چاہیے۔ اُس نے کہا تھا بچوں کو بچپن سے ہی برہنہ تصویروں سے روشناس کرانا چاہیے تاکہ اُن کا ذوقِ حُسن پختہ ہو جائے اور اُن میں وہ جذبہ اُبھر نہ سکے جو برہنہ تصویروں کو نہ دیکھنے سے پیدا ہوگا۔ اُن کو اِبتدا سے برہنہ تصویروں سے روشناس کراتے رہیں تو اُن کا جنسی جذبہ فوت ہو جائے گا۔ اور اُن کے ذوق کو بھی پورا ہونے نہ دے گا۔ اور اُن کو ننگی تصویروں سے نفرت ہو جائے گی۔ اگر ابلیس کی بات پر یقین کر لیں تو کچھ ایسی ہی بات میرے ساتھ ہوئی ہے۔ میں نے آپ کو بتلایا تھا کہ میں نے دو لڑکیوں کے زیریں جسم کے حصّوں کو دیکھا تھا۔ لیکن بعد میں میرے ذہن پر نفرت کے آثار غالب رہے۔'' میں نے یہاں پر میراجی سے ایک اور سوال پوچھا تھا: ''میراجی آپ کی شاعری میں ابہام کیوں ہے؟ آپ یہ ابہام ہٹا دیں تو میں سمجھتا ہوں آپ اُردو کے لوئی اراگان بن سکتے ہیں۔''

میراجی نے کہا: ''میں اراگان نہیں بننا چاہتا۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ زیادہ لوگ میری شاعری کو پڑھیں۔ میری شاعری صرف اُن لوگوں کے لیے ہے جو فکر کر سکتے ہیں اور ابہام کے بارے میں اِتنا سُن لیجیے، یہ ایک اضافی تصوّر ہے۔ یہ تصوّر مجھ میں پہلے نہیں تھا۔ جب میں میٹرک کے امتحان میں دانستہ طور پر فیل ہو گیا تو مجھے مطالعہ کا شوق اور زیادہ بڑھ گیا۔ پھر میں نے وِمن اور بودیلیر، میلارمے کو پڑھا۔ میلارمے نے مجھے زیادہ متأثر کیا۔ میلارمے کی اسی بات سے مجھے اتفاق کرنا پڑا۔ اُس نے لکھا تھا شاعروں میں اشاریت ہونی چاہیے۔ اشیاء کا تصور اور اشیاء میں غرق ہونے سے اُن کی متحرک تصویروں کا بننا یہی شعر کی جان ہے۔ کسی شے کو اُس کے مروّجہ نام سے

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 254 (1,1)

پکارنا مثلاً اِس رنگین گلدان کو صرف گلدان کہنا اس کے حُسن کو فنا کر دیتا ہے۔ اسی طرح شعر بھی ہے۔ شعر کا حُسن اور اس کا لُطف، عبارت ہے اُس خوشی سے جو ہمیں اِس کے معنی و مفہوم کی تلاش میں قدم قدم پر ہوتی ہے۔ اشاروں میں سوئے ہوئے خواب جاگ پڑتے ہیں۔ اِس ابہام کے صحیح استعمال سے اشاریت وجود میں آتی ہے۔''

اِتنا کہہ کر میراجی اُٹھے اور اپنے چمڑے کے تھیلے سے ایک مجلد کتاب نکالی اور صفحات کو اُلٹ پلٹ کر ایک سفید کاغذ پر اُن کی نظریں جم گئیں اور پھر وہ اس کاغذ کو کتاب سے علٰیحدہ کر کے پھر کرسی پر آبیٹھے اور میری طرف دیکھ کر بولے: ''یہ کتاب ہے AXELS CASTLE۔ میں نے یہ کتاب بمبئی میں خریدی تھی۔ پُونا میں میں نے اس کے ایک بیان کا ترجمہ کیا تھا۔ اس نے اشاریت اور ابہام کی بہت اچھی تعریف کی ہے۔ اب وہ کاغذ پر نظریں جمائے پڑھنے لگے۔ ''ہمارے شعوری لمحات کا ہر احساس یا تاثر ایک دوسرے سے ہمیشہ مختلف ہوتا ہے۔ اِسی لیے ہمارے احساسات تاثرات کو ادب کی عام زبان کے ذریعہ بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ ہر شاعر کی شخصیت مختلف ہوتی ہے۔ اُس کا ہر لمحہ ایک نرالی خصوصیت کا حامل ہوتا ہے۔ جس میں مخصوص عناصر کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ ہر شاعر کا فرض ہے کہ وہ ایک ایسی زبان کی تخلیق کرے جو شاعر کے اظہار اور تاثر کو واضح کرنے پر قدرت رکھ سکے اور ایسی ہی زبان میں اشاریت کا استعمال ضروری ہے۔ شاعر کا احساس جو نہایت دُھندلا اور نرالا ہوتا ہے، اس کو واضح لفظوں میں لمبائی کے ساتھ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ الفاظ کا تسلسل جو پڑھنے والے کے ذہن کی رہنمائی کر سکے اسی مقصد کو پورا کرتا ہے۔''۔۔۔۔۔

میراجی نے اِس عبارت کو پڑھ کر گہری سانس لی اور کاغذ کو کتاب کے صفحات میں دوبارہ رکھ کر کتاب کو پھر چمڑے کے تھیلے میں ڈال کر بولے: ''ممتاز صاحب جدید شاعری کو آسان نہ سمجھ لیجیے۔ اور وہ بھی آزاد نظم میں شعر کہنا بہت مشکل ہے۔ اور مبہم انداز سے بات کہنا تو اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ مجھے یہاں یہ بھی کہنے دیجئے جدید نفسیات کے ماہرین نے یہ ثابت کر دیا

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 255 (1,1)

ہے کہ علامات، اشارات ۔۔۔خیال کی سب سے بڑھ کر بے ساختہ صورت ہے ۔۔۔میں اپنی شاعری میں جو اشارات اور علامات استعمال کرتا ہوں وہ میلارمےؔ کی علامتوں سے مختلف ہیں۔میں بھی شاعری میں خیال کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں اور خیال ہی کو بنیادی شے تصوّر کرتا ہوں۔(اور میں ایک رسالہ ''خیال'' بھی نکالنا چاہتا ہوں) اگر کسی نظم میں نئی بات بھی ہو اور اُس میں دو قدم آگے بڑھانے کی صلاحیت نہ ہو تو میں اس اظہار کی کوشش کو فضول سمجھتا ہوں۔ بوویلیرؔ نے کہا تھا آدمی کا خیال جب پریشان ہے تو ادب میں باقاعدگی کیوں ہو۔''

میراؔجی کی اِن تشریحات سے مجھے دلچسپی ہو رہی تھی۔لیکن میں نے پھر وہ غمِ جاناں والا سوال پوچھا: ''میراجی! یہ تو بتائیے میرا سین کے رنگ و رُوپ کے ساتھ اُس کی آواز کیسی تھی؟ وہ چلتی کس طرح تھی؟ کیا آپ رنگ، آواز اور چال پر فدا ہوئے تھے یا کچھ اور بات تھی اور میراؔجی یہ محبّت کا ڈھونگ واقعی اصلی ہے یا محض جنون۔۔۔۔۔؟''

میراؔجی میرے لفظ ''جنون'' کے دوبارہ استعمال پر چونکے اور فضا میں لمحہ بھر دیکھ کر بولنے لگے: ''آپ نوجوان ہیں۔محبّت کو بالکل کا کھلونا سمجھ کر کھیلتے ہیں۔محبت کھلونا نہیں ہے۔محبّت ایک آگ ہے، ٹھنڈی آگ جس میں جل کر آدمی ۔۔۔۔انسان بن جاتا ہے۔اور رہا جنون کا معاملہ۔۔۔۔یہ معاملہ بندی میرے دل سے تعلق رکھتی ہے۔ناسخ کا شعر آپ کو یاد ہوگا۔ ؎

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی
عجب بہار ہے اِن زرد زرد پھولوں کی

میرا سین ببول کی طرح تو نہ تھی، مگر کچھ دُبلی پتلی سانولی سلونی تھی۔ایف سی کالج لاہور میں پڑھتی تھی۔مجھے ایک روز یونیورسٹی گراؤنڈ پر نظر آئی اور ایک پاکیزہ جذبہ میرے دل میں اُبھر آیا۔۔۔پھر میں ایف سی کالج جاتا رہا۔اُس کی نظروں سے نظریں چرا کر اُس سے کچھ دُور دُور رہ کر روزانہ کالج سے گھر جایا کرتا۔مجھے اُس سے ایک لگاؤ ہو گیا تھا اور اُس وقت میں اس لگاؤ کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔مجھے اُس کے چہرے میں کوئی خاص جاذبیت نظر نہ آئی۔البتہ اُس کی آواز بڑی پیاری

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 256 (1,1)

تھی۔ مگر اُس کے سانولے چہرے اور پیاری آواز سے زیادہ مجھے اُس کی وہ مسکراہٹ پسند تھی جو ہمیشہ اُس کے باریک ہونٹوں پر رینگتی رہتی تھی۔ میں نے ایک شام یہ پروگرام بنایا کہ میں اُس سے بات کروں گا۔ چنانچہ میں نے اُس شام اُس کے قریب جا کر بات کی۔ اُس نے کچھ جواب نہ دیا۔ خاموش غضبناک نگاہوں سے دیکھ کر آگے چلی گئی اور میں پیچھے چلا آیا۔۔۔۔ لیکن میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں نے محبت کرنی ہے۔ میں اُس سے محبت کرتا رہا۔ کچھ دِنوں بعد مُجھ پر ''جنون'' طاری ہوگیا۔ سوائے میرا سین کے خیال وتصوّر کے میں کسی اور بات میں دلچسپی محسوس نہ کرنے لگا۔ میں نے اپنا نام ثناء اللہ ڈار کے بجائے میرا سین کے نام پر میرا جی رکھ لیا۔ اس نام کے رکھ لینے کے بعد مجھے کچھ ذہنی سکون ملا۔ اِس سکون کے بعد میں نے کتابیں پڑھنی شروع کر دیں۔ پہلے سے بہت زیادہ پڑھتا رہا۔ مگر کتابوں میں کہاں سکون ملنا تھا۔ میں پڑھنے کو پڑھتا رہا۔ مگر میرا سین کی مسکراہٹ کتابوں کی سطر سطر سے اُبھر کر نگاہوں کے سامنے آتی تھی۔ اور میرا دل بے قرار رہتا تھا۔ پھر مجھے اُسی زمانے میں ہندو صنمیات سے دلچسپی پہلے سے بہت زیادہ ہوگئی۔''

میرا جی کچھ اور کہنے والے تھے، میں نے پوچھا: ''میرا جی! مجھے یہاں یہ بھی بتاتے چلیے کہ آپ نے ''میرا جی'' نام رکھ کر اسلام کو کیوں ترک کیا۔ آپ کو اگر ہندو صنمیات سے دلچسپی تھی تو آپ اس کا مطالعہ بحیثیت ''علم'' کر سکتے تھے۔''

میرا جی جذباتی انداز میں کہنے لگے: ''پہلے میں بے مقصد ہندو مائیتھالوجی کا مطالعہ کرتا تھا اور گیت لکھتا تھا۔ لیکن میرا سین جو کافر تھی اُس نے مجھے اس فلسفے کے قریب کیا۔ میں نے ہندو دھرم کا گہرا مطالعہ کیا۔ جنسیات پر کافی کتابیں پڑھیں اور مجھے گیان دھیان کا طریقہ پسند آیا۔ اب بھی میں اکثر صبح صبح جے جے ونتی کا راگ گاتا ہوں۔ مجھے اِس کے گانے یا دوسروں سے سُننے کے بعد رونا آجاتا ہے۔۔۔۔۔ اور یہ بات غلط ہے کہ میں نے اسلام ترک کیا، میں ایک خدا کو اب بھی مانتا ہوں۔ مگر میں نے اسلام کو حضرت عمر فاروق تک سمجھا ہے۔ اور اس کے بعد مجھے اسلام کی اصلی شکل نظر نہیں آئی۔ مجھے قرآن پڑھ کر اور سُن کر اب بھی غش آجاتا ہے۔ جب میں دِلی ریڈیو پر تھا

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 257 (1,1)

تو وہاں اکثر قرآن سُنا کرتا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ ممتاز صاحب۔۔۔۔۔۔۔ مجھ میں اِتنی ساری باتیں اکٹھا ہوگئی ہیں کہ دوسرے آدمی کو سمجھنے میں دیر لگتی ہے۔ میں نے اپنا یہ اصول بنالیا ہے کہ میرا ذہن جو سوچتا ہے اور دل جو چاہتا ہے وہی کرتا ہوں۔ مجھے آپ جیسے شریف آدمیوں کا بھی لحاظ نہیں رہتا۔ اِس لیے بعض لوگ مجھے مغرور سمجھتے ہیں۔ حالانکہ میں قطعی مغرور نہیں ہوں۔ اگر مغرور ہوتا تو آج آپ کے سامنے اس طرح کرسی پر نہ بیٹھا ہوتا بلکہ لاہور میں مال روڈ پر ہومیو پیتھک کا شاندار دواخانہ کھولے ٹھاٹھ سے ڈاکٹری کرتا۔'' اِتنے میں ملازم نے آن کر کہا: ''بابو جی کھانا لگ گیا ہے۔ آپ لوگ کھا لیجیے۔ اختر صاحب اور نور میاں شاید دیر سے لوٹیں۔'' پھر ہم کھانا کھانے میز پر چلے گئے۔

میرا جی حیدر آباد میں دس پندرہ دن اور رہے۔ جتنے دن رہے بہت مصروف تھے۔ اُن کے آنے پر اختر عادل نے اپنے گھر پر ایک ادبی اجتماع کیا۔ اس اجتماع نے میرا جی کی تنقید سے کافی اثر لیا۔ پھر ایک میٹنگ نظر حیدر آبادی نے اپنے گھر پر رکھی جس میں اختر الایمان نے اپنی نظم ''ریت کے محل'' پڑھی اور میرا جی نے ایک مختصر سی نظم پڑھی جس کو کوئی سُن نہ سکا کیونکہ وہ اِتنی دھیمی آواز میں پڑھ رہے تھے کہ لوگ یہ سمجھ رہے تھے میرا جی اب نظم پڑھیں گے مگر میرا جی کے قریب بیٹھنے والوں نے یہ محسوس کیا کہ میرا جی کچھ پڑھ رہے تھے۔ جب میٹنگ کے بعد منظر ستان واپس آئے تو میرا جی سے میں نے پوچھا تھا: ''آپ نے جو نظم پڑھی اُس کو لوگوں نے سُنا ہی نہیں۔'' وہ بولے: ''اگر لوگ سُننا نہ چاہتے ہوں تو یہ دوسری بات ہے۔ حالانکہ یہ نظم بہت جلد سمجھ میں آسکتی تھی۔ اور میں نے اِس نظم کو مکالمے کے انداز میں لکھا ہے۔ اِس لیے میں نے مکالمے کے انداز میں ہی اِس کو پڑھا۔ میری یہ نظم دِلّی والی کی یاد تازہ کرتی ہے۔ جب میں دِلّی میں تھا تو مجھے دو لڑکیوں سے عشق ہو گیا تھا۔ لیکن یہ محبّت میرا سین کی طرح نہ تھی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کیونکہ وہ لڑکیاں مجھے اپنا بزرگ سمجھتی تھیں۔ جب مجھے اُن کے اِس ذہنی پس منظر کا پتہ چلا تو میں بھی خاموش ہو گیا۔''

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 258 (1,1)

ایک رات رسالہ ''رُباب'' کے ایڈیٹر نے اپنے گھر خاص طور پر دعوت دی، جس میں اختر الایمان، میرآجی، ابراہیم جلیسؔ اور میں شریک ہوئے۔ دعوت بڑے اہتمام سے کی گئی تھی۔ میرآجی اِس حیدرآبادی مہمان نوازی سے بہت متأثر ہوئے۔ دعوت کے بعد ایڈیٹر نے میرآجی سے کلام سُننے کی خواہش کی۔ میرآجی نے اُن کی خواہش پوری نہیں کی، شاید وہ اس موقع ومحل کو مناسب نہ سمجھتے تھے۔ ویسے وہ باتیں بہت سناتے رہے۔

جب رات گئے دعوت سے لَوٹے تو میرآجی نے اس خوشگوار ٹھنڈی رات۔۔۔۔۔۔ ایک نظم لکھی جس کا عُنوان اُنھوں نے بعد میں ''حیدرآباد آنے پر'' رکھا۔

دوسری صبح جب سب ناشتہ کے بعد ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے کیمونزم اور جمہوریت پر بحث کررہے تھے تو اِتنے میں میرآجی نے اطلاع دی ''رات نظم ہوئی ہے۔''

سب جناح، نہروؔ، گاندھیؔ، ٹرومین، اسٹالین، شبلی کی پیدا کی ہوئی سیاست سے ہٹ کر میرآجی کی نظم کی طرف متوجہ ہوئے۔ اختر نے خوشی کا اظہار کیا۔ نورالحق نے کہا: ''ہم تو نظم سُنیں گے میرآجی!''

میرآجی نے چمڑے کے تھیلے سے مجلّد کاپی نکالی اور نظم سُنانے لگے۔

اُتر کے باسی آئے ہیں اُن کا راگ پرانا ہے
نئے دیس کی دھن سے جس کے جادو کو جگانا ہے
اور اُن کے دل کی سُننا ہے اپنے دل کی سنانا ہے

دل کی دنیا نرالی ہے وہاں صبح نہیں کوئی شام نہیں
دل والے مل جائیں تو پھر اور کسی سے کام نہیں

اُتر کے باسی آئے ہیں سیر وسفر کا بہانا ہے
بڑھتے پھیلتے جیون کے رنگوں سے دل کو لُبھانا ہے
بکھری کڑیاں کچھ بھی ہیں مل جائیں تو فسانہ ہے

کہے مسافر سانس کہانی کس نے جانی بوجھی ہے
بُوجھ سکے تو بُوجھے کوئی ہمیں پہیلی سُوجھی ہے

پل پل دور ہی دور جو بیتیں کہیے پھر کیا بات ہوئی
دن پھر کیسے دن کہلائے رات بھی کیسی رات ہوئی

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 259 (1,1)

پل سے پل مل جائے تو وہیں جیت ہوئی وہیں مات ہوئی
دو باتیں دو بول چاہ کے وقت کو امر بناتے ہیں
پل سے پل مل جاتے ہیں جب نئے مسافر آتے ہیں

نظم سُننے کے بعد سب تعریف کرنے لگے۔ پھر میراجی نے خود ہی کہا: ''میں نے پُونا میں سوچ لیا تھا حیدرآباد جانے کے بعد نظم لکھنی چاہیے۔ راستے بھر میں نے بحروں کا انتخاب کیا۔ کل رات مجھے یہ بحر پسند آئی۔'' اِتنے میں ملازم نے آن کر کہا: ''آفتاب احمد ملنے آئے ہیں۔''

پھر سب آفتاب کے ساتھ نظامیہ ہوٹل چلے گئے۔ جاتے ہوئے اختر نے میراجی سے کہا: ''میراجی! آج آپ دن بھر ایک تقریر لکھ دیجئے۔ کل ریڈیو پر آپ کی تقریر جدید شاعری پر رکھوائی ہے۔ ہم لوگ رات میں ہی لوٹیں گے۔''

دو چار روز بعد میراجی حیدرآباد سے اجنتا کے غار دیکھنے چلے گئے۔ جب میراجی ٹرین میں بیٹھ چکے تھے، اور بات کرنے کے لیے کوئی موضوع نہیں مل رہا تھا تو بڑی دیر بعد بولے: ''میں نے ایک نظم دِلّی میں ''اجنتا کے غار'' لکھی تھی اور اسی نام سے ایک کتاب شاہد احمد دہلوی کو چھاپنے کو بھی دی ہے۔''

میں نے کہا: ''میراجی! اجنتا کے غاروں کو دیکھنے سے پہلے آپ نے ایک نظم لکھی اور اب غاروں کو دیکھنے کے بعد ایک اور نظم لکھیے۔''

میراجی ہنسنے لگے۔۔۔''ہاں۔۔۔۔۔میں نظم ضرور لکھوں گا۔''

اور پھر ٹرین اجنتا کے غاروں کے لیے روانہ ہوگئی۔ میراجی اس گہما گہمی کو چھوڑ کر پھر اُس ابدی خاموشی کی طرف چلے گئے جس کی اُنھیں تلاش تھی۔

اور جب ہندوستان کا بٹوارہ ہوا، ہندوستان کو ایک حصّہ اور پاکستان کو دو حصے مل گئے اور ایک سال بعد ریاست حیدرآباد ہندو حکومت کے آہنی پنجے میں چلی گئی۔ میں پاکستان آنے کے لیے حیدرآباد سے بمبئی پہنچا۔ مجھے پتہ چلا تھا کہ میراجی۔۔۔۔۔اختر الایمان، مدھوسودن کے ساتھ مل کر رسالہ ''خیال نکال رہے ہیں۔ میں ''خیال کے دفتر گیا۔ لیکن وہ وہاں نہ مل سکے۔ کیونکہ میں

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 260 (1,1)

شام میں دفتر پہنچا تھا۔اور وہ اس وقت تک گھر چلے گئے تھے۔ پھر میں اُن کا پتہ معلوم کر کے اُن کے گھر گیا۔ رات ہو چکی تھی۔ وہ بمبئی کے اُس علاقے میں رہتے تھے جہاں بڑے بڑے سیٹھ ساہوکار رہا کرتے ہیں۔ میں FORT میں کالاگھوڑا کے قریب کافی ہاؤس کے سامنے والی سیاہ عمارت کے اندر گیا۔ وہ اپنے کمرے میں لانبے صوفے پر بیٹھے دیسی شراب پی رہے تھے اور اُبلے ہوئے انڈے کھا رہے تھے۔ اُن کے قریب اُن کے ایک دوست بیٹھے تھے۔ لیکن وہ اُبلے ہوئے انڈوں کے بجائے کچے انڈے پی رہے تھے۔ میراجی اُس وقت زیادہ نشے میں نہ تھے۔ پھر بھی ایسا معلوم ہوتا تھا وہ مست ہو گئے ہیں۔ میں ایک لمحہ یہ منظر دیکھ کر میراجی کے قریب گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر کہنے لگے: ''کون، ممتاز صاحب آئے ہیں۔ میں پہچان گیا۔ ہم حیدرآباد میں ملے تھے۔ وہ ہمارے نورالحق کیسے ہیں؟ اور آپ کی بہن زینت ساجدہ کیسی ہیں؟''

میراجی کی اِس بات نے مجھے حیران کر دیا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ یہ اِس وقت نشے کی حالت میں ہیں یا پھر ان کو ہوش نشے کے بعد آتا ہے۔ اُن کے اِس خلوص بھرے جذبے نے اُن کی قدر میرے دل میں بڑھا دی۔

میراجی نے اپنے دوست کی طرف مخاطب ہو کر کہا: ''یہ ہیں لطیف، میرے گہرے دوست، آج کل یہ لکھنؤ سے یہاں مستقل طور پر آ گئے ہیں۔''

لطیف صاحب نشے کی حالت میں مسکرانے لگے اور جھومتے ہوئے میراجی سے کہا:

''میراجی! ایک اور پیگ۔''

میراجی بولے: ''دِلّی کی یاد میں؟''

لطیف نے کہا: ''لکھنؤ کی یاد میں۔''

میراجی نے پھر کہا: ''نہیں لکھنؤ میں اب تو اُلّو بول رہا ہے۔ دِلّی کی یاد میں جو پچھلے سال مٹی تھی لیکن مری نہیں۔ دِلّی اور دِلّی والیوں کی یاد میں۔''

ان دو لمحوں میں اُن کے شیشے کے سرخ گلاسوں میں شراب انڈیلی جا چکی تھی۔ اور پھر

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 261 (1,1)

وہ ہاتھوں میں گلاسوں کو اپنی اپنی نگاہوں کے سامنے تھامے ہوئے تھے اور تیسرے لمحے وہ غٹاغٹ پی گئے۔ اور گلاس کو میز پر رکھ کر میر آجی پھر اُبلے ہوئے انڈے کھانے لگے۔

جب میں لَوٹ رہا تھا تو میر آجی نے کہا: ''کل ''خیال'' کے دفتر میں ملیے گا۔ وہاں اختر بھی ہوگا۔''

میں دوسری صبح ''خیال'' کے دفتر گیا، اختر نہیں تھے، میر آجی ملے، کہنے لگے: ''کل رات ہم نے کچھ زیادہ پی لی تھی۔ آپ سے باتیں نہ ہوسکیں۔ آپ اس کا بُرا نہ مانیے۔ یہ تو بتائیے نورالحق نے شادی کب کی؟ ہمیں شادی میں بلایا تک نہیں۔''

میں نے کہا: ''لطیف کی بیوہ بہن بھی آئی ہوئی ہیں۔''

اُنھوں نے کہا: ''نہیں، وہ ابھی لکھنؤ میں ہے۔ اور اب تو میرا خیال بدل چکا ہے۔ میں شادی نہیں کروں گا۔ مُدتوں بعد خیال نکالا ہے۔ شادی کرنے سے بات بگڑ جائے گی۔ میں نے پچھلے دِنوں ایک اور غلطی کی تھی۔ آپ کو معلوم نہیں۔ میں یہاں پیپلز تھیٹر کے ایکٹروں کو مکالمے ادا کرنے کا طریقہ بتلایا کرتا تھا۔ وہاں ایک پارسی لڑکی بھی آتی تھی۔ بڑی خوب صورت، گول مول اور پیاری لڑکی تھی۔ مجھے یونہی پسند آگئی۔ میں نے سوچا چلو اِس کے ساتھ زندگی کے آخری دن گزار دیں۔ لیکن اسی کشمیری لونڈے وِشوامتر عادلؔ نے سارا معاملہ چوپٹ کر دیا۔ وہ خود اُسی سے عشق کرنے لگا۔ اور وہ ظالم بھی اتنی بے وفا نکلی کہ اُس کے خوب صورت جسم پر ریجھ گئی۔''

میں نے کہا: ''میر آجی آپ نے محبّت کیوں کی اور خواہ مخواہ ایلوژن کیوں باندھا؟''

میر آجی بڑے افسوس ناک لہجے میں بولے: ''عورت کا دوسرا نام صدمہ ہے۔''

اور اُسی لمحے کرسی پر سے اُٹھ کر کہنے لگے: ''مجھے سٹوڈیو جانا ہے۔ میری ایک فلم ''راز'' بن رہی ہے۔ اس کی آج شوٹنگ ہے، آپ بھی چلیے۔''

''میر آجی میں ضرور چلتا لیکن مجھے پرمٹ کے لیے نظام پیلس جانا ہے۔ پھر کبھی چلوں گا۔''

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 262 (1,1)

اور پھر ہم دونوں ''خیال'' کے دفتر سے یونہی بے خیالی میں بلاسس روڈ کے چوراہے تک آ گئے۔

میراجی نے کہا: ''میں اُدھر جاؤں گا۔''

میں بولا: ''میں سیدھے جاؤں گا۔''

اور میراجی چمڑے کا بیگ تھامے دوسرے راستے پر چلے گئے۔

میں تین چار روز بعد پھر ''خیال'' کے دفتر گیا، وہاں اختر اور مدھوسودن بھی تھے۔ میں نے اختر سے اِدھر اُدھر کی باتیں، اور خاص کر پچھلی شام والے انجمن ترقی پسند مصنّفین کے جلسے کی جو ساغر نظامی کے خوب صورت FLAT میں ہوا تھا۔) باتیں کیں جس میں عادلؔ نے میراجی کے خلاف زہر اُگلا تھا۔ (شاید پارسی لڑکی سے عشق کرنے کے بعد وہ اپنے بزرگ کی توہین پر اُتر آیا تھا۔ یہ نہ جانے اور کیا بات تھی)۔

ہم سب باتیں کر رہے تھے کہ عادلؔ اپنا چمڑے کا بیگ لٹکائے، مُنہ میں پائپ لگائے چلا آیا، سب خاموش ہو گئے جیسے کوئی C.I.D انسپکٹر گرفتاری کا وارنٹ لے آیا ہو۔ اخترؔ نے کچھ دیر باہر جا کر عادلؔ سے باتیں کیں۔ اِتنی دیر میں میراجی اپنے دو لوہے کے گولوں کو ہتھیلی میں رکھ چکے تھے (جو اُس وقت میز پر رکھے تھے)۔ پانچ دس منٹ بعد عادلؔ چلا گیا۔ اخترؔ نے آن کر کُرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: ''ان نیم کیمونسٹوں کو یہ تک معلوم نہیں کہ مزدور اور قلی میں کیا فرق ہے اور چلے ہیں مارکس کے مادی فلسفے کو سمجھنے۔''

میراجی اب بھی خاموش تھے۔ مدھوسودن نے بھی کچھ نہیں کہا۔ میں نے اِس سنجیدگی اور خفگی کو مٹانے کے لیے تجویز پیش کی: ''میراجی ''خیال'' کا ادارہ آج جمع ہے۔ کیوں نہ تصویر لی جائے۔'' میراجی کُرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ''ہاں ہاں باہر آؤ ہمارے سیٹھ کرشن دیال کو بھی ساتھ لے لو۔'' اور پھر ہم سب باہر میدان میں آ گئے۔ میں نے اپنے KODAK کے کیمرہ سے دو تصویریں لیں۔ ایک تصویر میں اختر، میراجی اور مدھوسودن تھے اور دوسری میں اِن تینوں کے

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 263 (1,1)

ساتھ سیٹھ دیال بھی ۔۔۔۔اور تصویر لینے کے بعد میں چلا آیا کیونکہ دوسرے روز کراچی آنے کی تیاری کرنی تھی۔میرا جی سے وہ ملاقات،میری آخری ملاقات تھی۔

اور پھر مجھے گیارہ مہینے بعد کراچی میں نومبر کی نو تاریخ کو بمبئی سے اخترؔ نے خط لکھا کہ میرا جی چل بسے۔اِس خبر نے مجھے اِتنا شدید صدمہ پہنچایا جیسے میرا کوئی بڑا بھائی مرگیا ہو۔اور پھر مجھے میرا جی کا وہ رونا یاد آیا، جب اُنھوں نے حیدرآباد میں نورالحق کے ماموں کی موت پر رویا تھا۔ میرا جی اُس دن جنازہ اُٹھانے کے لیے بھی نہیں گئے تھے۔لیکن رات بڑی دیر تک بچّوں کی طرح روتے رہے اور پھر ایک دوسری رات بھی وہ اسی طرح رونے لگے،اپنے والد مرحوم کو یاد کر کے۔ میرا جی کو بڑا رنج تھا کہ وہ اپنے والد مرحوم کی آخری وقت بھی خدمت نہ کر سکے اور پھر مجھے اُن کا وہ رونا یاد آیا جب وہ جے جے ونتی راگ ریڈیو پر سُن کر رونے لگے تھے۔میں اُن کے رونے والے تمام مناظر کو اپنی آنکھوں میں سمیٹتا رہا۔

میرا جی کے انتقال کے کچھ دِنوں بعد اختر الایمان کی بیوی سلطانہ منصوری نے بمبئی سے مجھے ایک خط لکھا۔میں یہاں سلطانہ بھابھی کے خط کو بغیر کسی ترمیم واضافہ کے نقل کرتا ہوں۔

''مظہر بھائی! آپ کا خط ابھی ابھی ملا، آپ کے خط کے ساتھ اخبارات کی CUTTINGS ملیں۔تعجّب ہے پاکستان میں یہ افواہ کیسے پھیل رہی ہے کہ میرا جی نے نہایت کسم پُرسی کے عالم میں انتقال کیا۔میں نے یہ خبر''نظام'' میں بھی پڑھی تھی۔اس میں بھی اسی قسم کی غلط بیانی تھی۔میں نے ایڈیٹر''نظام'' کو بھی خط لکھا تھا۔اب آپ کو بھی سب حالات لکھتی ہوں۔اگر آپ لوگوں کو حالات سے آگاہ کر دیں تو میری طبیعت کا تکدّر دُور ہو جائے گا۔

میرا جی اپنے گھر ہمیشہ بیمار رہا کرتے تھے۔ہر اتوار کو ہمارے یہاں آتے تھے۔ ہوٹلوں کے کھانے اور کچھ اُن کی بد پرہیزی سے اُن کی حالت گرتی جارہی تھی۔ہم لوگوں نے اُن سے کہا کہ آپ ہمارے یہاں رہیے۔جب تک کہ آپ کی صحت ٹھیک ہو جائے۔چنانچہ وہ فورٹ سے ہمارے یہاں آگئے۔تین چار مہینے اُن کا علاج گھر پر ہوتا رہا مگر افاقہ نہیں ہوا۔ڈاکٹر نے

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 264 (1,1)

LIVER کے بہت سے انجکشن دیے (ڈاکٹر گھر پر آن کر اُنھیں انجکشن دیتا تھا) اِس کے علاوہ دوسرے تیسرے دن اختؔر صاحب ڈاکٹروں کو گھر پر بُلا کر اُنھیں دکھاتے تھے۔ علاج جاری رہا مگر میرؔا جی نے خود اپنے کو اچھا نہ ہونے دیا، وہ بلا کے بد پرہیز تھے۔ اختؔر صاحب اُنھیں سختی سے کھانے پینے کو منع کرتے تھے کیونکہ ڈاکٹر نے اُن کی غذا صرف لسی اور دہی تجویز کی تھی۔ مگر میرا جی کبھی مجھ سے اور کبھی ملازم سے چیزیں مانگ کر کھالیا کرتے تھے۔ اب مجھے افسوس ہوتا ہے کہ میں اُنھیں کیوں کچھ کھانے پینے کو دے دیتی تھی۔ رات کو وہ خود باورچی خانے میں جا کر جو ملتا تھا کھالیا کرتے تھے۔ جب اُن کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی گئی تو اختؔر صاحب نے اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے مشورے سے باندرہ ہسپتال میں داخل کرا دیا مگر وہاں بھی اُنھوں نے ہسپتال کے ملازموں کو پیسے دے کر اپنے ساتھ ملا لیا اور ہوٹلوں سے پکوڑے اور پھلکیاں منگا کر کھانے لگے۔ جب اختر صاحب کو معلوم ہوا تو بہت ناراض ہوئے۔ ڈاکٹر نے اُنھیں بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانے اور برابر بد پرہیزی کرتے رہے۔ میں کبھی کبھی اور اختر صاحب ہر روز اُنھیں دیکھنے جایا کرتے تھے۔ مسلسل بد پرہیزی سے وہ قریب المرگ ہو گئے تھے۔ اختر صاحب نے پھر ڈاکٹروں سے مشورہ کیا۔ سب نے یہی رائے دی کہ کنگ ایڈورڈ میموریل ہسپتال جو بمبئی کا سب سے بڑا ہسپتال ہے، میرا جی کو وہاں منتقل کر دینا چاہیے۔ چنانچہ فوراً کنگ میموریل ہسپتال میں لے جایا گیا، وہاں چند دن کے بعد اُن کا انتقال ہو گیا۔ سودن بھائی اور مہندر ناتھ اُنھیں اکثر دیکھنے جاتے تھے، مرنے سے ایک روز پہلے میں بھی گئی تھی۔

ڈاکٹروں کا اِرادہ اُنھیں PSY CHOTHOROPIC SHOCK دینے کا تھا۔ مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ مرنے سے کچھ دن پہلے اُن کی دماغی حالت بھی بگڑ گئی تھی۔ ۳ نومبر کو شام کے چار بجے اُن کا انتقال ہو گیا۔ اُس دن اختر صاحب کو ڈائریکٹر یوسف کے یہاں بہت دیر ہو گئی تھی اِس لیے ہسپتال نہیں جا سکے، اِس لیے کہ ملنے کا وقت ۴ بجے سے ۵ بجے تک ہوتا ہے۔ اور یوسف کے یہاں چھ بج چکے تھے۔ ۲ نومبر کو میں اور اختر صاحب گئے تھے۔ اُس دن میرؔا جی کو کھانسی بہت تھی۔ جس دن اُن کا انتقال ہوا ہے رات کو تقریباً ۹ بجے ہم لوگ کھانا

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 265 (1,1)

کھا رہے تھے، ہسپتال سے تار آیا۔لکھا تھا:''MIRAJI EXPIRED۔''سرن جی اور اختر صاحب فوراً ہسپتال گئے لیکن ڈاکٹر اُس وقت نہیں ملا اِس لیے کچھ معلوم نہ کر سکے۔رات بہت ہوگئی تھی، ہسپتال والوں نے کہا اس وقت اُن کا جسم COLD ROOM میں رکھا جائے گا۔آپ لوگ صبح آن کر لے جائیے۔اختر صاحب نے اُسی وقت مختلف اخبارات کے دفتروں میں ٹیلی فون کیا۔گھر آ کر پاکستان کے ادیبوں کو خطوط لکھے۔صبح ہی وہ اور سرن جی پھر ہسپتال گئے۔سرن جی (میرے بہنوئی) نے بہت سے لوگوں کو اطلاع دی۔اُن کے دوست لطیف کو بھی اطلاع دے دی تھی۔وہ رونے لگے مگر آئے نہیں۔بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ندامت کے مارے نہیں آئے تھے۔اِس لیے کہ میراجی کے بہت گہرے دوست تھے۔اُن کی بیماری کے زمانے میں صرف دو بار آئے تھے۔سُودن بھائی اور پریم (شاید آپ پریم کو جانتے ہوں جو شالیمار فلم کمپنی میں تھے) فوراً آ گئے تھے۔لوگوں کا انتظار کرنا فضول تھا۔ان چاروں نے مل کر سب انتظام کیا۔اختر صاحب نے سب خود خرچ کیا۔اب سمجھ میں نہیں آتا۔یہ سب خیراتی کیسے ہوا؟ بیماری کے زمانے میں اختر صاحب اُن کی ضروریات خرید کر ہسپتال لے جاتے تھے۔کھانا بھی گھر سے جاتا تھا۔جن لوگوں سے خود کچھ نہیں ہوتا وہ صرف باتیں بنایا کرتے ہیں۔بیماری کے زمانے میں کسی سے دو حرف نہیں لکھے گئے۔اب جب اُن کا انتقال ہوگیا تو اُلٹی سیدھی ہانکنے لگے۔

اُمید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔''۔۔۔۔۔۔۔۔سلطانہ۔

خط پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میری نظروں کے آگے دُھندلکا چھا گیا۔اور مجھے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ہر چیز کفن اوڑھے ہوئے ہے اور پھر دھندلکا چھٹا۔میرے گال پر آنسوؤں کے قطرے بہنے لگے۔اور میراجی کا جسم شال میں لپٹا ہوا میرے سامنے آیا۔

پھر ایک آواز گونجی:''اِن سے ملو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یہ میراجی ہیں۔''

میں آگے بڑھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

لیکن وہاں میراجی نہیں تھے، صرف آسمان ابر آلود تھا، ہوائیں آہستہ آہستہ چل رہی تھیں اور سرخ رنگ کا نارنجی آفتاب غروب ہو رہا تھا۔دُور، بہت دور سمندر کی لہروں سے پرے۔

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 266 (1,1)

(نقوش،شمارہ14)

ممتاز مفتی

میراجی

پنجابی میں ایک مثل مشہور ہے" آٹا گُندی ہلدی کیوں ایں۔" اِس بنا پر کہ آٹا گوندھتے ہوئے ہلتی ہیں، کئی ایک گھر والیوں کا مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ کئی ایک کو رد کر دیا جاتا ہے لیکن اِسی بنا پر کئی ایک نہیں بلکہ ہر تخلیقی فنکار کا مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ ہر تخلیقی فنکار کو رد کر دیا جاتا ہے۔ تخلیق ادب کا سب سے بڑا مطالبہ یہ ہے کہ ادیب زندگی کے مناظر سے شدت سے اثر لے۔ اثر سے بھیگ جائے۔ اِس قدر بھیگ جائے کہ چھینٹے اُڑیں اور قاری کو بھگو دیں۔ خالی بھیگنے سے ہی چھینٹے نہیں اُڑ سکتے تخلیقی ادب کو ہمہ تن سیّال بننا پڑتا ہے۔ تاثر کے چھینٹے تو بے شک اُڑتے ہیں، قاری بھیگتے ہیں تخلیق پر واہ واہ ہوتی ہے، فنکار کو تحسین ملتی ہے لیکن چھینٹے اُڑانے والے ادیب کی اپنی شخصیت رقیق ہو کر بہہ جاتی ہے۔ اس میں ٹھوس پن نہیں رہتا۔ حدود نہیں رہتے۔ توازن نہیں رہتا۔ جس کی غیر از معمول شدّت اُسے کوڑے لگاتی ہے۔ ان کوڑوں تلے ادیب کی شخصیت پٹتی ہے، اُبھرتی ہے، سمٹتی ہے، بل کھاتی ہے، اور بالآخر انجانے انوکھے اور ممنوع مچانوں کی طرف بہہ جاتی ہے۔ اس پر لوگ فنکار کی شخصیت پر ہنستے ہیں، مذاق اُڑاتے ہیں، تذلیل و تحقیر کے نشتر لگاتے ہیں۔

ایک طرف لوگ اُس کی تخلیقات پر سر دُھنتے ہیں، اُس کو ہیرو سمجھ کر اُس کی پوجا کرتے ہیں۔ دوسری جانب اُس کی شخصیت کا مضحکہ اُڑاتے ہیں۔ ایک جانب عظیم تحسین، دوسری جانب کاٹتی ہوئی تحقیر۔ تخلیقی فنکار یوں ایک بے رحم دورُخی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک ساعت میں وہ تن کر کھڑا ہو جاتا ہے، میں سبھی کچھ ہوں۔ اُس کی اَنا میں پھونک بھر جاتی ہے۔ میں خالق ہوں۔ دوسری

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 267 (1,1)

ساعت میں اس پھیلی ہوئی تحقیر اور احساسِ تذلیل کا کانٹا لگ جاتا ہے۔ ساری پھونک نکل جاتی ہے۔ انا کا فٹ بال پچک کر چھیچھڑا بن کر لٹک جاتا ہے۔ میں، میں تو کچھ بھی نہیں، پھر۔ چبھتی ہوئی تحقیر و تذلیل کے خلاف انتقام کا جذبہ اُبھرتا ہے۔ فن کار اپنی شخصیت کو اور درہم برہم کر دیتا ہے۔ مزید انجانے مچانوں کی طرف بہا دیتا ہے۔ میں ایسا ہی ہوں۔ کرلو میرا کیا کرنا ہے۔

میں نے میراجی کے دونوں رُوپ دیکھے ہیں، ہم کیا نہیں ہیں اور بھئی ہم تو کچھ بھی نہیں ہیں، میراجی کی پھولی ہوئی انا کا فٹ بال دیکھا ہے۔ میراجی کی پچکی ہوئی ''میں'' کا چھیچھڑا دیکھا ہے۔ دورُخی کے اس کوڑے تلے اس مظلوم جبشی کو بلبلاتے ہوئے دیکھا ہے۔ شدّتِ احساس کی دھنکی ہوئی تحقیر و تذلیل تلے میراجی کی شخصیت کی پھپھوندی کو اُڑتے دیکھا ہے۔ اور بالآخر اس چھائی ہوئی تحقیر و تذلیل کے خلاف میراجی کے خوفناک انتقام کو دیکھا ہے۔ میراجی نے انتقاماً خود اپنی شخصیت کے پرزے پرزے کر کے اُنھیں اُڑا دیا، بکھیر دیا۔ غصے کے چمچے سے اپنی ہی شخصیت کو انڈے کی طرح پھینٹ دیا۔ التزاماً انجانے مچانوں انوکھی گھمن گھیریوں میں گھما دیا۔ اور پھر میراجی نے فاتحانہ انداز سے سر اُٹھایا ''ہم ایسے ہی ہیں، نہیں ایسے نہیں، اس سے بھی بدتر ہیں'' ہاں کرلو ہمارا کیا کرتے ہو۔

پہلے پہل کبھی کبھار ملاقات کے دور میں میراجی میرے لیے ایک سلگتا ہوا پائپ، کئی ایک بالوں کی لٹکیں اور چونکا دینے والی باتوں کا مرکّب تھا۔ جس میں التزاماً چونکا دینے کا اہتمام نمایاں تھا۔ پھر ہمیں کچھ دیر کے لیے ایک جگہ ایک کمرے میں اکٹھے رہنے کا اتفاق ہوا۔

اُس وقت میں نے میراجی کو جانا۔

اُس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ What price glory

اُس وقت مجھے احساس ہوا کہ پنجابی کی اس عظیم مثل کا مفہوم کیا ہے:

آٹا گُندھ دی ہلدی کیوں ایں۔

۱۹۳۹ء میں پہلی مرتبہ میں نے میراجی کو دیکھا۔

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 268 (1,1)

اُس روز پہلی مرتبہ میں کسی اُردو جریدے کے دفتر میں داخل ہوا تھا۔ اگر مولانا صلاح الدین خطوں کے ذریعے ملاقات کے لیے اصرار نہ کرتے تو شاید ''ادبی دُنیا'' کے دفتر میں داخل ہونے کی میں کبھی جسارت نہ کرتا۔

جھجھکتے ہوئے میں دفتر میں داخل ہوا۔ مجھے مولانا صلاح الدین سے ملنا ہے۔ مولانا ابھی نہیں آئے۔ چپڑاسی نے کہا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ آپ انتظار کیجیے۔ چپڑاسی نے کہا۔ نہیں نہیں، میں میں، میں پھر، پھر کبھی۔ کون صاحب ہیں؟ ملحقہ کمرے سے ایک کراری آواز آئی۔ آپ میراجی صاحب سے مل لیجیے۔ چپڑاسی نے مجھے سے کہا۔

نہیں نہیں مجھے صرف مولانا سے ہی۔ میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔ میراجی کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔ چست کپڑے پہنے ایک مستعد سا آدمی میرے سامنے کھڑا تھا۔ جیسے کوئی کارندہ ہو یا کاروباری نائب۔

آپ کی تعریف؟ میراجی نے میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

میرا نام ممتاز مُفتی ہے۔

میراجی کے ہونٹوں پر ایک موہوم سا تبسّم جھلکا۔ آیئے تشریف لائیے، بیٹھیے۔

نہیں نہیں میں از سرِ نو گھبرا گیا۔ میں میں پھر، پھر، پھر کبھی۔ مجھے صرف مولانا۔ صرف مولانا۔

میراجی کے ہونٹوں کا تبسّم اور واضح ہو گیا۔ اور واضح حتیٰ کہ وہ کمرا اُس تبسّم سے بھر گیا اور میں بھاگا۔

سڑک پر پہنچ کر دفعتاً مجھے خیال آیا کہ میراجی عجیب سا نام ہے۔ میراجی، اور انتقاماً میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ میراجی۔

چند ایک ماہ کے بعد مجھے مولانا سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ چار ایک سرسری باتیں ہوئیں، دورانِ گفتگو اُنھوں نے دو ایک بار میراجی کو آواز دی۔ ملحقہ کمرے سے میراجی کی آواز سنائی دی۔ وہی آواز، چست، مستعد، کاٹتی ہوئی آواز۔

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 269 (1,1)

میراجی؟ از سرِ نو میں نے اس نام کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ شاید بنگالی ہے، ہوگا۔ کوئی جنوبی ہند کا رہنے والا ہندو ہوگا۔ اور میں مطمئن ہو گیا۔

چند ایک ماہ کے بعد از راہِ اتفاق ''ادبی دُنیا'' کے ایک مقالے پر میری نظر پڑی۔ ''ڈی۔ ایچ۔ لارنس کی شاعری''۔ ''ڈی۔ ایچ۔ لارنس'' کی شاعری سے میں بے حد متاثر ہوا تھا۔ اس لیے میں نے یہ مقالہ غور سے پڑھا۔ ''معصوم دوشیزگی'' کی نظم پڑھ کر میں گویا سکتے میں رہ گیا۔ اُردو ترجمہ اصل سے بھی سبقت لے گیا تھا۔ شوق سے میں پڑھتا گیا۔ اِس مقالے کے اختتام پر لکھا تھا: ''میراجی''۔ میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ میں نے دوبارہ، سہ بار اِس نام کو پڑھا۔ وہ ''میراجی'' ہی تھا میراجی۔ وہ پتلا دُبلا سا مستعد مُنشی میرے رُوبرو آ کھڑا ہوا۔ اور میں حیرانی سے اُس کا جائزہ لینے لگا۔ اُس کے ہونٹوں کا موہوم تبسّم پھیلنے لگا۔ اور کائنات اُس کی لپیٹ میں آ گئی۔

۱۹۴۰ء میں مجھے پھر ''ادبی دُنیا'' کے دفتر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ آئیے، اندر سے میراجی کی آواز آئی۔ میں اندر داخل ہوا۔ میز کے پیچھے ایک بارُعب چہرہ، شانوں پر گیسو، ہاتھ میں ایک بے ڈھنگا سا پائپ، ماتھے پر تیوری، بیٹھیے۔ اُس کی آواز سُن کر میں چونکا۔ وہی میراجی لیکن وہ مستعد جوان، وہ چست منشی، وہ متبسّم جوان کیا ہوا۔ میں نے ایک بار پھر اُس کا جائزہ لیا اور محسوس کیا جیسے ڈکنز کا کوئی کردار مشرقی رُوپ میں جلوہ گر ہو۔ کیا میراجی بہروپیا ہے؟ سراب ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ دو ایک ملاقاتوں کے بعد میراجی سے میری واقفیت ہو گئی۔ ایک روز میں نے پوچھا، میراجی، آپ کا نام کیا ہے؟ میراجی نے گھور کر میری طرف دیکھا۔ ''میراجی'' اور پھر پائپ کے کش لینے لگا۔

نہیں، میں نے بات سمجھے بغیر کہا۔ آپ کا اصلی نام کیا ہے؟

غالباً میرے سوال کی معصومیت نے اُس کی قوتِ مزاحمت کو کمزور کر دیا تھا۔

ان جانے میں اُس نے جواب دیا۔ اصلی نام ہمیں یاد نہیں رہا۔

میری ہنسی نکل گئی۔ میراجی کی پیشانی کی تیوری اور بھی چڑھ گئی۔ اُس کی نگاہیں خطرناک

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 270 (1,1)

قسم کی سنجیدگی کی مظہر تھیں۔

تو اصلی نام کا حجاب ابھی تک قائم ہے۔میں نے پوچھا۔

کیوں،میرا جی کی آواز نے مجھے دھمکایا۔

اِس لیے کہ ابھی اصلی نام کو بھولنے کی خواہش باقی ہے۔اصلی نام کے وجود کا احساس باقی ہے۔اصلی نام کی یاد سے تلخی کا احساس ابھی وابستہ ہے۔ایک لمحے کے لیے میرا جی کی تیوری اُتر گئی۔سنجیدگی سوچ بچار میں بدل گئی۔

تم ٹھیک کہتے ہو۔میرا اصلی نام ثناء اللہ ہے۔۔۔۔

لیکن پھر یہ بناوٹی نام،میرا جی۔اِس زمانے میں،میں می راجی کو میرا جی کہا کرتا تھا۔

میرا جی کا کیا مطلب؟یعنی میرا جی۔یعنی میری جگہ میرا جی،جی رہا ہے۔اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

ایک ساعت کے لیے وہ خاموش ہو گیا۔پھر کہنے لگا۔میر اجی نہیں،می راجی،میرا ایک بنگالی نام ہے۔ہمیں میرا سے محبت ہے۔اب ہم میرا ہیں۔اُس کی بات سُن کر میں سکتے میں رہ گیا۔عجیب شخص ہے جو اپنی محبت کا قصہ ایک اجنبی سے یوں بیان کر رہا ہے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔اُس زمانے میں مَیں سمجھتا تھا کہ محبت کرنا ایک جرم ہے۔جس کے متعلق بات کرنا ممنوع ہے۔

عجیب آدمی ہے،میں نے سوچا،جو اپنی محبت کے راز کو یوں بیان کر رہا ہے جیسے وہ ایک پہاڑہ ہو۔جسے وہ ''دو دُونی چار اے'' کی طرح سنا رہا ہے۔اپنی محبت کو ''میرا جی'' کے نام سے نشر کرنا۔اپنے نام کو بھولنے کی شدید کوشش کرنا اور یوں جٹا دھاری بن کر التزامًا عاشق کا رُوپ دھارنا کتنا نمائشی انداز ہے۔کس قدر چھوٹا آدمی ہے یہ میرا جی۔

مگر ڈی۔ایچ لارنس،مجھے خیال آیا اور دفعتاً میں نے محسوس کیا جیسے میرے روبرو بیٹھا ہوا وہ شخص بذاتِ خود معصوم دوشیزگی کا مجسّمہ ہو جسے لارنس نے اس عظیم نظم میں پیش کیا تھا۔''دی ڈارک پلر چرننگ اون اِٹس بیس''۔وہ اِستادہ سیاہ ستون جو اپنے آتشیں وجود کے باوجود بے بس

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 271 (1,1)

تھا، محروم تھا۔

کتنا بڑا ہے یہ شخص۔ میں نے سوچا۔ کتنا بڑا۔ آتشیں بے بس محروم اور میری نظر میں میرا جی کا وہ بل کھاتا ہوا پائپ، وہ اُلجھے ہوئے گیسو، وہ دھمکیاں دیتی ہوئی سی آواز اور وہ چڑھی ہوئی تیوری، چھائی ہوئی بے بسی کو چھپانے کے پردے دکھائی دینے لگے۔

اور وہ اِستادہ سیاہ ستون اپنے آتشیں وجود کے باوجود بے بسی اور محرومیت کی وجہ سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

''ہمیں میرا سے محبت ہے اِس لیے ہم میرا جی ہیں۔'' اُس نے قہقہہ مار کر کہا۔

(پیاز کے چھلکے)

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 272 (1,1)

ضمیمہ جات

صلاح الدّین احمد

اداریہ ''ادبی دُنیا''

(بزمِ ادب)

گزشتہ ۳ر نومبری شام کو اُردو کے نامور ادیب اور شاعر اور ''ادبی دُنیا'' کے سابق نائب مدیر میراجی نے بمبئی کے ایک اسپتال میں ۳۷ برس کی مختصر عمر پا کر انتقال کیا۔ وہ زندگی میں بھی تنہا تھا۔ اور موت میں بھی تنہا رہے اور اُن کا کلام ہی اُن کی تنہا یادگار ہے۔

مدیر ''ادبی دُنیا'' اگرچہ اُنھیں اُن کے بچپن سے جانتا تھا لیکن اُن کی ادبی شخصیت سے وہ ۱۹۳۷ء میں آشنا ہوا۔ ۳۷ء کے موسمِ گرما میں وہ اُسے اپنے چند ناتمام مسوّدے دکھانے لائے اور اُنھیں دیکھ کر اُسے یوں محسوس ہوا جیسے شام کے آسمان پر یکا یک ایک ننھا سا تارہ چمک اُٹھا ہے۔ اور آفتاب کی ڈھلتی ہوئی روشنی پر چشمک زنی کر رہا ہے۔ اس کے اِس سوال پر کہ اُنھوں نے آج تک اپنی کوئی چیز چھپوائی کیوں نہیں، وہ بولے کہ: ''میں آج تک صرف اپنے لیے لکھتا رہا ہوں۔ ہاں اگر آپ چاہیں تو اوروں کے لیے بھی لکھنے کی کوشش کروں گا۔'' اور پھر ہم فن اور شعر کی باتوں میں گم ہو گئے اور جب وہ رُخصت ہوئے تو مجھ سے کہہ گئے کہ وہ چند ہی روز میں ''ادبی دُنیا'' کے لیے کچھ لکھ کر لائیں گے۔ اور اِس طرح اُس ادبی زندگی کا آغاز ہوا جو بارہ برس کی مختصر مُدت میں فضائے ادب کی بہت سی رفعتیں طے کر کے اِس حیاتِ لازوال میں جا ملی جو فن کی اعلیٰ اور سچی قدروں کو عطا کی گئی ہے۔

میراجی میرے ساتھ کم و بیش چار برس تک کام کرتے رہے۔ وہ فطرتاً آزاد منش اور بے

D 1/11/2025 3:01 PM PAGE 273 (1,1)

پروا تھے،لیکن اِس عرصے میں اُنھوں نے کبھی مجھے آزردہ نہیں ہونے دیا۔اُن کی باہر کی زندگی کا اسلوب چاہے کچھ رہا ہو،دفتر میں وہ ہمیشہ اپنے آپ کو سنجیدہ اور چوکس رکھتے تھے۔اور اِدارے کے وقار میں ذرّہ برابر کمی نہیں آنے دیتے تھے۔''ادبی دُنیا'' میں حصّۂ نظم سراسر اُن سے متعلق تھا، اگرچہ وہ اپنے ہر نئے اقدام پر مجھ سے مشورہ ضرور کرلیا کرتے تھے،اور میں نے،جہاں تک مجھے یاد ہے،اُن پر کبھی کوئی کڑی پابندی عائد نہیں کی۔نظموں پر اِدارتی نوٹ بھی وہی لکھا کرتے تھے۔ یہ نوٹ اپنے زمانے میں بہت مقبول ہوئے۔اور بعد میں اُنھیں کسی مکتبے نے چھاپ بھی دیا۔ ان شذرات کے علاوہ وہ کبھی کبھی شعرائے فرنگ اور شعرائے ہند قدیم پر مضامین بھی لکھتے تھے۔ اُن کے یہ مضامین اپنی نوعیت میں منفرد ہیں اور ہمارے ادب میں ایک بلند اور امتیازی مرتبہ رکھتے ہیں۔

میراجی نے''ادبی دُنیا'' پر اپنے اثر کے جو نقوش چھوڑے ہیں،وہ اگر بدیہی طور پر نہیں تو اُس کی روح میں ہمیشہ باقی رہیں گے۔''ادبی دُنیا'' شاید اس ملک میں ادب برائے ادب کا اکیلا علمبردار رہ گیا ہے۔وہ گزشتہ سولہ برس سے اپنے اِسی نظریے پر عامل ہے اور جب تک اس کی موجودہ اِدارت اور اُس کے معاونین اور ناظرین کا موجودہ حلقہ باقی ہے،وہ غالباً اپنی اِس رَوِش سے نہیں ہٹے گا۔میراجی کے چار سال''ادبی دُنیا'' میں فنّی فروغ کے چار بہترین سال تھے۔ اور اِس سے شاید کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اُنھوں نے خالص ادب کی خدمت میں اِس موقعے سے پورا فائدہ اُٹھایا جو''ادبی دُنیا'' کی شرکتِ اِدارت نے اُنھیں بہم پہنچایا تھا۔راقم الحروف کو جن چند اعلیٰ درجے کے فن کاروں کی نمود و ترقی میں شرکت و اعانت کا فخر حاصل ہے،اور ہمیشہ رہے گا؛ اُن میں میراجی ایک ممتاز اور منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔

میراجی کی بے وقت وفات میرے لیے اور اُن تمام احباب کے لیے جن سے اُن کے تعلقات تھے،ایک شدید ذاتی نقصان کی حیثیت رکھتی ہے۔

(ادبی دُنیا،دسمبر،جنوری،1949ء،1950ء)

D 1/11/2025 3:02 PM PAGE 274 (1,1)

قُدرت اللہ شہاب

میراجی

سب سے پہلے میں آپ کے رُوبرو اِس بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میرآجی کے متعلق مجھے جو تھوڑی بہت واقفیت ہے وہ محض اُس کے مطبوعہ کلام اور کتابوں کے ذریعہ سے ہے۔ اتفاق سے مجھے کبھی میرآجی سے ملنے کا شرف حاصل نہیں ہوا، اِس وجہ سے بہت ممکن ہے کہ میرآجی کے متعلق میرے تاثرات میں آپ کو وہ شدت اور جذبات نہ نظر آئیں جو اُس کے زیادہ قریبی عقیدت مندوں کا حصہ ہیں۔ اِس کوتاہی کا مجھے احساس ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے یہ تشفی بھی ہے کہ اچھا کلام شاعر کی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اور کئی صورتوں میں آئینہ حقیقت سے زیادہ صحت مند، روشن اور بے عیب ہوا کرتا ہے۔

میرآجی کی موت کے بعد اُس پر مختلف رسالوں اور اخباروں میں جو مضامین اور مقالات وقتاً فوقتاً شائع ہوئے ہیں، اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ میرآجی کی شخصیت بے حد غیر معمولی، اثر آفریں اور مسحُور کُن تھی۔ ایسی شخصیت میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور خطرات بھی۔ سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ ایسی بے پناہ اور استثنائی شخصیت دیکھنے اور ملنے والوں کو اپنی ذات کی انفرادیت میں اِس درجہ منہمک کر سکتی ہے کہ اُس کے دیگر کمالات کی طرف پوری توجہ کے ساتھ رجوع ہونے کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میراجی کے ساتھ کسی حد تک ایسا ہی ہو رہا ہے۔ میرآجی کا نام لیتے ہی بے اختیار جی چاہتا ہے کہ ان پُر اسرار گولوں کا ذکر کیا جائے جو وہ اپنے ہاتھوں میں رکھنے کا عادی تھا، یا اُس کے لباس، اُس کے بالوں، اُس کی آنکھوں، اُس کے معاشقوں اور اُس کی دیگر اضطراری حرکات کا ذکر کیا جائے، جن کی وجہ سے وہ زندگی کے ساتھ ایک ترچھے زاویے پر وابستہ تھا۔ میرآجی کی زندگی کتنی ہی دلکش اور سحر کار کیوں نہ ہو، اِس بات کو فراموش کرنا حقیقت سے بعید ہوگا کہ ادب کے لیے اصلی وراثت میرآجی کا کلام ہے، میراجی کی زندگی میں کسی حد تک یہ دونوں لازم و

D 1/11/2025 3:02 PM PAGE 275 (1,1)

ملزوم ضرور ہیں لیکن ان کے درمیان ایک محتاط توازن قائم رکھنا بہر حال ضروری ہے۔ اگر یہ توازن برقرار نہ رہے تو شاعر اور فرد دونوں کے ساتھ بے انصافی ہے۔

ابھی میرآجی اور ہمارے درمیان وقت کی اِتنی وسیع خلیج حائل نہیں ہوئی کہ ہم ان نقوش کو نظر انداز کر سکیں جو اُس کی شخصیت نے ہمارے اذہان پر ثبت کیے ہوئے ہیں۔ غالباً یہ نقوش ابھی بہت عرصہ تک دُھندلے نہ پڑیں گے۔ کیوں کہ ان میں بے پناہ شدت اور تُندی ہے۔ لیکن اِس خطرے سے خبردار رہنا بھی ضروری ہے کہ کہیں انجامِ کار میرآجی کی شاعری محض اس کی زندگی کا پس منظر بن کر نہ رہ جائے۔ یہ کوئی فرضی خطرہ نہیں ہے۔ اِس کی بنیاد ایک المناک حقیقت پر مبنی ہے۔ آج اگر آپ ایک عام پڑھے لکھے نوجوان سے میرآجی کے متعلق گفتگو کریں تو ہوسکتا ہے کہ اُسے میرآجی کی غیر معمولی علّتوں کے متعلق تو پانچ دس قصّے ازبر ہوں گے، لیکن شاید وہ اُس کی کسی نظم یا گیت کے دو شعر بھی ٹھیک طرح نہ سُنا سکے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہر چند میرآجی کی زندگی رسائل کے صفحات میں ہاتھوں ہاتھ بِک رہی ہے، یا بڑی تیزی سے سینہ بسینہ منتقل ہو رہی ہے۔ لیکن اُس کی کتابیں آسانی سے دستیاب نہیں ہوتیں۔ آپ اِسی لاہور میں نکل جائیے۔ دو تین ابتدائی کتابوں کے علاوہ آپ کو میرآجی کی کوئی تصنیف کسی کتاب گھر میں نظر نہیں آئے گی۔

اگر میرآجی کی رُوح لائبریریوں اور ذاتی کُتب خانوں میں محدود رہی اور اُس کے جسم کی ٹیڑھی لکیروں کو جنسی دواخانوں کے پوسٹروں کی طرح مشتہر کیا جاتا رہا، تو اگر میرآجی کا کوئی نصب العین تھا، تو یہ اس نصب العین کی شکست ہوگی۔

یوں تو سارے ادب کے ضمن میں ہی نصب العین کا تذکرہ بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے کے مترادف ہے۔ لیکن شاید میرآجی کے سلسلے میں نصب العین کا ذکر اور بھی بُری طرح کھٹکے۔ لیکن جس طرح مذہبیت اور خدا کے وجود سے انکار بھی بذاتِ خود ایک مذہب یا عقیدے کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اسی طرح ادب یا شاعری میں نصب العین کی نفی اپنی جگہ ایک خاص نقطۂ نظر کا درجہ حاصل کر سکتی ہے۔ اگر میرآجی کو اِس زاویے سے دیکھا جائے تو اُس کے کلام میں نصب العین

D 1/11/2025 3:02 PM PAGE 276 (1,1)

کی جستجو گناہ ہو تو ہو لیکن گناہِ بے لذّت ہرگز نہیں۔ کیونکہ میرا جی کے ابتدائی گیتوں میں اِس قدر لذّت اور جمال ہے کہ اس کے سامنے ادب کی افادیت اور مقصدیت ایک بے کار اور فرسودہ خیال نظر آتا ہے۔ اس وقت میرا جی کا دل اور دماغ جمالیاتی محوروں کے گرد گھوم رہا تھا اور اُس کے اپنے الفاظ میں دھیان کی لہریں جھکولے دیتی ہوئی اُسے بہت دُور لے جاتی تھیں۔ دائیں بائیں، آگے پیچھے، اُوپر نیچے۔۔۔۔۔۔ ہر طرف ایک دُھندلکا چھا جاتا تھا۔ آنکھیں سایوں کو دیکھتی تھیں۔ لیکن پہچان نہیں سکتی تھیں، کان گونج کو سُنتے تھے، سمجھ نہیں پاتے تھے۔ پاؤں بڑھتے تھے لیکن دھرتی پیچھے کو نہیں سرکتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اُس کی آنکھیں دیکھتی تھیں کہ امرت کی دھاریں پہنچ سے دُور نہیں ہیں۔ جب عورت گیت بناتی تھی۔ کبھی کامنی مورت بن کر، کبھی سیدھی سادی صورت کے ساتھ۔ جب اُس کے دائیں پہلو میں بہتی ہوئی ندی گنگناتی تھی، بائیں پہلو میں لیٹے ہوئے میدان پر چھایا ہوا جنگل ہوا کے جھونکوں سے اور پرندوں کی صداؤں سے گونج اُٹھتا تھا۔ ایک طرف پربت سے گرتی ہوئی دھار شور مچاتی تھی۔ ایک طرف ساگر سے اُٹھتی ہوئی اندھی موجیں ایک دوسری سے ٹکراتی تھیں اور ان سب آوازوں کے اُوپر پھیلا ہوا آسمان اپنی آغوش میں اکٹھا کر کے ہم آہنگ بناتا تھا۔

یہ میرا جی اُس میرا جی سے مختلف تھا جو چند برس ہوئے کہ بمبئی کے ایک ہسپتال میں مر گیا ہے۔ رفتہ رفتہ تجربہ ہونے لگا کہ امرت کی دھاریں فی الحقیقت اُس کی پہنچ سے بہت دُور ہیں۔ اور وہ کامنی عورت جو گیت بناتی تھی عملی طور پر اُس کی دسترس سے باہر ہے۔ آبشاروں اور سایوں کی جگہ اُس کا واسطہ ریڈیو اسٹیشنوں سے پڑنے لگا اور جنگلوں اور سمندروں کی جگہ اُس کا تعاقب خود زندگی کرنے لگی۔ اگر میرا جی کا ذہن معائنۂ باطن سے قاصر ہوتا تو غالباً وہ بھی زندگی سے بھاگ کر کسی رقص گاہ میں چلا جاتا اور التجا کرتا کہ ''اے مری ہم رقص مُجھ کو تھام لے'' لیکن میرا جی نے زندگی کے خونی بھیڑیے سے بھاگنے کے لیے جو راستہ اختیار کیا وہ اسے اس کے اپنے نہاں خانوں میں لے گیا۔ نہاں خانہ خواہ دل کا ہو یا دماغ کا، اکثر تاریک ہوا کرتا ہے

D 1/11/2025 3:02 PM PAGE 277 (1,1)

اور اس میں نوری کرنیں پیدا کرنا، شاعروں سے زیادہ اولیاء کا مشغلہ ہے۔ یوں بھی انسان کے اپنے باطن سے زیادہ غیر شفاف اور پیچیدہ کوئی چیز نہیں ہوتی۔ خاص طور پر اُس اِنسان کا باطن جو محرومی کی خلش سے داغ دار ہو۔ اور جس کے اپنے طلسمی رنگ محل چور چور ہو گئے ہوں۔ استعاروں میں قلب کی وسعت کائنات کی وسعت سے زیادہ ہو تو ہو، لیکن جب انسان دل کی دُنیا میں پناہ لینے پر مجبور ہو جائے تو یہ دُنیا بڑی محدود، بے حد اُلجھی ہوئی نظر آنے لگتی ہے۔ میرآجی میں ایک مبہم اُلجھن کا احساس تو شروع ہی سے موجود تھا اور وہ اپنے ابتدائی گیتوں میں بھی اِس اُلجھن سے مُکتی حاصل کرنے کی فکر میں رہتا تھا۔ لیکن جب وہ شعوری طور پر اپنے اندر پناہ گزین ہو گیا تو یہی اُلجھن ایک مستقل زاویۂ نظر بلکہ ایک فلسفے کی صورت اختیار کر گئی۔ اگر میرآجی کے فلسفۂ حیات کا تجزیہ کیا جائے تو اسے ایک لفظ میں بیان کرنا شاید غلط نہ ہو گا۔ وہ ایک لفظ ''اُلجھن'' ہے۔

یہ بھی میرآجی کا کمال ہے کہ اُس نے زندگی کی ''اُلجھن'' کو ایسا مقام عطا کیا کہ وہ ایک فن، ایک عظیم اور زندہ رہنے والے فن کا درجہ پا گئی۔ روحانی اُلجھن انسان کو درجۂ ولایت تک لے جا سکتی ہے اور دماغی اُلجھن پاگل خانے تک۔ لیکن میرآجی میں اِن دونوں اُلجھنوں کے ساتھ GENIUS اور جنون کا ایسا حسین امتزاج تھا کہ اس سے نہایت خوب صورت اور پُر اثر شاعری جنم لیتی رہی۔

''اس نظم میں'' کے زیرِ عُنوان میرآجی کے مضامین اُس کی اُلجھنوں کے ارتقاء میں ایک واضح منزل کا نشان ہیں۔ جس طرح اپنے شروع کے گیتوں والا میرآجی اُس میرآجی سے مختلف ہے جو آگے چل کر جنگلوں اور سمندروں اور ندیوں کو چھوڑ کر اپنے دل کی دُنیا میں جا بسا۔ اِسی طرح دوسروں کی نظموں میں سوالیہ نشان تلاش کرنے والا میرآجی بھی اُس میرآجی سے مختلف ہے جس کی شاعری اپنے عروج پر پہنچ کر خود سرتاپا ایک سوال بن گئی۔ ان مضامین میں وہ ایک نباض کی طرح دوسروں کی اُلجھنیں ٹٹول ٹٹول کر برآمد کرتا ہے، اُن کے جواب ڈھونڈتا ہے اور اُن کی اِصلاح کے لیے مفید مشورے دیتا ہے لیکن بعد میں یہی میرآجی اِس قدر مُبہم اور پیچیدہ بن

D 1/11/2025 3:02 PM PAGE 278 (1,1)

جاتا ہے کہ کوئی نباض آسانی سے اس کی شہ رگ بھی نہیں ٹٹول سکتا۔ ابہام پسندی اُس میں فطرتی طور پر ودیعت ہوئی تھی۔ فرانسیسی شاعروں کے مطالعہ نے اُسے ایک شعوری راستہ دِکھایا اور اُس کے داخلی کردار نے آخر ابہام پسندی کو ایک عقیدہ بنا ڈالا۔ یوں بھی حساس فنکاروں پر ایسے مواقع آتے رہتے ہیں، جب اُن کی زبان اور قلم اُن کے جذبات کی شدت اور رفتار کا ساتھ نہیں دیتے اور وہ اندر ہی اندر اپنے آپ سے باتیں کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں جو آرٹ تخلیق ہوتا ہے اُسے ایک طرز کی Intellectual Stenography کہنا چاہیے۔ میرآجی ان منزلوں سے اکثر گزرا ہے اور اُس کے آخری دور کی بہت سی نظمیں ان منازل کا سنگِ میل ہیں۔

اقبالؔ نے ایک جگہ کافر اور مومن کی پہچان یوں قائم کی ہے:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گُم ہے!
مومن کی یہ پہچان کہ گُم اُس میں ہیں آفاق

اگر خلش دروں اور ابہام کو عقیدے کا مقام دینے میں کوئی اعتراض نہ ہو تو میرآجی اس مسلک کا بے حد سچا اور پہنچا ہوا مومن ہے۔ وہ کسی جگہ بھی اُلجھنوں میں گُم نہیں ہوتا بلکہ ہر جگہ خود اُلجھنیں اُس میں گُم ہیں۔۔۔۔۔۔۔اور یہی اُس کی سب سے بڑی عظمت کا نشان ہے۔

(نقوش، نومبر، دسمبر 1952ء)

D 1/11/2025 3:02 PM PAGE 279 (1,1)

اختر الایمان

میرؔ آجی کے آخری لمحے (ایک خط)

بنام قیوم نظر!

ہندوستان اور اس کے ادیب جس دور سے گزر رہے ہیں اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کو اِس بات پر حیرت ہوئی کہ ہندوستانی ایجنسی نے اُن کی موت کی خبر کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ میرؔ آجی جب سے جنوبی ہند میں آئے تھے، اس تمام عرصہ میں بہت کم مُدت ایسی ہے جس میں وہ مجھ سے دُور رہے۔ جن دِنوں میں پُونا میں تھا وہ تقریباً نو دس مہینے میرے پاس رہے۔ اس کے بعد اُن کی میخواری یہاں تک پہنچی کہ مجھے مجبوراً اُنھیں بمبئی بھیجنا پڑا۔ کچھ مُدت بعد میں بھی بمبئی چلا گیا۔ اُن دِنوں وہ ''دادر'' میں اپنے ایک دو دوستوں (ملک اور موہن سہگل) کے ساتھ رہتے تھے۔ پھر ایک عورت ''مُنّی رباڈی'' بیچ میں آ گئی اور وہ ''دادر'' سے اُٹھ کر فورٹ کے علاقے میں آ گئے۔ (اسپلنڈ ڈمینشن) اُنھیں ملک کی معرفت ایک فلم لکھنے کے لیے مل گئی۔ اس سے جو کچھ ملا اُنھوں نے بوتلوں کی صورت میں اُڑا دیا، اور ایک زمانہ آیا کہ جب وہ مسلسل کھانا نہ کھانے اور غذا کی بے ترتیبی کی وجہ سے اسہال کے مریض ہو گئے۔ مرض کی ابتدا کے ساتھ ہی فلم سے لیا ہوا روپیہ ختم ہو گیا۔ میں نے ''خیال'' نکالا اور انتہائی نظریاتی مخالفتوں کے باوجود بھی میں نے اُنھیں ایڈیٹر بنا دیا اور سو روپیہ ماہوار دیتا رہا۔ وہ کچھ اپنے علاج پر صرف کرتے باقی شراب پر۔ آخر سات پرچے نکالنے کے بعد بے دم ہو گئے۔ جب اُن کی حالت غیر دیکھی تو مجھ سے رہا نہ گیا اور اُنھیں فورٹ سے اپنے پاس بلوا لیا۔ جب وہ میرے پاس تھے تو اسہال کے ساتھ ساتھ نمونیہ کا شکار بھی ہو گئے۔ اُن کے جسم میں خون بننا بالکل بند ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ علاج اپنی مرضی سے کرنا چاہتے تھے، اِس لیے ڈھائی تین مہینے تک ہومیوپیتھی چلتی رہی۔ میں نے جب کبھی اُنھیں علاج بدلنے کو کہا وہ ناراض ہو گئے، صحت گرتی چلی گئی۔ آخر اُن کی مخالفتوں کو نظر انداز کرتے

D 1/11/2025 3:02 PM PAGE 280 (1,1)

ہوئے دو تین ڈاکٹروں کے مشورہ سے پرانا علاج زبردستی بند کروا دیا۔ جب نیا علاج کرانا چاہا تو اُنھوں نے مُدت دریافت کی۔ معلوم ہوا کہ آرام ہوتے ہوتے تین چار ماہ لگ جائیں گے۔ میں نے اُنھیں اِس بات پر آمادہ کرلیا تھا کہ ذرا افاقہ ہو تو وہ لاہور چلے جائیں۔ پہلے میری اِس تجویز پر وہ ناراض ہو گئے مگر جب میں نے اُنھیں سمجھایا بجھایا تو مان گئے اور اب اُنھیں بجائے علاج کے یہ بات سوجھ گئی کہ کسی طرح اُنھیں چلنے پھرنے کے قابل کر دیا جائے۔ علاج وہ لاہور چل کر کریں گے۔ میں نے ڈاکٹروں سے مشورہ کر کے اُنھیں جگر کے ٹیکے دلوانے شروع کر دیے۔ پرمٹ کے لیے کوششیں کیں اور اُن کی تصویریں تک کھنچوا کر رکھیں مگر جب اُنھیں افاقہ ہوا اور اُنھیں کہا گیا کہ پرمٹ آفس جائیں تو اُنھوں نے اِس کام کو ہمیشہ کسی آئندہ وقت پر ملتوی کر دیا۔ جگر کے ٹیکے ظاہر ہے علاج نہیں ایک سہارا تھے، اس کے علاوہ اُن کے ذہن میں یہ بات جانے کہاں سے بیٹھ گئی تھی کہ جتنا زیادہ کھائیں گے اُتنی ہی زیادہ طاقت پیدا ہوگی اور ٹیکوں کا اثر زیادہ عُجلت کے ساتھ ہوگا۔ دوسری طرف ڈاکٹروں کا مشورہ تھا کہ دہی اور لسّی کے سوا کچھ بھی نہ دیا جائے۔ اور اِس طرح اُن میں اور مجھے میں ایک مسلسل رسّہ کشی ہوتی رہی۔ میں پرہیز پر زور دیتا تھا، وہ رات کو باورچی خانہ میں جا کر وہ سب کچھ کھا لیتے، جس کے لیے اُنھیں منع کیا جاتا، میں ملازم کو ہدایت کرتا، بیوی سے کہتا کہ نگاہ رکھنا، وہ ملازم کو بہلا پھسلا کر اور کبھی ناراض ہو کر گھر میں پکی ہوئی چیزیں حاصل کرتے اور بازار سے سیب کا مربہ منگوا کر کھاتے۔۔۔۔ اور اُن کا مرض اب آخری منزلوں میں آ گیا تھا۔ میں نے فوراً ہی اُنھیں باندرہ کے ایک ہسپتال میں منتقل کر دیا، لیکن وہاں اُنہوں نے ہوٹل والوں اور دوسرے ملازموں کو ملا لیا، برابر کے مریضوں سے اُن کا کھانا مانگ کر کھاتے رہے۔ جب مجھے اور انچارج ڈاکٹر فاروقی کو یہ معلوم ہوا تو ہم بہت ناراض ہوئے، اور اُنھیں کنگ ایڈورڈ میموریل ہسپتال میں بھجوا دیا، وہاں چند روز رہ کر اُن کی ذہنی حالت پھر خراب ہو گئی، ڈاکٹر گروور نے ایک نفسیات کے ماہر کو بلوا کر اُن کا ذہنی تجزیہ شروع کیا۔ اُنھوں نے بہت سی باتیں بتانے سے انکار کر دیا۔ جب میں نے اصرار کیا تو خفا ہوئے اور کہنے لگے:

D 1/11/2025 3:02 PM PAGE 281 (1,1)

''اختر! دیکھو، یہ لوگ مجھ میں سے میرے COMPLEXES نکالنا چاہتے ہیں مگر میں ایسا نہیں چاہتا، میں ایسا نہیں ہونے دُوں گا۔ یہ نکل گئے تو میں کیسے لکھوں گا۔ یہ Complexes ہی تو میری تحریریں ہیں۔''

میں نے ہر چند سمجھایا مگر بے سود۔ ڈاکٹر گروور کا خیال PXYCHOTHEREPIC SHOCk دینے کا تھا۔ مگر اِس کی تو نوبت ہی نہ آئی۔ اُن کے جسم میں باہر کا خون ڈالنے کا سوال پیدا ہوا تو مہندر ناتھ نے اپنا خون دیا مگر اس کا کیا علاج کہ ہر کوشش اُلٹ ہو رہی تھی اور مہندر کا خون ضائع گیا۔ میرآجی اس سے فائدہ نہ اُٹھا سکے۔ میں اُنھیں دیکھنے روز ہسپتال جاتا، اکثر میری بیوی، مدھوسودن اور مہندر ناتھ بھی جایا کرتے تھے۔ وہ ہر ایک سے شکایت کرتے کہ اُنھیں فلاں چیز دی جا رہی ہے اور فلاں نہیں۔ مختصر یہ کہ ہم نے اُنھیں بچانے کی کوئی کوشش اُٹھا نہ رکھی لیکن افسوس کہ اُنھوں نے ہمارا ساتھ نہ دیا۔

۳؍نومبر کی رات کو میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا کہ ہسپتال والوں کا تار ملا۔ میں کھانا چھوڑ کر نجم نقوی اور اپنے ہم زلف کو ساتھ لے کر ہسپتال پہنچا۔ اُن کی لاش کو دیکھا۔ اُن کی صورت پر وہی عظمت، وہی محبت، وہی معصومیت، وہی اطمینان وسکون تھا اور نگاہوں کو کسی طرح بھی یقین نہ آتا تھا کہ میرآجی ہم سے رُخصت ہو گئے۔ میرآجی ہم سے کبھی الگ نہیں ہو سکتے، وہ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گے، بہرحال واپس آ کر تم لوگوں کو خط لکھے، راستہ میں رُک کر مختلف اخبارات کے دفاتر کو ٹیلی فون کیے۔ اگلے دن خود جا کر کہا مگر اُن لوگوں پر عصبیت چھائی ہوئی تھی۔ اور نظریاتی اختلافات کے دبیز غبار میں انسانی قدروں کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا۔

تمھیں معلوم ہے میرآجی کے جنازے میں بمبئی جیسے عظیم شہر میں کتنے لوگ شامل ہوئے تھے؟ صرف چار۔ میرے ہم زلف، مدھوسودن، پریم اور میں۔ جس جگہ اُنھیں دفنایا گیا اُس کا نام ''میرن لائن قبرستان'' ہے۔

اُن کی کتابیں، مسوّدے، مکمل اور نامکمل تحریریں، یہی کچھ اُن کا اثاثہ تھا اور میرے پاس

D 1/11/2025 3:02 PM PAGE 282 (1,1)

محفوظ ہے۔ میں نے فورٹ سے منگوالیا تھا۔ اُن کی تمام کتابیں ''حلقہ اربابِ ذوق'' کی ملکیت ہیں۔ اُنھوں نے خود اپنے قلم سے ہر کتاب پر لکھا ہوا ہے ''حلقہ اربابِ ذوق کے لیے۔'' موقع ملنے پر وہ سب کچھ بھجوادوں گا۔

قیوم! تم نے مرنے سے پہلے اُنھیں نہیں دیکھا، جتنی بُری حالت اُن کی تھی، اُسے دیکھنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ یقین مانو ہم برداشت نہ کر سکتے تھے اور دُعائیں کیا کرتے تھے کہ:

''اِلٰہی! اگر میرا جی کو صحت نہیں ہو سکتی تو انھیں موت دے دے۔ کم از کم
اِس تکلیف سے تو نجات ہو جائے گی۔''

اُن کے ہاتھ پاؤں چہرہ اور پیٹ پر ورم آ گیا تھا۔ اپنے آخری دِنوں میں وہ ہر وقت DEFEAT OF BAUDLAIRE پڑھا کرتے تھے۔ اِس کتاب کو وہ اپنے ساتھ ہسپتال لے گئے تھے، اِس کتاب نے اُن کا ساتھ آخری سانس تک دیا۔

میں اُن پر ایک مکمل اور تفصیلی کتاب لکھنا چاہتا ہوں۔

''خیال'' میرا جی کے ساتھ ہی مرحوم ہو گیا۔

(نقوش نومبر، دسمبر 1952ء)

D 1/11/2025 3:02 PM PAGE 283 (1,1)

کتابیات/رسائل

1۔ احمد بشیر، جو ملے تھے راستے میں، لاہور، گورا پبلشرز، بار دوم، 1997ء

2۔ اخلاق احمد دہلوی، پھر وہی بیاں اپنا، لاہور، مکتبۂ عالیہ، 1979ء

3۔ ارشد نعیم (مرتب) گنجینۂ گوہر (شاہد احمد دہلوی، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، 2018ء

4۔ انتظار حسین، علامتوں کا زوال، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2009ء

5۔ تابش دہلوی، دید باز دید، کراچی، حیات اکیڈمی، 1990ء

6۔ جمیل جالبی ڈاکٹر (مرتب)، کلیاتِ میراجی، لندن، اُردو مرکز، 1988ء

7۔ جمیل جالبی ڈاکٹر (مرتب)، میراجی ایک مطالعہ، لاہور سنگِ میل پبلی کیشنز، 1990ء

8۔ رشید امجد ڈاکٹر، میراجی شخصیت اور فن، لاہور، مغربی پاکستان اکیڈمی، 1995ء

9۔ سحاب قزلباش، میرا کوئی ماضی نہیں، کراچی، فضلی سنز، 1995ء

10۔ سعادت حسن منٹو، گنجے فرشتے، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2009ء

11۔ عبادت بریلوی ڈاکٹر، آوارگانِ عشق، لاہور ادارہ ادب و تنقید، 1980ء

12۔ عقیل عباس جعفری (مرتب) چراغ روشن ہیں، کراچی، اٹلانٹس پبلی کیشنز، 2016ء

13۔ کمار پاشی (مرتب)، میراجی، شخصیت اور فن، نئی دہلی، موڑرن پبلشنگ ہاؤس، 1981ء

14۔ ممتاز مفتی، پیاز کے چھلکے، لاہور، الفیصل، 2006ء

15۔ وزیر آغا ڈاکٹر، نظمِ جدید کی کروٹیں، لاہور سنگت پبلشرز، 2018ء

D 1/11/2025 3:02 PM PAGE 284 (1,1)

رسائل

1۔ ادبی دُنیا، لاہور، دسمبر، جنوری 1949ء، 1950ء

2 ادبی دُنیا، لاہور، فروری 1950ء

3۔ ہفت روزہ ''اقدام''، لاہور، 9 نومبر 1952ء

4۔ نقوش، لاہور، شمارہ نمبر 14،، سالنامہ

5۔ نقوش، لاہور، شمارہ نمبر 15 ,16 سالنامہ 1950ء

6۔ نقوش، لاہور، شمارہ نمبر 27 , 28 نومبر، دسمبر 1952ء

7۔ نقوش، لاہور، شخصیات نمبر، جلد اوّل